مجھے رنگ دے

نبیلہ ابر راجہ

مجھے رنگ دے

زندگی سے ڈرتے ہو
زندگی تو تم بھی ہو
زندگی تو ہم بھی ہیں
آدمی سے ڈرتے ہو
آدم تو تم بھی ہو
آدمی تو ہم بھی ہیں
آدمی زباں بھی ہے
آدمی بیاں بھی ہے
اس سے تم نہیں ڈرتے
حرف اور معنی کے رشتہ ہائے آہن سے
آدمی ہے وابستہ
آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ
اس سے تم نہیں ڈرتے
جو ابھی نہیں آئی اس گھڑی سے ڈرتے ہو
اس گھڑی کی آمد کی آگہی سے ڈرتے ہو

''میڈم! ڈاکٹر صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔'' وہ ہڑبڑا کر ڈاکٹر آفتاب کی سیکریٹری

کی طرف متوجہ ہوئی جو اس کے حد درجہ استغراق پر مسکراتی نگاہوں سے اسے اندر جانے کا اشارہ کر رہی تھی۔

حیدر بھائی اب سے پندرہ منٹ پیشتر اسے ہاسپٹل کے گیٹ پر ڈراپ کر گئے تھے۔ سڑک کے عین کنارے بڑا سا بورڈ نصب تھا جس پہ موٹے الفاظ میں ڈاکٹر آفتاب فاؤنڈیشن تحریر تھا۔ دور سے ہی دیکھنے والوں کو متوجہ کرتا تھا۔

گیٹ پر باوردی چوکیدار مستعد بیٹھا تھا۔ حوریہ پہلی بار پھوپھو کو دیکھنے ہاسپٹل آئی تھی۔ جو دو دن پہلے ایڈمٹ ہوئی تھیں۔

ہاسپٹل میں داخل ہوتے ہی سیدھے ہاتھ پر خوب صورت اور دلکش سی لڑکی بیٹھی تھی، پہلا ٹکراؤ اسی سے ہوا۔

''زہرا بیگم کون سے روم میں ہیں؟ دو دن پہلے ایڈمٹ ہیں، ہارٹ پیشنٹ ہیں۔''
لڑکی کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں اس نے تفصیل بتائی تو اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
''آپ تشریف رکھئے، پہلے ڈاکٹر صاحب سے مل لیں۔ وہ بزی ہیں آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔''

استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی جتنی خوبصورت تھی۔ اس سے زیادہ خوبصورت صورت اس کا اخلاق تھا۔ بیٹھتے ہی حوریہ نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ ہاسپٹل کے چاروں دیواروں پر خوبصورت فریم آویزاں تھے۔ یہ کوئی ایسی حیرت انگیز یا قابل ذکر بات نہیں تھی۔ پرائیویٹ ہاسپٹل میں اس طرح کی سجاوٹ دیکھنے میں آ ہی جاتی ہے لیکن خاص بات یہ تھی۔

سب فریم شاعری اور بڑے لوگوں کے اقوال سے سجے ہوئے تھے۔ خطاطی کا خوبصورت نمونہ تھے۔ حوریہ کو بیس منٹ گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا وہ خوبصورت دلکش الفاظ میں کھوئی رہی۔ ابھی بھی جب ڈاکٹر آفتاب کی سیکریٹری نے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا، وہ عین سامنے لگے فریم میں لکھی شاعری پڑھ رہی تھی اور سر دھن رہی تھی۔ اسے بھی نعمان احمد کی طرح شاعری سے دلچسپی تھی۔

حوریہ لکڑی کا منقش دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔
اندر کا ماحول باہر کے مقابلے میں زیادہ بارعب اور متاثر کن تھا۔ ڈاکٹر آفتاب کے کمرے میں چاروں طرف لکڑی کی الماریوں میں کتابیں سجی تھیں۔ ڈاکٹر آفتاب کی پشت والی

دیوار پر ان کی تصویریں، سرٹیفکیٹ اور کچھ تعریفی اسناد آویزاں تھیں۔ اس کے ساتھ ہی شیشے کے ٹیبل پر ٹرافیاں اور شیلڈز سجی تھیں۔ جو یقیناً ڈاکٹر آفتاب کی بہترین کارکردگی پہ دی گئی تھیں۔
''السلام علیکم!''
''وعلیکم السلام، بسم اللہ، تشریف رکھیے۔'' اس کے سلام کے جواب میں ڈاکٹر صاحب کی نرم آواز ابھری تو اس نے دیوار کے ساتھ پڑے صوفے پہ نشست سنبھال لی۔
''آپ زہرا صاحبہ کو دیکھنے آئی ہیں؟''
''جی ہاں!'' اس نے سر کی ہلکی سی جنبش سے جواب دیا۔
''اب وہ کافی بہتر ہیں، جب انہیں یہاں لایا گیا تو تب ان کی حالت بہت خراب تھی۔ اب جا کر اپنے مریض کو دیکھیں۔ فرق خود پتہ چل جائے گا آپ تشریف لے جا سکتی ہیں۔''
ڈاکٹر صاحب اپنے سامنے رکھی فائلیں دیکھنے لگے حوریہ دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ سیکریٹری نے وارڈ تک اس کی رہنمائی کر دی۔
حوریہ، پھوپھو سے ملی۔ واقعی پہلے کے مقابلے میں ان کی حالت کافی بہتر لگ رہی تھی۔ وہ پھوپھو کے پاس ہی ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ کافی کشادہ کمرہ تھا۔ ٹی وی، فون، اٹیچ باتھ روم کی سہولت بھی تھی۔ ساتھ ہی ایک فالتو بیڈ بھی تھا کہ اگر کوئی رات مریض کے پاس رکنا چاہے تو اسے پریشانی نہ ہو۔
''پھوپھو! یہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہے ناں۔'' اس نے ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔
''ارے نہیں پریشانی کیسی۔ مجھے تو لگ رہا ہے۔ میں اپنے گھر میں ہوں بلکہ سچ پوچھو تو ایسا آرام مجھے گھر میں بھی نہیں ملا جو دو دن سے یہاں مل رہا ہے۔ نرسیں اتنا خیال کرتی ہیں۔ خود ڈاکٹر صاحب تو فرشتہ ہیں۔ چار چار بار آ کر دیکھیں گے مجھے اور کھانا بھی بہت اچھا ہے ہر چیز ہاسپٹل میں ہی مل جاتی ہے۔ باہر جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے تب ہی تو کل میں نے عافیہ بہو کو گھر بھجوا دیا تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی نرسوں سے کہا ہے کہ رات کو بھی میرا خیال رکھیں۔ رات کو مجھے دوائی کھلا کر جاتی ہیں اور کہتی ہیں رات کو پھر بھی ہماری ضرورت پڑے تو یہ گھنٹی بجا دیں۔''
پھوپھو نے بیڈ کے ساتھ لگے بٹن کی طرف اشارہ کیا۔
''چلیں شکر ہے پھوپھو! ہاسپٹل اور ڈاکٹر اچھا مل گیا ہے ورنہ آپ کو تو ہاسپٹل سے

ہمیشہ دور بھاگتی آئی ہیں۔"

"ہاں، ٹھیک کہتی ہو حوری! تم بھی۔ میں نے کسی تکلیف اور بیماری میں دوائی نہیں کھائی مگر اب دیکھ لو ہاسپٹل میں پہنچ گئی ہوں اور دوائی بھی کھا رہی ہوں تکلیف ہی ایسی ہے تو......"

یکا یک وہ افسردہ نظر آنے لگیں۔

"پھوپھو! آپ ٹھیک ہو جائیں گی اور پھر بیماری میں دوائی کھانا پڑتی ہے دو دن آپ کو اس ہاسپٹل میں آئے ہو گئے ہیں اور ان دونوں میں ہی آپ کی طبیعت کافی بہتر لگ رہی ہے۔"

اس نے پھوپھو کے ہاتھوں کو چوم لیا تو وہ اس کی اتنی محبت و توجہ پہ پہلے کی طرح خوش ہو گئیں۔

کچھ دیر بعد پھوپھو کے سسرالی عزیز بھی آ گئے۔ وہ ازسرنو ان کو ہاسٹل اور ڈاکٹر کی قابلیت کے بارے میں بتانے لگیں۔ حیدر بھائی شام کے بعد عافیہ بھابھی کے ساتھ آئے۔

حوریہ پھوپھو کے پاس رکنا چاہ رہی تھی اور عافیہ کی مرضی بھی یہی تھی مگر زہرا بیگم نے واپسی پہ اسے حیدر اور عافیہ کے ساتھ گھر بھجوا دیا۔

❁

اندر آنے والی آوازوں اور چہل پہل سے اندازہ ہو رہا تھا کہ گھر میں کوئی مہمان آیا ہے اور اس کا یہ اندازہ ٹھیک نکلا۔ عافیہ بھابی کی چھوٹی بہن نتاشا بنی سنوری ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی اور سب بچے بھی اس کے گرد جمع تھے۔

حنان آفس سے آیا تو وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ حوریہ کچھ دیر وہاں بیٹھی پھر عافیہ نے اسے کچن میں بلوا لیا۔ نتاشا کی آمد پہ خاص اہتمام تھا۔ عافیہ نے چکن بریانی پکانے کا کام اس کے سپرد کیا۔ ساتھ فروٹ ٹرائفل اور سلاد بھی۔ چکن بریانی کو دم پہ رکھ کر حوریہ نے سلاد کے لیے سبزیاں کاٹنی شروع کیں۔ عافیہ اس دوران کچن سے جا چکی تھی۔

خوش گپیوں کے درمیان کھانا کھایا گیا۔ نتاشا مسلسل حنان پہ فقرے چست کر رہی تھی۔

وہ بہت حاضر جواب اور شوخ تھی۔ کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔

موسم اچھا خاصا بدلا ہوا تھا، اپریل کے خوشگوار دن اختتام پذیر تھے۔ حوریہ برتن دھو رہی تھی۔ حیدر بھائی کھانے کے بعد کمرے میں سونے چلے گئے تھے۔ عافیہ نے گڑیا اور رانیہ کو سونے بھیج دیا تھا۔

اب ٹی وی لاؤنج میں عافیہ، نتاشا اور حنان بھی تھے۔

حنان نے ہی حوریہ کی عدم موجودگی محسوس کی اور پھر اسے آواز بھی دے ڈالی۔ جس پہ عافیہ کے چہرے کے تاثرات عجیب سے ہو گئے۔

"جی حنان بھائی!" وہ ہاتھ خشک کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

"بھئی۔ کہاں گم ہو۔ آ کے بیٹھو یہاں۔" حنان کا انداز ہمیشہ کی طرح اپنائیت بھرا تھا جس پہ نتاشا اور عافیہ نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

اس کے آنے پر یک دم خاموشی چھا گئی جس کو حوریہ نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔ دوسروں کے رویے کے بارے میں وہ شروع سے ہی بڑی حساس تھی معمولی سی تبدیلی بھی محسوس کر لیتی تھی۔ چنانچہ کچھ دیر بعد ہی سونے کا کہہ کر وہ یہاں سے اٹھ آئی۔

بعد میں عافیہ بھی اٹھ گئی اور نتاشا، حنان کے پاس بیٹھی کافی دیر باتیں کرتی رہی۔

❁

زہرا بیگم کو ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوئے آٹھواں روز تھا۔ زہرا بیگم ڈاکٹر آفتاب کی تعریف کرتے نہیں تھکتی تھیں۔

ٹھیک دسویں دن ڈاکٹر آفتاب نے زہرا بیگم کو گھر لے جانے کی اجازت دے دی۔ جانے سے پہلے انہوں نے زہرا بیگم کے ساتھ موجود افراد کو اپنے آفس میں بلوایا۔ حوریہ، حنان، حیدر، عافیہ سب ڈاکٹر آفتاب کے پاس بیٹھے تھے جو انہیں زہرا بیگم کے حالیہ ٹیسٹ کے بارے میں بتا رہے تھے۔

"جب ماں جی کو یہاں لایا گیا تو ان کے دل کا ایک والو بند تھا۔ بلڈ پریشر بہت ہائی تھا اور گردوں میں پتھری بھی تھی اور اب آج کے ٹیسٹ دیکھیں۔ سب کچھ کلیئر ہے۔ بی پی نارمل ہے، گردوں میں پتھری بھی نہیں ہے اور دل کا والو بغیر آپریشن ہم نے کھول دیا ہے۔ اللہ کا بڑا کرم ہوا ہے ماں جی اب خطرے سے باہر ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب! یہ سب آپ کے ہاتھ کی شفا ہے اور ہم بڑے خوش قسمت ہیں جو بروقت امی جان کو لے آئے آپ کے پاس۔"

حیدر بھائی بہت ہی شکر گزار نظروں سے ڈاکٹر آفتاب کو دیکھ رہے تھے۔

"یہ سب اوپر والے کا کمال ہے ورنہ میں کیا اور میری اوقات کیا۔ آج تک اس ہاسپٹل میں آنے والا کوئی بھی مریض بغیر صحت یاب ہوئے واپس نہیں گیا۔ یہ سب اللہ کی مہربانی

کے طفیل ہے۔"

ڈاکٹر آفتاب دھیرے دھیرے بول رہے تھے اور لگ ہی نہیں رہا تھا یہ شخص جو اتنا عاجزی اور خاکساری کا نمونہ ہے اتنا بڑا ڈاکٹر ہے۔ وہ سب متاثر تھے۔ واپسی پہ بھی گاڑی میں ڈاکٹر آفتاب کی ہی باتیں ہوتی رہیں ان کی قابلیت کے گن گائے جاتے رہے، وہ واقعی تھے ہی ایسے۔ غرور تو چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔

زہرا بیگم بتا رہی تھیں کہ مستحق اور نادار مریضوں کے علاج کا خرچ ڈاکٹر آفتاب فاؤنڈیشن ستر فیصد خود برداشت کرتی ہے۔

"فرشتہ ہے فرشتہ ڈاکٹر آفتاب انسان کے روپ میں۔ نرسیں تو اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتیں اور عام مریضوں کا بھی یہی حال ہے۔ اتوار تو کیا عید تک کے دن بھی چھٹی نہیں کرتا۔ صبح نو بجے آتا ہے اور رات بارہ کے بعد جاتا ہے اور اگر کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو رات خود آ جاتا ہے۔ مجھے تو کبھی کبھی اس نیک انسان پہ ترس آتا ہے۔"

زہرا بیگم بات کرتے کرتے خاموش ہو گئیں تو حیدر اضطرابی انداز میں بول پڑا۔

"کیوں؟" وہ خود ڈاکٹر آفتاب سے مل کر بہت متاثر ہوا تھا۔

"اسے اپنی گھریلو زندگی میں سکون میسر نہیں ہے مجھے تو بالکل اپنی ماں کی طرح عزت دی ہے اس نے، اس لیے اپنی زندگی کے بارے میں بھی بتایا۔ بس ایسے ہی نیک لوگوں کو اللہ امتحان کے لیے چنتا ہے۔"

گھر واپس آتے ہی عزیز و اقارب زہرا بیگم کی عیادت کے لیے آنا شروع ہو گئے۔

حوریہ کا دن بہت مصروف گزرتا تھا۔ پھوپھو کو وقت پہ دوائی کھلانا اس کی ذمہ داری تھی۔ ان کے لیے پرہیزی کھانا بھی وہ خود بناتی۔ عافیہ کے سر سے یہ بوجھ کم ہوا تو اس نے بھی سکون کی سانس لی۔

حوریہ نے اپنا بستر پھوپھو کے کمرے میں ہی سیٹ کر لیا تھا کہ رات کو کسی بھی وقت انہیں اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

پھوپھو کی بیماری اسے اندر ہی اندر پریشانی کر رہی تھی۔ ڈاکٹر آفتاب نے ایک ماہ کے بعد دوبارہ چیک اپ کے لیے بلوایا تھا۔ پھوپھو کے ساتھ حوریہ، عافیہ بھابی بھی تھیں۔

حیدر بھائی انہیں ڈراپ کر کے چلے گئے۔

ڈاکٹر آفتاب نے بڑی شائستگی سے ان دونوں کا حال احوال پوچھا۔

"آپ نے ان کا بہت خیال رکھنا ہے۔" ان کا مخاطب عافیہ اور حوریہ تھیں۔

"یہ ہی تو میرا خیال رکھتی ہے، اللہ اس کا نصیب اچھا کرے۔ مجھے اس کی بہت فکر ہے۔ یہ میرے جیتے جی اچھے گھر کی ہو جائے تو سکون سے مر سکوں گی۔" وہ بہت پیار سے حوریہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"یہ آپ کی کیا لگتی ہیں؟" زہرا بیگم کے انداز نے ڈاکٹر آفتاب کو حوریہ میں دلچسپی لینے پہ مجبور کر دیا۔

"میرے بھائی کی اکلوتی نشانی ہے۔ ماں پیدا ہوتے ساتھ ہی مر گئی تھی۔ باپ زمینوں کے جھگڑے میں مارا گیا۔ اس بدنصیب کا میرے سوا کوئی نہیں ہے۔ بیٹا! دعا کرو کہ اس کا نصیب اچھا ہو۔" زہرا بیگم کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

"ماں جی! آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ اللہ ان کی قسمت اچھی کرے گا۔ آپ جیسی نیک خاتون کے سائے میں انہوں نے پرورش پائی ہے تو یہ کیسی ہوں گی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں چنداں دشواری نہیں ہے۔"

ڈاکٹر آفتاب کا انداز اتنا پُراثر تھا کہ حوریہ یک ٹک دیکھتی رہ گئی۔

"میرے پاس ہر طرح کے لوگ علاج کے لیے آتے ہیں۔ ایک بار ایک پریشان حال خاتون نے مجھ سے اپنی بیٹی کے سلسلے میں پریشانی کا اظہار کیا۔ انہوں نے نہ جانے کیوں مجھ سے اتنی امیدیں وابستہ کر لیں کہ کہنے لگیں ڈاکٹر صاحب اللہ کے بعد آپ ہی ہمارا سہارا ہیں۔ خیر اس بچی کا رشتہ بہت اچھے گھرانے میں ہوا اس کے لیے وسیلہ اللہ نے مجھ گناہ گار کو بنایا۔ آج وہ خاتون مجھے دعائیں دیتی ہیں۔ میں نے ایک این جی او بنائی ہے۔ ایک شیلٹر ہاؤس بھی ہے بے سہارا عورتوں اور یتیم بچوں کے لیے۔ ایک ویلفیئر ٹرسٹ بھی ہے۔ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی کو انسانیت کی فلاح کے لیے وقف کر دیا ہے اور اللہ نے میری زندگی میں آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ مجھے دوسروں کے کام آ کر خوشی ملتی ہے۔"

"بیٹا! اللہ تمہیں خوش رکھے، لمبی زندگی دے۔ میرے دل سے تو دعا ہی نکلتی ہے۔" زہرا بیگم کا لہجہ بے ریا اور پرخلوص تھا۔

"بس مجھے دعائیں ہی چاہئیں میری زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے بس صرف....." ڈاکٹر آفتاب ایک دم سے سنجیدہ ہو گئے مگر پھر فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور زہرا بیگم کو

کچھ مزید ٹیسٹ کروانے بھیج دیا۔

زہرا بیگم اور حوریہ کی غیر موجودگی میں عافیہ، ڈاکٹر آفتاب سے باتیں کرتی رہی۔ ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں کرید کرید کر پوچھا۔ انہوں نے خوش دلی سے ہر سوال کا جواب دیا۔ جب زہرا بیگم ٹیسٹ کروا کر فارغ ہوئیں، عافیہ ڈاکٹر آفتاب سے ان کا پرسنل نمبر لے کر اپنے موبائل فون میں محفوظ کر چکی تھی۔

زہرا بیگم اپنے زیورات نکال کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کھلے دروازے سے عافیہ نے اندر جھانکا تو وہ بھی ادھر ہی آگئی۔

''آنٹی! کیا کر رہی ہیں یہ سونے کی زیور کیوں نکالے ہوئے ہیں؟'' اس کی نگاہیں جڑاؤ سیٹ پر جمی تھیں۔

''بس بیٹا! نکال کر دیکھ رہی تھی۔

سوچ رہی ہوں، پالش کروا لوں۔'' انہوں نے مصروف سے انداز میں کہا تو عافیہ کو تجسس سا ہوا۔

''پالش کیوں کروانا ہے آنٹی؟''

''حنان کی دلہن کے لیے نکال کر رکھے ہیں منگنی پہ ایک سیٹ چڑھاؤں گی، یہ والا کیسا ہے؟''

انہوں نے معصومانہ اشتیاق سے جڑاؤ سیٹ کی طرف اشارہ کیا مگر عافیہ اس وقت اپنے آپ میں نہیں تھی۔ منگنی، دلہن، سیٹ اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔

''حنان کے لیے لڑکی ڈھونڈ لی ہے آپ نے؟'' اس نے اپنی اندرونی حالت پہ قابو پا کر بظاہر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''لڑکی کہاں ڈھونڈنی ہے گھر میں ہی ہے۔''

''گھر میں؟''

''ہاں اپنی حوریہ کی بات کر رہی ہوں۔'' وہ اپنے آپ میں مگن تھیں ورنہ عافیہ کے ناگوار تاثرات انہیں ضرور چونکاتے۔

''مگر آنٹی! حوریہ، حنان سے بڑی ہے اور پھر نوعمری میں اس کے ساتھ جو حادثہ ہوا ہے۔

مجھے تو یہ رشتہ بے جوڑ لگ رہا ہے۔ حنان کو ایک سے ایک کم عمر، خوب صورت لڑکی مل سکتی ہے۔''

اس نے دل کی بات کہہ ڈالی جو زہرا بیگم کو اچھی نہیں لگی۔

''تین چار سال کی چھوٹائی بڑائی کوئی اہمیت نہیں رکھتی پھر حوریہ دیکھنے میں کسی طرح بھی حنان سے بڑی نہیں لگتی۔ اور جو حادثہ اس کے ساتھ ہوا یہ ایسی یاد رکھنے والی بات بھی نہیں ہے اور پھر اس بات کو اب گیارہ سال گزر چکے ہیں۔''

زہرا بیگم اس کے اعتراض کو خاطر میں نہیں لائی تھیں۔ پھر بھی عافیہ نے ایک اور کوشش کی۔

''آپ نے حنان سے پوچھا ہے؟''

''اس سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اسے بتا دوں گی، وہ انکار نہیں کرے گا۔ پھر انکار کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔ حنان خوش قسمت ہوگا جو حوریہ جیسی لڑکی اس کی بیوی بنے گی۔'' ان کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

عافیہ برا سا منہ بنا کر ان کے پاس سے اٹھ آئی۔ اس نے سب سے پہلے اپنے میکے فون کر کے یہ بات بتائی۔ ثناشا کا تو برا حال تھا۔ عافیہ نے باتیں کر کر کے چھیڑ چھیڑ کر اسے خوابوں کی وادی میں پہنچا دیا تھا۔ وہ حنان پر اپنا حق سمجھتی تھی۔ عافیہ کا شروع سے ہی ارادہ تھا کہ اس گھر میں دیورانی بن کر ثناشا ہی آئے گی۔ کیونکہ حنان بہت ذہین سٹوڈنٹ تھا۔ عافیہ آٹھ سال پہلے اس گھر میں حیدر کی دلہن بن کر آئی تھی۔ تب سے حنان ہر کلاس میں امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس ہو رہا تھا۔ ایف ایس سی کے بعد اس نے اپنے لیے انجینئرنگ لائن چنی۔

انجینئرنگ مکمل کرنے کے بعد اس کو بہت اچھی جاب مل گئی تھی دیگر سہولیات اس کے علاوہ تھیں۔ وہ تو اور ہی خواب دیکھ رہی تھی مگر زہرا بیگم نے تلخ حقیقت کا سامنا کروا دیا تھا۔

ثناشا نے دو ماہ پہلے ہی گریجویشن کا امتحان دیا تھا۔ عافیہ کا ارادہ تھا کہ جیسے ہی رزلٹ آؤٹ ہو وہ حیدر سے ثناشا اور حنان کے رشتے کی بات کرے اور وہ پھر اس کی خواہش کو زہرا بیگم تک پہنچائے۔

عافیہ کو امید تھی زہرا بیگم انکار نہیں کریں گی پھر حنان کو بھی کسی بات سے آج تک ثناشا کے بارے میں کوئی ناپسندیدگی عیاں نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ ثناشا کی آمد سے وہ خوش ہوتا اس کی شگفتہ مزاجی اور بزلہ سنجی اسے پسند تھی۔

اب اچانک زہرا بیگم، حوریہ کو درمیان میں لے آئی تھیں۔

◉

حوریہ نے زہرہ بیگم کو کھانے کے بعد دوا بھی کھلا دی تھی۔ وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہوئی تو انہوں نے دوبارہ آواز دے ڈالی۔ وہ جائے نماز رکھ کر ان کے پاس چلی آئی۔

''جی پھوپھو! کیا بات ہے؟''

جواباً انہوں نے اسے پاس بٹھا لیا اور اس کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر پیار سے چوما۔ ان کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ وہ تڑپ ہی تو گئی۔

''پھوپھو! کیوں رو رہی ہیں؟'' اس نے اپنے ہاتھوں کے پیالے میں ان کا چہرہ تھام لیا۔

''یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ آج میرا بھائی، میرا شجاعت زندہ ہوتا تو میں اس کے پاس تمہیں مانگنے جاتی۔ پوری چاؤ اور مان کے ساتھ۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں حنان کی دلہن بنا کر ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے ناں۔''

حوریہ بری طرح نروس ہو گئی۔ ایک دم سے پھوپھو نے غیر متوقع بات کی تھی وہ گھبراہٹ اور شرم کے ملے جلے تاثرات کا شکار تھی۔ پھر اس سے پھوپھو کے پاس مزید بیٹھا نہیں گیا، اٹھ کر ٹیرس پہ آ گئی۔ اسے پھوپھو سے بہت شرم آ رہی تھی۔

اس کے جانے کے بعد زہرا بیگم نے حنان کو بلوایا۔ اور اس سے بھی یہی بات کی۔

''میں پہلے اپنی خواہش کو دل میں دبائے رہی کہ تم پڑھ رہے ہو پھر تمہاری نوکری کا انتظار تھا۔ اب تم دو سال سے برسر روزگار ہو، اچھا کما رہے ہو۔ حوریہ تمہارے سامنے ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ مجھے امید ہے وہ تمہاری زندگی کو سنوار دے گی۔'' ساتھ ہی وہ حنان کے تاثرات بھی دیکھ رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے امی! جو آپ کی مرضی۔'' حنان خاصی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا تو زہرا بیگم نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

''ٹھیک ہے، اگلے اتوار کو منگنی کی رسمی سی تقریب کر لیتی ہوں۔ تم اپنے قریبی دوستوں کو بلا لینا۔ میں نہیں چاہتی کہ حوریہ کے دل میں کوئی ارمان باقی رہے۔ اس کے بعد ایک ماہ کے اندر اندر شادی بھی کر لیں گے۔'' زہرا بیگم اپنا پروگرام بتا رہی تھیں۔

صبح انہوں نے عافیہ کو بھی اپنے پروگرام کے بارے میں بتا دیا۔

''حوریہ کو بازار لے جانا۔ وہ منگنی کا جوڑا اور دیگر چیزیں اپنی پسند سے خرید لے گی۔ ساتھ ہی لسٹ بناؤ کہ کن کن لوگوں کو بلانا ہے منگنی میں۔'' وہ اس کے دل کی حالت سے بے خبر بتا رہی تھیں اور عافیہ کے منہ سے کوئی لفظ ہی نہیں نکل رہا تھا۔

◉

انسان جو سوچتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہی ہو۔ زہرا بیگم جو حوریہ اور حنان کی منگنی کے انتظام کرنے میں مصروف تھیں۔ رات کو اچانک بلڈ پریشر ہائی ہو جانے سے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہو گئیں۔ حیدر اور حنان انہیں ایمرجنسی میں قریبی ہاسپٹل میں لے گئے۔ مگر تب دیر ہو گئی تھی۔ زہرا بیگم کو برین ہیمبرج ہوا تھا اور جسم کا بایاں حصہ پیرالائز ہو چکا تھا۔

اسی پوزیشن میں دس دن رہنے کے بعد وہ بڑی خاموشی سے خالق حقیقی سے جا ملیں۔

باقی گھر والوں کا جو حال تھا وہ سو تھا مگر جو حوریہ پہ گزر رہی تھی۔ وہی جانتی تھی۔ ابو کے قتل کے بعد آج سے ساڑھے سات سال پہلے اسے گاؤں سے شہر اپنے پاس لانے والی پھوپھو زہرا ہی تھیں۔ انہوں نے کسی موقع پر بھی اسے تنہائی یا اکیلے پن کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ اسے بالکل سگی بیٹیوں کی طرح محبت دی، خود ان کی اپنی بیٹی تو تھی نہیں یہ خلا حوریہ کے وجود سے بخوبی پُر ہو گیا تھا۔

حیدر بھائی حوریہ سے ڈیڑھ سال بڑے تھے جبکہ حنان اس سے تین ساڑھے تین سال سال چھوٹا تھا۔ وہ شروع سے ہی کتابی کیڑا تھا۔ کالج اور یونیورسٹی سے گھر آنے کے بعد دوستوں اور پڑھائی میں مصروف ہو جاتا۔ حیدر بھائی، حوریہ کو بہنوں کی طرح ہی چاہتے تھے۔ مگر ان کی ڈور شادی کے بعد عافیہ کے ہاتھ میں تھی۔ سو حوریہ کو شروع سے ہی ان کی مجبوری کا اندازہ تھا۔

حنان کی اپنی دنیا تھی مگر اس کے باوجود وہ حوریہ کے وجود سے لاعلم نہیں تھا۔ امی کی فکر کرتی، گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مصروف اپنی اس بے ضرر سی کزن سے حنان کو ہمدردی تھی پھر امی بھی اسے بہت چاہتی تھیں۔ اسے اپنے گھر لانے کے بعد انہوں سوچ لیا تھا کہ حوریہ کو اپنی بہو بنانا ہے۔ اپنی اس خواہش کا اظہار انہوں نے کسی کے سامنے نہیں کیا تھا کہ مبادا وہ یہ بات کر دیں اور کل حنان وقت آنے پہ بدل جائے تو حوریہ کا دل برا ہو۔

اپنے خوابوں اور خواہشوں کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی قضا نے آ دبوچا کہ سب خواب ہی بکھرے رہ گئے۔

◉

پھوپھو کی وفات میں تین ماہ گزر چکے تھے اور حنان چپ چپ رہنے لگا تھا۔ حوریہ کا دل جانے کیوں کٹ سا جاتا تھا۔ شاید زہرا بیگم کی وفات کا سب سے زیادہ اثر اسی نے لیا تھا۔ ان کی موت کے بعد گھر کی زندگی آہستہ آہستہ معمول پہ آ گئی تھی مگر حنان کی خاموشی ٹوٹ کر ہی نہیں دے رہی تھی۔

⊛

رات کا کھانا کھایا جا رہا تھا۔ ساتھ باتیں بھی ہو رہی تھیں باتوں کے دوران عافیہ نے حنان سے کہا کہ کل وہ بھی ساتھ چلے اور منگنی کا جوڑا خود پسند کرے۔ حوریہ کے چہرے پر رنگ آ گیا۔ حنان کی نظر بلا ارادہ اس کی طرف اٹھی تھی۔

''ثناشا کو تم خود ہی پک کر لینا۔ جس نے استعمال کرنا ہے پہننا ہے اس کی رضامندی بھی لازمی ہے ناں۔ ویسے بھی ثناشا اپنی پسند و ناپسند کے معاملے میں بہت حساس ہے۔''

عافیہ سراسر حوریہ کو سنا رہی تھی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ اس سارے قصے میں ثناشا کا کیا ذکر ہے اور جب سمجھ میں آیا تو اسے اندرونی اذیت پہ قابو پانا مشکل ہو گیا۔ وہ وہاں سے اٹھ آئی۔

عافیہ کی طنزیہ نگاہوں نے اس کے جاتے قدموں کا پیچھا کیا۔ حنان سر جھکائے پوری طرح کھانے کی طرف متوجہ تھا۔

⊛

درد ہوتے ہیں کہیں دل میں چھپانے کے لیے
سب کے سب آنسو نہیں ہوتے بہانے کے لیے
کوئی غم ہو کوئی دکھ ہو درد کوئی ہو
مسکرانا پڑ ہی جاتا ہے زمانے کے لیے

ملائکہ، اس کی سب سے قریبی دوست، اس کی غم گسار اس وقت اگر اس کا دکھ نہ بانٹتی تو وہ بری طرح بکھر جاتی۔

''اپنے آپ کو سنبھالو پلیز اس میں اوپر والے کی کوئی مصلحت ہوگی۔ تم خود کو سنبھالو اور ان کی خوشیوں میں شریک ہو۔ اچھا ہوا جو تمہارے کزن کی ناپسندیدگی پہلے ہی ظاہر ہو گئی ورنہ بعد میں تم کیا کرتیں......؟ اللہ نے تمہارے نصیب میں جو خوشیاں لکھی ہیں وہ تمہیں مل کر رہیں گی، تمہارا

ایمان اتنا مضبوط تھا تقدیر اور جزا سزا کے فلسفے پہ۔ پھر یہ ناامیدی، یہ ناشکری کیا معنی رکھتی ہے؟''

ملائکہ نے اس کے دکھتے دل پہ تسلی کا مرہم کیا رکھا کہ اس کے بہتے آنسو تھمنے لگے۔

ملائکہ سے اس کی دوستی دس گیارہ سال پرانی تھی۔ وہ چوہدری شیر داد کی بیٹی تھی۔ ابو کے بہت قریبی دوست کی بیٹی۔ ایک بار گاؤں کی سیر کے لیے آئی تو پھر ہمیشہ کے لیے صاف دل اور معصوم سی حوریہ کی گرویدہ ہو کر رہ گئی۔

وہ بیاہ کر اپنے شوہر کے ساتھ فرانس چلی گئی تھی مگر ان دونوں کی دوستی اور محبت میں یہ دوری اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ ملائکہ اب بھی اسے فون کرتی۔

اس کی دوستی پہ حوریہ کو بہت ناز تھا۔ ہر پریشانی میں وہ اسے سب سے پہلے یاد آتی۔ یہ اسی محبت کا کرشمہ تھا کہ اس نے حوریہ کی روئی روئی آواز کو اتنے دور بیٹھے ہوئے بھی محسوس کر لیا تھا۔ حوریہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سب بتانا پڑا۔ ملائکہ اس کے دکھ پہ اداس تھی مگر اسے حوصلہ دے رہی تھی۔

پھوپھو نے اسے بے پناہ محبت دی تھی۔ یہ ان کی محبت کی انتہا تھی کہ وہ اسے بیٹی بنا کر گھر میں رکھنا چاہتی تھیں۔ اسے حنان سے کوئی فلمی یا افسانوی قسم کی محبت تو نہیں تھی مگر پھوپھو کی خواہش کے اظہار کے بعد اس کے دل میں بھی چاہت کے ازلی خودرو پودے نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ صد شکر کہ وہ تناور درخت نہیں بنا تھا مگر اذیت تو ہوتی ہے۔ ٹھکرائے جانے کی، انکار کی وہ اور وہ اسی اذیت سے گزر رہی تھی۔

⊛

حیدر، بیوی کے سامنے ایک لفظ نہیں بول سکا اور حنان کی منگنی بڑی دھوم دھام کے ساتھ ثناشا کے ساتھ ہو گئی۔ اسے بھی اپنی ماں کی خواہش کا علم تھا۔ انجان تو حنان بھی نہیں تھا۔ مگر عافیہ نے اس کے سامنے حوریہ کی گزشتہ زندگی کی نحوست کی ایسی تصویر کشی کی، اس کی اور حوریہ کی عمر کے معمولی سے فرق کو یوں بڑھا چڑھا کر خامی میں بدلا کہ حنان کو اپنی راہ نجات ثناشا کی صورت میں نظر آنے لگی۔

ثناشا تھی بھی خوبصورت، طرح دار، شوخ مزاج اور کم عمر۔ اس پر حنان کو متوجہ کرنے کی کوششیں اور وہ اپنا دامن بچا بھی نہیں پایا۔

دونوں طرف سے شادی کی شاپنگ عافیہ ہی کر رہی تھی۔ اس نے حوریہ سے کسی قسم کی

معذرت کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اور یہ سب کتنا تکلیف دہ تھا اس کے لیے وہی جانتی تھی۔

❁

ڈاکٹر آفتاب، حیدر اور عافیہ کے پاس زہرا بیگم کی تعزیت کرنے آئے تھے۔ عافیہ اور حیدر بہت خوش تھے کہ ڈاکٹر آفتاب ان کے گھر آئے ہیں۔ حوریہ اپنے کمرے میں لیٹی تھی ڈرائنگ روم سے آوازیں آ رہی تھیں مگر وہ اٹھ کر نہیں گئی۔

اگلے روز عافیہ کے سر میں شدید درد تھا۔ وہ سیدھی ڈاکٹر آفتاب کے پاس پہنچ گئی۔

حیرت انگیز طور پر کچھ دیر بعد ہی اس کے سر کا درد کم ہوتے ہوتے ختم ہو گیا۔ احتیاطاً ڈاکٹر آفتاب نے اس کے کچھ ٹیسٹ لیے۔ رپورٹ دیکھ کر ان کے چہرے پہ پریشانی سی آ گئی۔

''آپ کا دل کچھ ٹھیک کام نہیں کر رہا ہے اور میگرین بھی ہے۔ لیکن یہ میں اپنے کلینک سے ہی کچھ میڈیسن دے رہا ہوں، یہ آپ نے ایک ماہ کھانے کے بعد دوبارہ آنا ہے میرے پاس۔ نئے سرے سے آپ کے ٹیسٹ ہوں گے۔ پھر دیکھیں گے۔ آپ کتنا امپرو کرتی ہیں۔ آپ کے گھر میں جو ماں جی کے بھائی کی بیٹی رہتی تھی وہ کیسی ہے؟''

انہوں نے اچانک حوریہ کے بارے میں پوچھ لیا۔ یہ تو عافیہ کا پسندیدہ موضوع تھا جس پہ وہ گھنٹوں بول سکتی تھی۔

''بس نہ پوچھیں۔ ہم سب بہت پریشان ہیں اس کے بارے میں۔ میری تو نیند ہی اڑی ہوئی ہے اس کی وجہ سے۔ کوئی اچھا رشتہ ملے تو شادی کر دوں اس کی۔ آنٹی بھی جب تک زندہ رہیں، اسی کی فکر میں گھلتی رہیں۔ اب ہمارا بھی یہی حال ہے۔'' اس نے دنیا بھر کا درد لہجے میں سمو لیا تھا۔

''کیوں اتنی فکر کرتی ہیں، اچھے گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کو جلد یا بدیر اچھے رشتے مل ہی جاتے ہیں۔''

''بات تو آپ کی ٹھیک ہے مگر لڑکے والوں کے نخرے بہت بڑھ گئے ہیں۔ پھر حوریہ کے ساتھ بہت نوعمری میں جو ٹریجڈی ہوئی، اس کی وجہ سے کوئی اچھا رشتہ ملتا ہی نہیں ہے۔''

''میں پوچھ سکتا ہوں کہ کیا ٹریجڈی ہوئی ان کے ساتھ؟'' وہ پوری طرح عافیہ کی سمت متوجہ ہو گئے تھے۔

عافیہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ بات کے اختتام پر ڈاکٹر آفتاب یکدم خاموش سے ہو گئے۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ اس بچی کے ساتھ یہ سب ہوا ہے۔ بہرحال اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی۔ اب آپ نے کیا سوچا ہے ان کے بارے میں؟''

''ہم نے کیا سوچنا ہے کسی کنوارے لڑکے کا رشتہ ملنا تو محال ہے کیونکہ جو سنتا ہے واپس نہیں آتا۔ عافیہ نے دھڑلے سے جھوٹ بولا تو ان کی فراخ پیشانی پہ شکنیں سی پڑ گئیں۔

''میں اگر اپنے لیے حوریہ صاحبہ کا رشتہ طلب کروں تو آپ کا کیا خیال ہوگا؟'' اس گستاخی کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں عمر کے اس حصے میں ہوں کہ اب یہ معاملات خود طے کر سکتا ہوں۔''

عافیہ پہ تو شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ڈاکٹر آفتاب نے یہ سب کہا ہے۔

''میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گی۔''

''میں باقاعدہ طور پہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ آؤں گا آپ کے گھر۔ بہت سی باتیں آپ کو بتانی ہیں جن سے آگاہ ہونا آپ لوگوں کا بہت ضروری ہے پھر حوریہ صاحبہ کی مرضی بھی معلوم کرنی ہے آپ نے.....'' وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے اور عافیہ سر ہلا رہی تھی۔ بہت عجیب سا سحر تھا ان کی ذات میں۔ ان کے ٹرانس سے نکلنا بہت مشکل تھا۔

''حوریہ بہت خوش قسمت ہے۔ پہلے حنان اور اب یہ ڈاکٹر آفتاب کا رشتہ.....'' عافیہ گھر پہنچنے تک یہی سوچتی آئی۔

❁

اس کا ارادہ تھا وہ حیدر کو آرام سے بتائے گی مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ دوسرے روز ڈاکٹر آفتاب خود ان کے گھر پہنچ گئے۔

حیدر اور حنان دونوں ہی گھر پہ تھے۔

ڈاکٹر آفتاب اکیلے ہی آئے تھے۔

جب انہوں نے مدعا بیان کیا تو حیدر چند ثانیہ کے لیے حیران سا ہو گیا مگر عافیہ کی نگاہوں نے خاموش رہنے کا پیغام دیا تو وہ ڈھیلا سا پڑ گیا۔

عافیہ مسلسل بول رہی تھی۔ ڈاکٹر آفتاب نے اپنی لائف ہسٹری کھول کر ان کے سامنے رکھ دی۔

مجھے رنگ دے

’’میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوا۔ ابھی میٹرک میں ہی تھا کہ گھر والوں نے مجھ سے پندرہ سال بڑی کزن سے رشتہ طے کر دیا۔ خیر خاندان والوں کی عزت کی خاطر میں نے سر جھکا دیا۔ پھر آرمی میں کمیشن مل گیا۔ میں نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ اس سلسلے میں میں نے امریکہ، فرانس اور اٹلی کا سفر بھی کیا۔ میری خدمات کے صلے میں امریکہ نے مجھے اعزازی ڈگری دی۔ اللہ نے بہت عزت اور شہرت دی۔ قریب المرگ مریض بھی میرے پاس آ کر ٹھیک ہو جاتے۔ میرے پاس محنت کی جو کمائی تھی اس سے میں نے یہ ہاسپٹل اور بے سہارا عورتوں بچوں کے لیے ایک ادارہ قائم کر دیا۔

لیکن میری گھریلو زندگی بہت ڈسٹرب رہی۔ تین بچے ہوئے جو سراسر میری ذمہ داری تھے کیونکہ ان کی ماں کو کوئی پروا نہیں تھی۔ پھر اس نے مجھ سے طلاق لے لی۔ تو میں نے بچوں کے لیے ماں باپ دونوں کا رول کیا۔ بیٹی اور بیٹا دونوں ڈاکٹر ہیں۔ چھوٹی بیٹی کو بھی سماجی کاموں سے لگاؤ ہے، اس نے میری این جی او اور ادارے کا نظام سنبھالا ہوا ہے۔ میرے تینوں بچے بہت نیک اور انسانیت کے جذبے سے سرشار ہیں۔ وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں شادی کر لوں۔ کنواری لڑکیوں کے والدین تک نے اپنی بیٹیوں کے رشتے پیش کیے مگر نہ جانے کیوں آپ لوگوں سے اپنائیت سی محسوس ہوئی۔ پھر حوریہ صاحبہ کی زندگی میں جو ٹریجڈی ہوئی، ایسی صورت میں انہیں سہارا دینا عین ثواب کا کام ہے۔ میں نے ہاسپٹل میں انہیں آپ کی ماں جی کا خیال رکھتے دیکھا، حوریہ صاحبہ کے دل میں بھی انسانی فلاح کا جذبہ موجود ہے۔ انہیں ایک سہارے کی ضرورت ہے اور مجھے اپنے بعد اپنے ہاسپٹل اور مشن کو زندہ رکھنے کے لیے تازہ خون اور جوش و جذبے کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت حوریہ صاحبہ بخوبی پوری کر سکتی ہیں۔ آپ کو پورا وقت دیتا ہوں۔ میرے بارے میں ہر طرح سے اپنا اطمینان کر لیں تو مجھے آگاہ کر دیجئے گا۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔‘‘

ڈاکٹر آفتاب کا ایک ایک لفظ متاثر کن تھا۔ وہ تینوں سحر زدہ سے خاموش تھے صرف وہی بول رہے تھے۔

ڈاکٹر آفتاب کے جانے کے بعد بھی ان کے الفاظ اور احساس کی مہک جیسے فضا میں رچی بسی تھی۔

ساری باتیں ٹھیک تھیں مگر نہ جانے کیوں حنان کو یہ سلسلہ پسند نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر آفتاب کی پرسنالٹی متاثر کن تھی۔ ان کا نام تھا، مقدس پیشے سے وابستہ تھے۔ انہیں کسی قسم کا کوئی

لالچ نہیں تھا۔ ان کے مقابلے میں حوریہ ایک عام سی لڑکی ہی تو تھی جس کے لیے اگر یہ رشتہ آیا تھا تو یقیناً اس کی خوش قسمتی میں کلام نہیں تھا۔ مگر ڈاکٹر آفتاب کی عمر اچھی خاصی تھی، آرمی سے بحیثیت بریگیڈیر وہ ریٹائرڈ ہوئے تھے اور چون سال کے تھے گو دیکھنے میں وہ صرف چالیس سال کے نظر آتے تھے مگر اپنی عمر انہوں نے خود بتائی تھی کہ وہ چون سال کے ہیں۔ یہ بھی ان کی صاف نیت کا ثبوت تھا کیونکہ کوئی بھی دیکھنے والا انہیں چون سال کا نہیں کہہ سکتا تھا۔ ان کے تین جوان بچے تھے۔ ڈاکٹر آفتاب کی سب سے چھوٹی بیٹی حوریہ کی ہم عمر ہی تھی۔

بس یہی بات حنان کو پریشان کر رہی تھی۔ پر حیدر بھائی اور عافیہ کو ایسی پریشانی نہیں تھی۔ کیونکہ عافیہ نے حنان کے اعتراض کے جواب میں صاف کہہ دیا کہ حوریہ اب کوئی سولہ سال کی بچی نہیں ہے جس کے لیے بیس سال کے لڑکے کا رشتہ آئے گا انتیس کی ہونے والی ہے وہ، پھر نوجوانی میں جو داغ لگا اس کی وجہ سے کوئی کنوارا لڑکا شادی نہیں کرے گا اس سے۔ شکر کرو کہ ڈاکٹر آفتاب نے سب کچھ جاننے کے بعد بھی کوئی اعتراض یا ناپسندیدگی ظاہر نہیں کی۔ ورنہ اس جیسے شخص کو لڑکیوں کی کمی نہیں ہے جو چالیس، چالیس لاکھ کی گاڑیوں میں گھومتا ہے۔ وہ تو انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے حوریہ سے شادی کر رہا ہے۔ تو خود بتاؤ جب سے وہ یہاں آئی ہے، مطلب آنٹی جب سے اسے یہاں لے کر آئی ہیں کوئی بھی ایک رشتہ آیا؟‘‘

اس سوال کا حنان کے پاس جواب نہیں تھا سو وہ چپ ہو گیا۔ دل سے وہ بھی بھابی کے خیالات و دلائل سے قائل ہو چکا تھا۔

’’ٹھیک ہے بھابی! آپ ڈاکٹر آفتاب سے کہیں کہ اس کام میں دیر مناسب نہیں ہے۔‘‘

عافیہ خوش ہو گئی۔ شکر ہے حنان کو عقل آ گئی تھی۔ ایک گھر میں رہتے بستے لگاؤ ہو ہی جاتا ہے پھر حوریہ تھی بھی نرم دل اور بے ضرر سی۔ حنان کو اپنی اس کزن سے ہمدردی تھی جو بھابی کی لاکھ کوششوں کے باوجود ختم نہیں ہو رہی تھی۔ اوپر حوریہ کی خاموشی نے اس کے احساس جرم کو بڑھا سا دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ اس کی شادی سے پہلے حوریہ، ڈاکٹر آفتاب کے ساتھ رخصت ہو جائے۔

◈

حوریہ، عافیہ کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ عافیہ اپنی بات مکمل کر کے اس کے تاثرات جانچ رہی تھی۔ جو ڈاکٹر آفتاب کے پروپوزل کا سن کر عجیب سے ہو گئے تھے۔

’’دیکھو حوریہ! ہم سب تمہارا بھلا چاہتے ہیں۔ آنٹی کی اپنی سوچ تھی اور حنان کی

اپنی۔اسے شوخ مزاج لڑکیاں پسند ہیں اور تمہارے علم میں شاید یہ بات نہیں ہے کہ وہ شروع سے ہی نتاشا کو پسند کرتا ہے۔اس لیے جب پھوپھو نے اس کے سامنے تمہارا نام لیا تو اس نے مجھ سے آ کر کہا بھابی میں نتاشا کے سوا کسی کا تصور تک نہیں کر سکتا۔آج کل کے لڑکوں کا تمہیں پتہ ہی ہے۔زور زبردستی کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا سو حیدر نے بھی کہا کہ زندگی تو حنان نے گزارنی ہے۔ اس کی مرضی پہ چھوڑ دو۔اب تم خود دیکھ لو۔حنان منگنی کے بعد کتنا خوش ہے۔معاف کرنا میں حقیقت پسند ہوں۔تمہاری عمر اٹھائیس سال سے زیادہ ہو چکی ہے پھر تمہارے ساتھ جو ٹریجڈی ہوئی اس کی وجہ سے اب شاید ہی کسی لڑکے کے ساتھ تمہاری شادی ہو۔لڑکے، ماڈرن، طرح دار اور خوب صورت لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں ہر داغ سے پاک۔ڈاکٹر آفتاب نے بڑے چاؤ سے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔میں تو کہتی ہوں کہ آنکھیں بند کر کے ہاں کر دو ٹھیک ہے ڈاکٹر آفتاب کی عمر کچھ زیادہ ہے مگر تم بھی کم عمر نہیں ہو۔ان حالات میں یہ رشتہ غنیمت ہے۔"

ان کی "حقیقت پسندی" عروج پہ پہنچی ہوئی تھی۔

حوریہ نے اپنے سارے آنسو اندر اتار لیے ورنہ عافیہ بھابی کی بے رحم سچائی نے اسے اندر تک زخمی کر ڈالا تھا۔

انہوں نے ایک تیر سے کئی شکار کر لیے تھے۔حنان اور نتاشا کی پوزیشن بھی کلیئر کر ڈالی تھی۔اور اس کی عمر اور شکل وصورت کو بھی نشانہ بنا ڈالا تھا ڈاکٹر آفتاب کے قصیدے بھی پڑھ ڈالے۔

❁

کتنی رات گزر گئی تھی مگر نیند آ کے نہیں دے رہی تھی۔اس نے لائٹ جلا کر پانی پیا اور پھر نہ جانے کیوں آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"لڑکے خوبصورت، طرح دار اور ماڈرن لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں۔" عافیہ جیسے دوبارہ اس کے کان میں بولی تھی۔اس کی نگاہیں آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پہ جمی تھیں۔لمبے بالوں کی کس کر باندھی چوٹی، پورے بازوؤں والی قمیص جس میں فٹنگ کا خاص خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ڈھیلی ڈھالی شرٹ میں اس کے جسمانی خطوط اور متناسب بدن کا پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔ نیل پالش سے بے نیاز ناخن، چوڑیوں سے خالی کلائیں، ناک، گردن، کان کسی بھی قسم کے زیور سے بے نیاز، یہ تھی حوریہ شجاعت ایک عام سی لڑکی جس کی عمر اٹھائی سال سے زیادہ ہو گئی تھی۔ تقدیر کی مہربانی سے ایک داغ بھی لگ گیا تھا۔سو اب ڈاکٹر آفتاب نے اسے پروپوز کر کے اس

کی ذات پہ احسان کیا تھا۔

آئینے میں اپنے تھکے تھکے پژمردہ عکس کو دیکھتے دیکھتے اس کے نین کٹورے لبا لب بھر گئے۔

نہ صورت ہے میری ایسی کہ ہو جائے کوئی پاگل
نہ آنکھیں ہیں گہری جھیلیں نہ زلفیں گھنا جنگل
صاحب دل جو ملا ہمیں وہ تھا دیوانہ تیرا
تجھ میں ایسا کیا ہے کہ ہوا سارا زمانہ تیرا

جانے کب کی پڑھی ایک نظم کے چند مصرعے یاد آئے تو عافیہ بھابی کے تلخ جملوں کی سنگینی کا بڑی شدت سے احساس ہوا تھا۔

❁

عافیہ اور حیدر نے ڈاکٹر آفتاب کو کل اس کے بھائی سمیت کھانے پہ انوائیٹ کیا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ ڈاکٹر آفتاب ہی کی طرف گئے ہوئے تھے۔حنان بھی گھر پہ نہیں تھا۔

حوریہ کی آنکھوں کے سامنے گزشتہ زندگی کے منظر گھوم رہے تھے جب وہ گاؤں میں ابو جی کے ساتھ رہتی تھی۔

گھر میں پھیلے سناٹے اسے اندر تک اترتے محسوس ہو رہے تھے۔آج کل عافیہ زور و شور سے ڈاکٹر آفتاب کے رشتے کو فائنل کرنے کے چکر میں تھی۔ٹی وی آن تھا مگر اس کا ذہن کہیں اور پہنچا ہوا تھا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ رہے تھے۔

جب مین گیٹ کی بیل ایک تواتر سے بجنے لگی۔

وہ چونک کر حال کی دنیا میں آئی۔اور الٹے ہاتھ سے آنکھیں بے دردی سے رگڑیں شاید حنان بھائی ہیں۔"صوفے پر پڑا دوپٹہ اٹھا کر اس نے سر اور جسم کے گرد لپیٹا اور باہر گیٹ کی طرف آئی۔چوکیدار چھٹی لے کر گاؤں گیا ہوا تھا سو گیٹ کھولنے کا کام اکثر و بیشتر اسے ہی سرانجام دینا پڑ رہا تھا۔

گیٹ کے سوراخوں سے بلیک کلر کی گاڑی نظر آ رہی تھی۔مگر ڈرائیونگ سیٹ پہ اجنبی سی صورت براجمان تھی۔

حوریہ نے دوپٹہ اچھی طرح منہ اور سر کے گرد لپیٹا اب صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے گیٹ کھول دیا۔وہ جو کوئی بھی تھا ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کے نیچے آ گیا۔

''السلام علیکم، حنان گھر پہ ہے؟ میں اس کا دوست شیر افگن ہوں۔'' نو وارد نے تعارف کرایا۔

''مگر وہ تو گھر پہ نہیں ہیں۔''

''مجھ سے اس نے کہا تھا کہ شام کو گھر پہنچ جاؤں اور خود وہ غائب ہے۔'' ساتھ ہی اس نے رسٹ واچ پہ ٹائم دیکھا۔

''حنان بھائی گھر پہ نہیں ہیں۔'' اس نے دوبارہ زور دے کر کہا۔ تو تب پہلی بار شیر افگن نے اس کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں حنان کی کیا لگتی تھی یہ لڑکی۔ نہ جانے کیوں اسے لگا اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ ابھی وہ واپسی کا قصد کر ہی رہا تھا کہ حنان کی گاڑی کا مخصوص ہارن سنائی دیا جو اس نے شیر افگن کی گاڑی کو دیکھ کر بجایا تھا۔ سڑک پہ مڑتے ہی دور سے اس نے اپنے گیٹ کے آگے شیر افگن کی گاڑی کو دیکھ لیا تھا۔

حنان اسے اندر لے گیا۔

حوریہ کچن میں آ گئی، حنان نے اپنے دوست کی خاطر مدارات کے لیے بڑی لجاجت سے کہا تھا۔

پہلے اس نے کولڈ ڈرنکس اور مینگو شیک اندر بھجوایا اور پھر چائے کے ساتھ دیگر لوازمات تیار کرنے لگی۔

شیر افگن حنان کا بہت قریبی دوست تھا۔ دونوں نے اکٹھے انجینئرنگ کی تھی۔ انجینئرنگ کرنے کے بعد شیر افگن اپنی فیملی کے پاس انگلینڈ چلا گیا تھا۔ اس کے مما پپا اور دو بھائی وہیں مقیم تھے۔ یہاں پاکستان میں اس کی ننھیال اور ددھیال تھی۔

شیر افگن کے والد نوجوانی میں ہی انگلینڈ چلے گئے تھے۔ شادی ہوئی تو بیوی کو بھی وہیں بلوا لیا۔ وہاں ان کا بزنس بہت اچھے طریقے سیٹ تھا۔ شیر افگن پاکستان آتا جاتا رہتا تھا۔ دادا جان کو بھی اس سے بے حد لگاؤ تھا۔ کچھ عرصہ گزرتے ہی انہیں اس کی یاد ستانے لگتی۔ اپنے بڑے بیٹے کی ناگہانی موت کے بعد وہ بکھر گئے تھے۔ ان کی ذہنی کیفیت کو دیکھتے ہوئے اس نے انجینئرنگ پاکستان سے ہی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس دوران حنان سے اس کی دوستی کا آغاز ہوا جو اب بہت گہرے لگاؤ اور خلوص میں بدل گئی تھی۔

چائے بن گئی تھی۔ حوریہ دیگر لوازمات ٹرالی میں سجا کر ڈرائنگ روم کے دروازے پر

دستک دے رہی تھی۔

حنان اٹھ کر باہر آیا اور ٹرالی اندر لے گیا۔

حوریہ اس کے دوستوں یا دیگر اجنبی مردوں کے سامنے نہیں آتی تھی۔ وہ شرعی پردہ کرتی تھی اور سختی سے کاربند تھی اس پہ۔

حنان نے چائے خود سروکی اور کباب کی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

''کھاؤ، بہت مزے دار ہیں۔ میری کزن نے بنائے ہیں۔''

''تمہاری یہ کزن؟ تم نے پہلے کبھی ذکر نہیں کیا۔''

''ہاں یار! کبھی اس کا موقع ہی نہیں آیا۔ تم بھی تو چار ماہ انگلینڈ اور پندرہ دن پاکستان گزارتے تھے۔ خیر یہ میرے ماموں کی اکلوتی بیٹی ہے اور ہمارے پاس ہی رہتی ہے بے چاری کے پیرنٹس نہیں ہیں۔'' حنان نے لفظ بے چاری پہ زور دے کر کہا۔

وہ باتیں کر رہے تھے۔ دنیا جہاں کے قصے چھڑے ہوئے تھے پھر حیدر بھائی اور عافیہ بھی چلے آئے۔ وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔

حیدر نے رات کا کھانا کھائے بغیر اسے جانے نہیں دیا۔

کھانے کے بعد حنان اسے گاڑی تک چھوڑنے آیا۔ حوریہ بجری کی روش کے ساتھ ساتھ بنے لان میں ٹہل رہی تھی۔

شیر افگن کے باہر آنے پہ اس نے دوپٹے سے منہ چھپا کر رخ موڑ لیا تھا۔ شیر افگن کی چٹتی سی نظر پڑی تھی۔ جسے اس نے فوراً ہی موڑ لیا تھا۔

''بے چاری حنان کی کزن۔'' اس نے افسوس سے سوچا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے وہاں سے نکل آیا۔

''حیدر کہہ رہے ہیں۔ چائے تیار ہونے کے بعد ڈرائنگ روم میں آجاؤ اور وہاں تمہارا پنک سوٹ میں نے نکال کر بیڈ پر رکھ دیا ہے، وہی پہن کر آنا اور دوپٹہ ماتھے تک لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے باقاعدہ طور پر تمہارا رشتہ مانگا ہے سو تمہیں دیکھنا ان کا حق بنتا ہے۔'' عافیہ اس کی پشت پہ کھڑی گزشتہ پندرہ منٹ سے بول رہی تھی۔ حوریہ خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کی طرف سے مسلسل خاموشی پا کر وہ جھنجھلا سی اٹھی۔

"حوریہ! میں تم سے کہی رہی ہوں اگر تم راضی نہیں ہو تو میں منع کر دیتی ہوں ان لوگوں کو۔"

"نہیں بھابی! ایسا مت کیجیے گا۔ میں راضی ہوں۔"

وہ جھٹکے سے مڑی اور پہلی بار ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"میری قسمت میں ایسے ہی رشتے لکھے ہیں تو ڈاکٹر آفتاب میں کیا برائی ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"حوریہ! تم ناشکری کرتی ہو ایسے رشتے سے کیا مطلب ہے تمہارا۔ شکر کرو پروردگار کا۔"

"ٹھیک ہے بھابی! میں آتی ہوں ڈرائنگ روم میں۔" اس کی سعادت مندی سے مطمئن ہو کر عافیہ دوبارہ ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو یہ محسوس کیے بنا رہ نہ سکی کہ ڈاکٹر آفتاب اور ان کے بھائی کی نظریں اس پہ جم سی گئی ہیں۔ پنک کپڑوں میں ملبوس وہ خود کو تو عام سی ہی لگ رہی تھی مگر ان دونوں اشخاص کی نظریں کچھ اور کہہ رہی تھیں۔

"بسم اللہ آئیے۔" ڈاکٹر آفتاب اس کی آمد پہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ لہجے میں وہی مخصوص مشفقانہ پن تھا جو ان کی شخصیت کا خاصا تھا۔ وہ سر جھکائے پاس پڑے صوفے پہ ٹک گئی۔

ڈاکٹر آفتاب کی نگاہوں سے اس صاف رنگت دمک سی رہی تھی۔ تیکھے نقوش سمیت گہری موٹی بادامی آنکھیں خاصی متاثر کن تھیں۔ ڈاکٹر آفتاب اسے دیکھنے کے بعد کتنے مطمئن تھے، یہ کوئی ان کے دل سے پوچھتا۔

"اور کیسی ہیں حوریہ بی بی آپ۔ کیا مصروفیت ہیں آپ کی؟" ڈاکٹر آفتاب کا چھوٹا بھائی اس سے مخاطب ہوا۔

"میں ٹھیک ہوں اور کوئی خاص مصروفیات نہیں ہیں۔ گھر پہ ہی ہوتی ہوں۔" اسے جواب دینے میں خاصی مشکل پیش آئی۔

جواباً انہوں نے اسے بڑی گہری نگاہ سے دیکھا۔

"عافیہ بھابی نے بتایا ہے کہ آپ نے ماس کمیونی کیشن میں ایم اے کر رکھا ہے تو کہیں جاب کیجیے ناں۔ پرائیویٹ ٹی وی چینل پہ آپ آرام سے سیٹ ہو سکتی ہیں کیونکہ میڈیا آج کل بہت اسٹرانگ ہے۔ اپنی صلاحیتوں کو کام میں لائیے۔ اپنی تعلیم سے فائدہ اٹھائیے۔ اگر

آپ راضی ہوں تو میں کسی بھی ٹی وی چینل پہ آپ کو جاب دلوا سکتا ہوں۔ بھائی جان خود خاصی اپروچ رکھتے ہیں۔"

ڈاکٹر آفتاب کے بھائی کی لمبی چوڑی بات کے جواب میں اس نے فقط سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

کچھ دیر بعد وہ وہاں سے اٹھ آئی۔

جانے کیوں کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

جاتے وقت ڈاکٹر آفتاب نے عافیہ سے حوریہ کا سیل نمبر لے کر نوٹ کر لیا تھا اور اس کے لیے انہوں نے باقاعدہ پہلے حیدر سے اجازت لی تھی۔

"میں نے حوریہ صاحبہ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ میں یہاں بھی کر سکتا تھا مگر شاید فیس ٹو فیس وہ نہ کر پاتیں کیونکہ وہ روایتی سی مشرقی لڑکی کی طرح ہیں۔ میں چاہتا ہوں خود ان کی مرضی معلوم کروں اپنے بارے میں۔"

ان کے اس طرح بات کرنے سے حیدر کے دل میں ان کی عزت کئی گناہ بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے بخوشی حوریہ کا سیل نمبر نوٹ کروا دیا تھا۔

حوریہ سونے کی تیاری کر رہی تھی جب اس کا سیل گنگنایا۔

اس نے نمبر دیکھے بغیر آن کر لیا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام۔" بڑے پر جوش طریقے سے سلام کا جواب دیا گیا۔ آواز اس کے لیے اجنبی تھی۔

"جی آپ کون؟"

میں ڈاکٹر آفتاب بات کر رہا ہوں۔ اس وقت آپ کو ڈسٹرب کرنے پہ معذرت چاہتا ہوں مگر مجبوری ہے، فرصت کے لمحات کم کم ہی ملتے ہیں۔ میں اس وقت بھی ہاسپٹل میں ہوں۔ خوش قسمتی سے تھوڑی فرصت ملی ہے تو سوچا آپ سے بات کر لوں۔"

حوریہ کی نظر دیوار گیر کلاک کی طرف اٹھی جو بارہ کا ٹائم بتا رہی تھی۔ وہ متاثر ہو گئی۔

"اپنے پیشے سے کتنا مخلص ہے ورنہ کس کو اتنی پروا ہوتی ہے مریضوں کی۔" اس نے دل میں سوچا۔

ڈاکٹر آفتاب نے اس سے چھوٹے چھوٹے سوال پوچھے۔ اس کے والدین کے بارے میں، گاؤں کے بارے میں پھر پھوپھو اور ان کے گھر آمد کے بارے میں۔ وہ ٹھہر ٹھہر کے جواب دیتی گئی۔

''آپ کو بتاؤں کہ میں رائٹر بھی ہوں۔ میری کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ میں شاعری بھی کرتا ہوں۔ مگر میرے قلم سے اللہ کی تعریف کے سوا کچھ نکلتا ہی نہیں۔ میں نے رومینٹک شاعری نہیں کی کبھی نہ مجھے اس سے لگاؤ ہے لیکن کچھ دن پہلے ایک نظم پڑھی اور وہ اس وقت مجھے یاد آگئی ہے اگر آپ کی اجازت ہو تو سماعتوں کی نذر کروں؟ جانے کیوں آپ کے خاموشی کچھ بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔''

''جی جی سنائیے۔'' اب حوریہ کو بھی دلچسپی ہونے لگی تھی۔

تم معصوم سی بھولی بھالی سی
الجھی الجھی بے کل بے کل
گم صم گم صم سی رہتی رہو
تم کو باتیں کب آتی ہیں
لیکن جب کچھ کہنا چاہو
آنکھوں آنکھوں کہہ جاتی ہو
اور سب کچھ منوا لیتی ہو
اور یہ دنیا والے پاگل
ان کو کیسے میں سمجھاؤں
باہر سے چپ رہتی ہو پر اندر سے تم بول رہی ہو
اک دروازہ بند ہے لیکن سو دروازے کھول رہی ہو
بھولی بھالی لڑکی
اب جو کہنا مجھ سے کہنا اب جو سننا مجھ سے سننا
دنیا یوں ہی کہتی ہے تم کو باتیں کب آتی ہیں

ڈاکٹر آفتاب کا انداز بڑا دھیما سا تھا۔ حوریہ خاموش سی ہو گئی۔

''لگتا ہے یہ جس کسی نے بھی لکھی ہے آپ کے لیے لکھی ہے۔ میں آپ سے کل بات

کروں گا۔ ابھی ایمرجنسی آگئی ہے۔ کچھ باتیں کرنا ہیں جن کا جاننا آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔ اپنا خیال رکھیے گا اللہ حافظ۔''

ڈاکٹر آفتاب نے فون بند کر دیا۔ حوریہ کافی دیر ان کے بارے میں سوچتی رہی۔ پھر اس نے خود کو حالات کے دھارے پہ چھوڑ دیا۔ کم از کم اب وہ بے سکون تو نہیں تھی۔

عافیہ کے کچھ دنوں سے کمر میں درد تھا۔ میڈیسن لینے کے باوجود آرام نہیں آ رہا تھا۔ حیدر سے اس نے ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر آفتاب کو چیک کرالو۔ بات اس کے دل کو لگی تھی۔ اس نے جانے کیا سوچ کر حوریہ سے بھی چلنے کو کہا مگر اس نے بڑے سلیقے سے انکار کر دیا۔

سو عافیہ اکیلی ہی گئی۔

ڈاکٹر آفتاب اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے سب کا حال احوال پوچھا آج تو حیدر بھی ساتھ تھے۔

''لگتا ہے آپ نے ہاں کے انتظار میں ہماری جوتیاں گھسا دینی ہیں۔'' ڈاکٹر آفتاب نے مسکراتے ہوئے بڑی لطیف سی چوٹ کی تو عافیہ ہنس پڑی۔

''آپ فکر نہ کریں، فیصلہ آپ کے حق میں ہی ہوگا۔''

''میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میرے بارے میں ہر طرح کی تسلی کر لیں۔ چھان بین کروا لیں مگر یہ کام جلدی کریں تو اچھا ہے کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ بات پھیلے۔ آپ کو پتہ ہے کہ نیکی کا زمانہ نہیں ہے۔ ایک بے سائبان لڑکی کو میں سہارا دوں گا تو کوئی بھی میرے اس جذبے کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھے گا۔ الٹا سب مجھے لعنت ملامت کریں گے کہ خود سے اتنی کم عمر لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ میری پہلی بیوی نے اگرچہ طلاق لے لی ہے مگر اس موقعے پر وہ بھی مخالفت کرے گی اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ کام جلدی ہو۔ ساتھ یہ کہ میں آدھا ہاسپٹل حوریہ صاحبہ کے نام کروانا چاہتا ہوں۔ وہ اس میں میری پارٹنر ہوں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد وہ میرے اس انسانی فلاح کے مشن کو جاری رکھیں۔ میری زندگی کا کیا بھروسہ دو سال، چار سال زیادہ سے زیادہ دس سال اور جیوں گا اس کے بعد حوریہ صاحبہ نے ہی آفتاب فاؤنڈیشن کو جاری رکھنا ہے وہ میری وارث ہوگی۔''

حسبِ معمول ڈاکٹر آفتاب بول رہے تھے اور وہ دونوں کسی سحر زدہ معمول کی طرح

سن رہے تھے۔

"کتنا بے غرض اور بے ریا شخص ہے۔ فرشتہ ہے فرشتہ۔"

عافیہ اور حیدر دونوں کی سوچ اس مقام پر ڈاکٹر آفتاب کے بارے میں ایک جیسی تھی۔ ہر ملاقات میں وہ پہلے سے زیادہ متاثر ہو رہے تھے۔

ڈاکٹر آفتاب نے بڑی توجہ سے عافیہ کو چیک کیا کچھ ضروری ٹیسٹ کے لیے جن کی رپورٹ کچھ ایسی حوصلہ افزا نہیں تھی۔

"عافیہ بی بی! آپ کا جگر ٹھیک کام نہیں کر رہا ہے آپ کو میں دس دن ایڈمٹ کروں گا اس کے بعد آپ کی یہ پرابلم جڑ سے ختم ہو جائے گی، کیا خیال ہے آپ کا حیدر؟"

وہ سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے اسے ہاں کرتے ہی بنی۔ کیونکہ وہ خود بھی پریشان تھا۔ عافیہ اس کی بیوی تھی، بچوں کی ماں تھی۔

"آپ فکر نہ کریں یہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی کیونکہ جہاں ایلو پیتھک طریقۂ علاج ناکام ہوتا ہے، وہاں سے چائینز طریقۂ علاج شروع ہوتا ہے اور یہ میں نے اپنے جن مریضوں پہ آزمایا ہے اللہ کے فضل سے سب نے شفا پائی ہے۔"

ڈاکٹر آفتاب نے عافیہ کو روم میں شفٹ کر دیا۔ کمرے میں ٹی وی فون، اٹیچ باتھ روم کی سہولت موجود تھی۔ ہاسپٹل صاف ستھرا تھا۔ حیدر مطمئن تھا۔ اس نے ہاسپٹل سے ہی فون کیا گھر پہ اور بتایا کہ عافیہ ایڈمٹ ہو گئی ہے۔

عافیہ کے میکے والے پریشان ہو گئے۔ شام کو نتاشا بڑے بھائی اور بھابی کے ساتھ پہنچ گئی۔ حسان بھی آفس سے فری ہو کر ادھر آ گیا۔

حوریہ روز ہاسپٹل آتی اور آتے وقت عافیہ کے لیے کچھ نہ کچھ پرہیزی کھانا بنا کر لے آتی۔ جب سے عافیہ ایڈمٹ ہوئی تھی، ڈاکٹر آفتاب کے چکر اس کے روم کی طرف زیادہ ہی بڑھ گئے تھے۔ خاص طور پہ جب حوریہ آتی تو تب ڈاکٹر آفتاب لازماً عافیہ کی طبیعت کا پوچھنے آتے۔

حیدر اور عافیہ نے ابھی تک کھل کر ہاں نہیں کی تھی مگر ان کا رویہ حوصلہ شکن بھی نہیں تھا۔ سو ڈاکٹر آفتاب خوش تھے انہیں بات بنتی نظر آ رہی تھی۔ اس دن واپسی پہ حوریہ کو ڈاکٹر آفتاب نے اپنے روم میں بلوایا۔ ڈاکٹر صاحب کی خوبرو سیکریٹری نے اسے بڑی عجیب سی نظروں سے

...۔ وہ اس کی طنزیہ نظروں سے الجھتی اندر چلی گئی۔

ڈاکٹر آفتاب نے دیوار کے ساتھ رکھے صوفے پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی ... کام پہ اندر دو چائے لانے کا آرڈر دیا۔

وہ ابھی تک سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"حوریہ بی بی! بہت بھولی ہیں آپ، کچھ دن پہلے میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرے ...ے میں سوچ لیں، اسی سوال کا جواب حاصل کرنے کی خاطر میں نے آپ کو یہاں زحمت دی ہے۔" وہ مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"اگر قدرت کو یہی منظور ہے تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"مطلب آپ کی طرف سے ہاں ہے؟"

"جی ہاں!" اس نے مختصراً جواب دیا اور دیوار گیر الماری میں سجی کتابیں دیکھنے لگی۔ وہ ...ی اس کی دلچسپی بھانپ گئے۔

"یہ کتابیں میرا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ میں نے شہر سے ہٹ کر بہت خوبصورت گھر دیکھا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ کروڑ کا ہے اور بہت خوبصورت ہے میرا ارادہ ہے کہ شادی کے بعد ہم وہاں ...یں گے۔ میں وہ گھر آپ کے نام کر دوں گا۔ دوسرے میں نے جو گھر بے سہارا عورتوں اور یتیم بچ...ں کے لیے بنایا ہے۔ میں اس کے انتظامات بھی کلی طور پر آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں اور اس ...سپٹل کی ذمہ داریاں بھی آپ کو سنبھالنی ہیں میں تھک گیا ہوں سات سال سے میں نے ایک دن ...ی چھٹی نہیں کی ہے۔ دن رات کام کیا ہے ڈاکٹر آفتاب ایک انسان نہیں بلکہ مشین کا نام ہے۔

آپ کو پتہ ہے ہاسپٹل میں روزانہ تین سو لوگوں کے لیے کھانا پکتا ہے۔ اس ہاسپٹل ...یں، میں نادار اور غریب لوگوں کا تقریباً مفت علاج کرتا ہوں۔ لوگ دور دراز سے میرا نام اور شہرت سن کر میرے پاس آتے ہیں، انہیں کھانے پینے اور رہائش کا مسئلہ ہوتا ہے سو مریض کے ...تھ ہی جو تیماردار ہوتا ہے اس کے لیے بھی ہم نے سونے اور رہنے کے ساتھ کھانے کی سہولت ...ی رکھی ہے اور اس مد میں کوئی پیسہ وصول نہیں کیا جاتا۔ اللہ دے رہا ہے سو سب کام چل رہا ہے۔ کھانا آپ نے دیکھا ہی ہوگا جو ہاسپٹل میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کس معیار کا ہے۔ لوگ ...ئیں دیتے ہیں مجھے۔ آپ کو بتاؤں کہ میرے پاس دو پیدائشی معذور بچے لائے گئے جو اس ...ت کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے ان بچوں کا ایک سال تک فری علاج کیا اور کوئی پیسہ

نہیں لیا۔ خدا کی کرنی کہ وہ بچے صحت مند ہو گئے۔ ان کے ماں باپ مجھے دعا دیتے ہیں کہ میری بدولت وہ بچے آج صحت مند زندگی گزار رہے ہیں۔

میرے پاس ہر مریض کی کیس ہسٹری کا ریکارڈ ہے۔ صحت مند ہو کر جانے سے پہلے میں ان کے خیالات قلمبند کرواتا ہوں آپ پڑھیے گا، کیسے کیسے لوگ میرے پاس سے صحت مند ہو کر گئے ہیں۔

آپ بہت خوش قسمت ہیں جو میرے دل کو بھا گئی ہیں۔ ایک انس سا ہو گیا ہے آپ سے۔ یہ سوچ ذہن میں رکھ کر میرے پاس آیئے گا کہ آپ دنیا کے بہترین مرد کے پاس آ رہی ہیں۔ مجھے آپ کے گھر والوں کی سمجھ نہیں آتی کہ مجھے فائنل جواب کیوں نہیں دے رہے ہیں۔ میرے بیٹے نے باہر جانا ہے اور وہ کہہ رہا ہے کہ پا میں آپ کی شادی کی خوشی دیکھ کر جاؤں گا۔"

حسب معمول ڈاکٹر آفتاب بول رہے تھے اور وہ سن رہی تھی۔

ابھی نہ جانے وہ اور کیا کہتے کہ سیکریٹری دروازہ کھول کر اندر آئی اور بہت آہستہ آواز میں ان سے کچھ کہا جو حوریہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"میں گھر جا رہا ہوں پھر آپ سے گپ شپ ہو گی۔ جانے سے پہلے میں آپ کی بھابی کو دیکھ لوں۔ آپ بھی آیئے میرے ساتھ۔"

وہ بھابی کے روم کی طرف بڑھ گئے۔

حوریہ جب ان کے پیچھے اندر داخل ہوئی تو حنان آیا بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ خود میں عجیب سا محسوس کرنے لگی جیسے کوئی چوری کر کے آئی ہو۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی نہ ڈاکٹر آفتاب کے لہجے اور انداز سے کسی گھٹیا رویے کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ سامنے والے کے دل میں اترنے کا گر جانتے تھے کوئی گرویدہ ہوئے بغیر رہ ہی نہیں پاتا تھا۔

ڈاکٹر آفتاب نے بڑی توجہ سے عافیہ کو خود چیک کیا اور ان کی کچھ میڈیسن تبدیل کیں۔ نرسز کو اس کا خصوصی خیال رکھنے کی تاکید کر کے وہ گھر روانہ ہوئے۔ حوریہ بعد میں حنان کے ساتھ ہی گھر واپس آئی۔

◉

آج اتوار تھا۔ حیدر اور حنان دونوں گھر پہ تھے۔

حوریہ نے ناشتے کے بعد بھابی کے لیے ان کی دو پسندیدہ ڈشز تیار کیں۔ آج حیدر

نے بچوں کو بھی ہاسپٹل لے کر جانا تھا۔

دو دن بعد عافیہ ڈسچارج ہو رہی تھی۔

حوریہ کے علاوہ سب ہی ہاسپٹل گئے۔ وہ گھر کے کام نپٹاتی رہی۔

اگلے دن بھابی نے بطور خاص اسے آنے کی تاکید کی۔

حیدر بھائی اسے صبح ہی لے کر ہاسپٹل آ گئے۔ عافیہ کی طبیعت بہت ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔ کل ویسے بھی انہیں گھر آ جانا تھا۔

ڈاکٹر آفتاب نے اسے پورا ہاسپٹل دکھایا پھر آخر میں اسے وی آئی پی رومز دکھائے جہاں اس وقت مظفر آباد سے لائی گئی ایک بچی ایڈمٹ تھی۔ اسے سب سٹاف سے ملوایا اور آخر میں عافیہ کی تازہ ترین رپورٹس دکھائیں جس میں ان کی پرانی بیماری کا نام و نشان تک نہ تھا۔

عافیہ بہت خوش تھی۔ اپنی رپورٹس کی بابت اسے بھی پتہ تھا۔

سہ پہر کو حنان کا دوست عافیہ بھابی کا پتہ کرنے آ گیا تھا حنان بھی تھا حوریہ نے رخ موڑ کر حجاب درست کیا۔ عافیہ ان دونوں سے باتیں کرنے لگی۔ حوریہ نے کولڈ ڈرنکس حنان اور شیر افگن کو دیں۔ شیر افگن نے شائستگی سے انکار کر دیا۔

عافیہ اسے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ تھا ہی ایسا مہذب، سلجھا ہوا اور ایک دم ریفائنڈ۔

ڈاکٹر آفتاب نے ان سب کو اپنے گھر دعوت پہ انوائیٹ کیا تھا۔ ظاہر ہے حوریہ نے تو جانا نہیں تھا، سو حنان، حیدر اور عافیہ ہی گئے۔

ڈاکٹر آفتاب کا گھر بہت شان دار اور ویل ڈیکوریٹڈ تھا۔ ہر شے سے امارت اور بلند شوق کا اظہار ہو رہا تھا۔

ہر شے سلیقے اور نفاست سے سجی تھی۔ عافیہ اور حیدر بہت متاثر ہوئے۔ وہیں پہ ان کی ملاقات ڈاکٹر آفتاب کی سب سے چھوٹی بیٹی اور ان کی بہت بوڑھی والدہ سے ہوئی جن کی بابت وہ یہ جان کر بہت حیران ہوئے کہ ان کی عمر سو سال سے زائد ہے۔ ڈاکٹر آفتاب نے مزید بتایا کہ میری والدہ کو روحانیت سے بہت دلچسپی ہے اور یہ گزشتہ تیس سال سے چلے میں ہیں اور کسی سے بات نہیں کرتیں۔ وہ انہیں خود اپنی والدہ کے کمرے میں لے گئے تھے جہاں وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھیں، ان کے سلام کا جواب انہوں نے سر کے اشارے سے دیا اور پھر اس کے علاوہ

انہوں نے بات نہیں کی۔ ڈاکٹر آفتاب انہیں بتاتے رہے کہ اماں جان کی روحانی صلاحیتوں سے عام لوگوں نے بہت فیض پایا ہے وہ جس کی طرف نظر کرتی ہیں اس کی قسمت سنور جاتی ہے۔

عافیہ اپنے دکھڑے لے کر بیٹھ گئی اس کے اپنے خود ساختہ مسائل اور پرابلمز تھے۔

وہ ڈاکٹر آفتاب کو حوریہ کے رشتے کے بارے میں ہاں کر کے لوٹے۔ جس پہ ڈاکٹر آفتاب بہت خوش تھے۔

◉

عافیہ، نتاشا اور حنان کی شادی کی تیاریوں میں بھی پیش پیش تھی۔ حنان کی بری بھی بنائی تھی۔ ادھر سے حوریہ کو بھی رخصت کرنا تھا۔ حوریہ کا اتنا زیادہ پرابلم نہیں تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر آفتاب نے کہا تھا کہ وہ سادگی سے نکاح کر کے حوریہ کو لے جائیں گے اور ان کے ساتھ صرف چھ سات افراد ہوں گے۔

عافیہ کے تو ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے کیونکہ ڈاکٹر آفتاب نے نو دس دن کے شارٹ نوٹس پہ نکاح کا بولا تھا۔ وہ بے چاری بوکھلائی ہوئی تھی کیونکہ اگلے ماہ حنان اور نتاشا کی شادی بھی تو تھی۔

وہ زیورات کا آرڈر دے آئی تھی۔ اب حوریہ کے لیے بھی تو سونے کی جیولری بنانی تھی۔ روایتی عورتوں کی طرح اس کی جان نکلی جا رہی تھی کہ پیسہ حیدر کی جیب سے خرچ ہوگا۔

رات سونے کے لیے وہ لیٹی تو اس خدشے کا اظہار بڑے سادہ انداز میں حیدر سے کیا تو وہ خوب ہنسا۔ ''ارے حوریہ کے لیے کچھ بھی خریدنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''کیوں؟'' عافیہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

''بھئی اس کے پاس سونے کی جیولری کافی زیادہ ہے۔'' حیدر نے وضاحت کی۔

''مگر میں نے تو کبھی نہیں دیکھی۔''

''ارے بینک لاکر میں پڑی ہے۔ امی نے گھر پہ رکھنے ہی نہیں دی، زمینوں جائیدادوں کے کاغذات بھی لاکر میں ہیں۔ امی بہت وہمی طبیعت کی مالک تھیں تب ہی کوئی چیز بھی حوریہ کو گھر پہ نہیں رکھنے دی۔''

حیدر اپنی دھن میں بتا رہا تھا اور عافیہ حیران ہو رہی تھی۔

''کون سی زمینوں جائیدادوں کے کاغذات؟ اور جیولری کس نے لے کر دی حوریہ

کو؟'' کچھ دیر پہلے کی چھائی بیزاری ختم ہو گئی تھی۔ اس کی جگہ شوق اور تجسس نے لے لی تھی۔ حیدر نے بات ہی ایسی کی تھی۔ وہ دل میں اندازے لگا رہی تھی کہ شاید آنٹی نے مضافات والا گھر اور مارکیٹ والی دکانیں حوریہ کے نام کی ہوں گی کیونکہ وہ چاہتی بھی تو اسے بہت زیادہ تھیں۔ وہ سلگ رہی تھی کہ ابھی تک اسے اس بات کی ہوا کیوں نہیں لگنے دی گئی کہ حوریہ کے نام اتنا کچھ آنٹی کر گئیں۔

''امی نے حوریہ کے نام کچھ نہیں کیا۔ نہ ہی اسے ضرورت تھی۔''

''ماموں جان کی تمام جائیداد کی وارث حوریہ ہے اور وہ ٹھیک ٹھاک امیر ہے اور جیولری امی نے زبردستی بنوائی تھی کہ کل کو شادی ہوگی تو کام آئے گی ورنہ حوریہ کو اس قسم کی چیزوں سے دلچسپی نہیں ہے۔ بس ماموں جان کی بے وقت موت نے حوریہ کو بالکل اکیلا کر ڈالا تا تب ہی اسے امی اپنے ساتھ لے آئی تھیں مگر ہم سب یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ امی کو حوریہ کی دولت، جائیداد سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے اس کا پیسہ سب کا سب اسی کے نام اکاؤنٹ کھلوا کر جمع کروا دیا تھا۔''

حیدر نے مختصراً بتایا اور خاموش ہو گیا۔

امی کے تذکرے پہ اس کا دل اداس ہو گیا تھا۔ عافیہ دل ہی دل میں حوریہ کی زمینوں اور بینک بیلنس کا حساب لگا رہی تھی۔ اتنی اہم بات اسے آج پتہ چلی تھی۔ جس پہ وہ جتنا بھی حیران ہوتی کم تھا۔

ڈاکٹر آفتاب نے کہلوایا تھا کہ حوریہ کے لیے شادی کے کپڑے، جوتے، جیولری جو جو کچھ لینا ہے خود لے لیں ان کی طرف سے بھی پھر جو بھی خرچہ آئے مجھ سے پیسے لے لیجئے گا۔

آج پہلی بار عافیہ الجھی تھی۔

''کمال ہے خود کر لیں ناں حوریہ کی شاپنگ۔ اپنی بیٹیوں سے کہیں۔ وہ کر لیں۔ آرام سے کہہ دیا کہ سب کچھ لے لیں پھر پیسوں کا مجھے بتا دیں۔ حد ہوتی ہے۔''

وہ اونچا اونچا بول رہی تھی۔ حوریہ نے نہ سمجھ آنے والے انداز میں اسے دیکھا تھا۔

◉

رات ڈاکٹر آفتاب کا فون آ گیا۔ وہ نماز سے فارغ ہو کر بیٹھی تھی۔ سیل اٹھایا تو ڈاکٹر آفتاب کالنگ کے الفاظ چمک رہے تھے۔

''میں نے سوچا، آپ سے پوچھ لوں کہ آپ کی شاپنگ کہاں تک پہنچی؟'' آج ان

کے لہجے میں بے پناہ شوخی تھی۔ رنگ ڈھنگ ہی بدلا ہوا تھا۔

''میں نے تو کوئی شاپنگ نہیں کی۔'' حوریہ کا لہجہ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ تھا۔

''کیوں؟''

''بس موڈ نہیں تھا، میں نے عافیہ بھابی سے کہا ہے وہ خود ہی لے آئیں ان کی چوائس کافی اچھی ہے۔''

''اچھا اچھا یہ بات ہے۔ چوائس تو آپ کی بھی اچھی ہے اب مجھے ہی دیکھ لیں...... ہاہاہا......''

ڈاکٹر آفتاب نے اپنے مذاق سے خود ہی لطف اٹھایا ''ویسے میں دیکھنے میں کیسا لگتا ہوں، میرا مطلب ہے عمر کے حساب سے۔'' انہوں نے سوال کیا تو حوریہ نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا۔

''ڈاکٹر صاحب! دیکھنے میں آپ زیادہ سے زیادہ چالیس سال کے لگتے ہیں اور کسی طرح بھی جوان بچوں کے باپ نہیں لگتے۔'' حوریہ نے ان کی ظاہری شخصیت سے نظر آنے والے تاثر کا کھل کر اظہار کیا تو ڈاکٹر آفتاب کو بہت اچھا لگا۔

''اور پتہ ہے دیکھنے میں آپ بھی اکیس بائیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتیں۔ اللہ نے اتنے پیارے نقش دیے ہیں۔ اتنی خوبصورت موٹی موٹی آنکھیں دی ہیں۔ اٹھنے بیٹھنے کا خوبصورت انداز دیا ہے۔ لہجہ اور آواز دونوں متاثر کن ہیں مگر اس کے باوجود آپ نے خود کو محروم نہیں کیا۔ تھوڑی سی توجہ اپنی لکس پہ دیں تو واللہ قیامت ہیں آپ۔''

حوریہ نے اپنی دھن میں ڈاکٹر آفتاب کا آخری جملہ نہیں سنا ''کیا مطلب ہے آپ کا'' میں خود پہ توجہ دیتی تو ہوں۔''

''خاک توجہ دیتی ہیں آپ۔ ناخن نیل پالش سے خالی ہیں۔ آنکھوں میں کاجل نہیں ہے۔ ہاتھ، انگلیاں کان ہر طرح کی جیولری سے محروم ہیں اور رہی سہی کسر آپ نے حجاب لے کر پوری کر دی ہے۔ اپنی دلکشی کا آپ نے ستیاناس کر دیا ہے یہ دس گز کا تھان اپنے گرد لپیٹ کر، پتہ ہے لوگ آج کل برقعے والیوں اور نقاب والیوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟''

''ڈاکٹر صاحب! مجھے لوگوں کی رائے سے کچھ نہیں لینا دینا۔ مجھے اپنے جسم کو ڈھانپنا پسند ہے، اس لیے میں لوگوں کی پروا نہیں کرتی پھر یہ اللہ کا حکم بھی ہے۔'' اسے آج پہلی بار غصہ آیا تھا۔

''دیکھیں اللہ رحمان ہے۔ رحیم ہے محض آپ کو ایک چھوٹی سی بات پہ دوزخ میں نہیں ڈالے گا کہ آپ نے برقعہ کیوں نہیں لیا، نقاب کیوں نہیں پہنا۔ دیکھیں میں روشن خیال بھی ہوں اور مذہبی بھی ہوں مگر میں مذہبی جنونی نہیں ہوں۔ آپ نے اگر ہاف سلیوز پہنی ہیں۔ فٹنگ کی شرٹ پہنی ہے۔ ساڑھی پہنی ہے، ہائی ہیل پہنی ہے بال آپ کے لمبے ہیں تو وہ نظر آنے چاہئیں یہ نہیں کہ آپ چھپا کر رکھیں۔ انہیں ظاہر کریں۔''

''مجھے اپنی خوبصورتی کو ظاہر کرنے کا شوق نہیں ہے۔'' حوریہ جواباً غصے سے بولی جس کا احساس ڈاکٹر آفتاب کو بخوبی ہو رہا تھا۔

''ارے میں تو مذاق کر رہا تھا آپ سے۔ آپ تو برا مان گئی ہیں۔''

''چلیں کوئی بات نہیں ہے۔'' حوریہ نے اپنی طرف سے بات ختم کر دی۔

''میں نے وہ گھر تقریباً پسند کر لیا ہے آپ کے لیے۔ لیکن شادی کے فوراً بعد آپ کو اس گھر میں لے کر نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ کچھ دن آپ نے میری فیملی کے ساتھ گزارنے ہیں۔''

اس بات پر وہ خاموش رہی۔

''میں نے ہر چیز کا مالک آپ کو بنا دیا ہے اپنے گھر، ہاسپٹل، اپنے بینک بیلنس تک کا بھی۔ میرے پاس جو کچھ ہے سب آپ کا ہے۔ بیٹے اور دونوں بیٹیوں کو میں ان کے حصے دے چکا ہوں اب باقی سب آپ کا ہے۔''

''آپ کا بینک بیلنس کتنا ہے۔ امیر لوگو! کتنی...... جائیداد ہے؟'' ڈاکٹر آفتاب اسے چھیڑ رہے تھے۔ حوریہ ہڑبڑا کر ان کے لہجے کے سحر سے آزاد ہوئی۔

''بابا جان کی میں اکلوتی اولاد ہوں اور ان کا سب کچھ میرا ہے۔ لیکن کیا فائدہ۔ میرے والدین زندہ ہوتے تو میں حقیقی معنوں میں خوش ہوتی۔ میرے لیے زمین، دولت، جائیداد کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔'' یکایک وہ اداس ہو گئی تھی۔

''آپ کے لیے یہ دولت، جائیداد اہمیت نہیں رکھتی مگر میرے لیے تو رکھتی ہے ناں۔ میرا مطلب ہے میرے ہاسپٹل اور مشن کے لیے آپ بھی انسانی فلاح پہ خرچ کر دیں۔ آپ کے لیے یہ صدقۂ جاریہ ہوگا اور آپ کے والدین کی روح بھی خوش ہوگی۔''

''آپ کو ایک بات بتاؤں کچھ روز پہلے ایک بچی نے مجھ سے رابطہ کر کے رو رو کر مجھے اپنی دکھ بھری کہانی سنائی اور کہا کہ آپ مجھے سہارا دے دیں، شادی کر لیں مجھ سے اور میں

نے ایک بہت اچھے نوجوان سے اس کی شادی کروادی۔ کیونکہ میرے ذہن میں اس وقت آپ تھیں کہ اس بچی کو تو اور اچھے رشتے مل جائیں گے مگر آپ کو شاید نہ ملیں۔ آپ کو تحفظ اور سہارا دینے کی نیت سے میں نے کسی اور طرف ہاں نہیں کی حوریہ کے ایک دم سے آنسو نکل آئے۔

''ڈاکٹر صاحب ٹھیک سوچ کہ آپ نے مجھ جیسی کم مایہ حیثیت لڑکی کو اس قابل سمجھا۔ آپ تو آسمان ہیں۔ میں عام سی لڑکی ہوں،۔ عافیہ بھابی نے شروع سے ہی نامحسوس انداز میں مجھے میری حیثیت سے آگاہ کردیا تھا کہ میں کیا ہوں میں اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں، میری عمر اٹھائیس سال سے زیادہ ہے اور اس عمر میں ہمارے گاؤں کی لڑکیاں دو تین بچوں کی مائیں بن چکی ہوتی ہیں۔ میں ازلی بدنصیب ہوں۔ چھوٹی سی تو تھی جب امی فوت ہوئیں۔ اس کے بعد بابا جان بھی ساتھ چھوڑ گئے پھر پھوپھو کا سہارا بھی چھن گیا۔ میں اب بے گھر اور بے در ہوں۔'' اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ چکا تھا۔ ڈاکٹر آفتاب کا دھیما دھیما لہجہ اس کے زخموں کو سی رہا تھا۔

''آج کے بعد نہ تو آپ بے سہارا ہیں نہ بے در اور نہ بے گھر ہیں۔ ٹھیک ہے لڑکی کے ساتھ ٹریجڈی ہو جائے تو اسے پھر اچھا رشتہ نہیں ملتا۔ ہمارا معاشرہ ہی ایسا ہے وہ ساٹھ سال کے بوڑھے کی سولہ سال کی لڑکی سے شادی قبول کر لیتا ہے مگر ایک داغ لگی لڑکی کی کسی کنوارے لڑکے سے شادی ہضم نہیں کرتا اور نہ کنوارا رشتہ ملتا ہے۔''

''کیوں ڈاکٹر صاحب؟ میری عمر اتنی زیادہ تو نہیں ہے۔'' وہ پھٹ پڑی۔ ''حوریہ بی بی!'' ہمیں معاشرے کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ ''میرے گھر آ کر آپ کو کوئی دکھ نہیں ملے گا پھر بھی اس کے باوجود میں آپ کو فورس نہیں کرتا کہ آپ مجھ سے ہی شادی کریں۔ میں آپ کے لیے آپ کی عمر کے مطابق کسی اچھے نوجوان کا رشتہ ڈھونڈ سکتا ہوں۔ آپ کی اجازت ہو تو......؟''

''نہیں ڈاکٹر صاحب! جب تقدیر میں یہی لکھا ہے تو مجھے انکار نہیں ہے۔'' وہ اب پرسکون ہو چکی تھی۔

''مجھ پر اعتماد کرنے کا شکریہ۔ ویسے ایک بات بتاؤں آپ کو کہ ایسے رشتے چل نہیں پاتے۔ جو معاشرے کے اصول و قوانین کی نفی کی بنیاد پر استوار کئے جاتے ہیں۔ آپ نے درست فیصلہ کیا ہے بلکہ تقدیر کا فیصلہ بھی یہی ہے۔ جو آپ کے حق میں بہترین ثابت ہوگا۔''

کچھ دیر بعد انہوں نے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کر کے فون بند کر دیا۔

رات ابھی تنہائی کی پہلی دہلیز پہ ہے
اور میری جانب
اپنے ہاتھ بڑھاتی ہے
سوچ رہی ہوں
ان کو تھاموں
زینہ زینہ سناٹوں کے تہہ خانوں میں اتروں
یا اپنے کمرے میں ٹھہروں
چاند
مری کھڑکی پہ دستک دیتا ہے!

عافیہ اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ ان کی واپسی رات کو ہی ہونی تھی۔ حیدر بھائی ان کے ساتھ تھے اور حنان اپنے آفس میں تھا۔ حوریہ ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ جب ڈور بیل بجتی چلی گئی۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ حوریہ اندر سے نکلی کہ اس وقت کون آ گیا۔ ڈاکٹر آفتاب کو دیکھ کر اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ کیونکہ اس جمعہ کو نکاح تھا اور وہ ہرگز نہیں توقع کر رہی تھی ان کی آمد کی۔ حوریہ نے ڈرائنگ روم میں لا بٹھایا۔ اس دوران وہ بھرپور نظروں سے اس کا جائزہ لے چکے تھے۔ آج حوریہ نے ان کی آمد پہ اپنا منہ نہیں چھپایا تھا لیکن دوپٹہ پہلے کی طرح اس نے اچھی طرح سر اور باقی جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔

ادھر ادھر کی باتوں کے دوران ڈاکٹر آفتاب کا انداز اچانک بدل گیا۔

''میں چاہتا ہوں کہ شادی کے بعد آپ اس پردے وردے سے جان چھڑا لیں یا اس طرح کریں کہ صرف اسکارف سر پہ لیں۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ میرے انتخاب کو دیکھیں۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب دیکھوں گی۔'' حوریہ نے بحث نہیں کی۔

''ایک اور بات کہ میں اپنا فرقہ بدل لیا ہے اور اسی فرقے کی وجہ میں نے بہت سے روحانی مدارج طے کئے ہیں۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو پتہ ہے اور میں نے آپ کو بتائی ہے آپ کو اعتراض تو نہیں ہے؟'' وہ چپ سی ہوگئی۔

حیدر اور عافیہ سر پکڑے بیٹھے تھے۔ نکاح میں صرف کل کا دن باقی تھا اور ڈاکٹر آفتاب نے اپنی مجبوری بتا کر پیسوں کی ڈیمانڈ کی تھی۔ انہوں نے حیدر کو فون کیا تھا کہ میں نے کسی کا بہت ضروری ادھار دینا ہے۔ مجھے تین کروڑ فوری ادھار چاہئیں یا آپ مجھ سے آدھا ہاسپٹل خرید لیں، میں اس وقت بہت مشکل میں ہوں۔"

انہوں نے حیدر کو بہت تاکید کی تھی کہ یہ بات میرے اور آپ کے درمیان رہنی چاہیے۔ آپ نے اپنی بیگم کو بھی نہیں بتانی۔ میری برسوں کی عزت اور بنی بنائی ساکھ کا سوال ہے میں یہ پیسے بہت جلد لوٹا دوں گا۔"

لیکن حیدر سے رہا نہیں گیا اس نے یہ بات عافیہ کو بتا دی اور وہ بہت پریشان تھی۔

"اب سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کیا جائے، اتنے پیسوں کا انتظام فوری طور پر کہاں سے کیا جائے۔" حیدر اضطراری انداز میں ٹہل رہا تھا۔

"صاف بات کہہ دیں کہ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔" ہم کہاں سے دیں۔ آپ بات تو کریں ان سے۔" عافیہ کا مشورہ اس کے دل کو لگا۔

حیدر اسی وقت ڈاکٹر آفتاب کی طرف چلا گیا اور عافیہ کے الفاظ من و عن دہرا دیے۔ جس کے بعد ان کا رویہ بہت غیر متوقع تھا۔

"میری مجبوری بہت شدید ہے، خیر اس طرح کرتے ہیں کہ شادی تھوڑی لیٹ کر دیتے ہیں۔ سال چھ ماہ میں جیسے ہی میرے حالات ٹھیک ہوتے ہیں، میں آپ کو بتا دوں گا۔ میں سفید پوش آدمی ہوں اور اس وقت بالکل خالی ہاتھ ہوں، فی الحال میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

ڈاکٹر آفتاب کا شاندار گھر اور مہنگی مہنگی پورچ میں کھڑی گاڑیاں حیدر کے تصور میں زندہ ہو گئیں۔

اب مزید بات کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ چپ چاپ واپس چلا آیا۔ عافیہ نے خوب شور مچایا۔ پرسوں نکاح ہے سب کو پتہ ہے اب ہم کیسے لیٹ کریں؟" اس کی پریشانی بجا تھی۔

حوریہ کے سامنے ہی تو سب ہو رہا تھا۔ وہ کیسے لاتعلق رہ سکتی تھی۔

وہ خود بھی پریشان تھی اسے رات کا انتظار تھا کیونکہ ڈاکٹر آفتاب اس وقت فارغ ہوتے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب! میں یہ کیا سن رہی ہوں؟" اس نے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے

بجائے صاف بات کی۔

"آپ نے کیا سنا ہے بھلا۔" انہوں نے جان بن کر سوال کیا۔

"آپ شادی لیٹ کر رہے ہیں۔ میرے سب رشتہ داروں کو پتہ ہے۔ ہماری عزت کا سوال ہے یہ۔ پہلے آپ نے خود ہی دس دن کے اندر شادی کرنے کا کہا، اب تو آپ یہ بات کر رہے ہیں۔" وہ اچھی خاصی غصے میں تھی۔

"دیکھیں حوریہ بی بی! میں بہت پریشانی میں ہوں، میرے پاس ایک ٹکا تک نہیں ہے۔ میرا بیٹا ڈاکٹر انجم امریکہ جانا چاہ رہا ہے۔ صرف میری وجہ سے رکا ہوا ہے۔ اس ہاسپٹل میں اس نے بھی انوسٹمنٹ کر رکھی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا حصہ دے کر باقی ہاسپٹل آپ کے نام کر دوں، کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میرا بیٹا یہ خیال کرے کہ میں نے شادی کر کے نئی دنیا بسا لی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ فی الحال شادی کے سلسلے کو آگے بڑھا دیا جائے۔"

"آپ کو کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟"

"فی الحال تین کروڑ روپے سے کام چل جائے گا۔ یہ مل جائیں تو میں آپ کو عزت سے اپنے گھر لے آؤں گا۔ میری پریشانی ختم ہو جائے گی اور آپ کو آپ کا مقام مل جائے گا۔" ڈاکٹر آفتاب کے لہجے میں ایک دم سے زندگی دوبارہ رواں ہو گئی تھی۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! میں آپ سے بعد میں بات کرتی ہوں۔" حوریہ نے انہیں تسلی دے کر فون بند کر دیا۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے اسی وقت مائیکہ کا نمبر ملایا۔ چوتھی بیل پر ہی اس نے ریسیو کر لیا۔

ساری تفصیلات سننے کے بعد وہ خاموش سی ہو گئی۔ بولی بھی تو بہت دیر کے بعد۔

"حوریہ! مجھے تو ڈاکٹر آفتاب ٹھیک آدمی نہیں لگتے، ہو سکتا ہے، یہ میرا وہم ہو مگر پھر بھی تم سوچ کر فیصلہ کرو۔ یہ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ اور سچ پوچھو تو میں اس رشتے کے حق میں نہیں ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ تم سے شادی نہیں کریں گے ورنہ پیسوں کا مطالبہ شادی کے بعد تم سے کرتے اس وقت تم انکار نہ کر سکتیں، پہلے مطالبہ کرنے کا مقصد ہی یہی ہے کہ وہ صرف پیسہ چاہتے ہیں۔ تمہیں انہیں یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ تمہارے نام دولت و جائیداد ہے۔"

"یہ میں نے نہیں بتایا۔ پھوپھو نے جب انہیں میرے بارے میں بتایا تو ان کے منہ سے نکل گیا تھا کہ میں اپنے والد کی جائیداد کی اکلوتی وارث ہوں۔"

''چلو تم ایک کام کرو۔ تمہیں ڈاکٹر آفتاب کی نیت کا پتہ چل جائے گا۔'' ملائیکہ اسے آئندہ کا لائحہ عمل بتاتی چلی گئی۔

فجر کی نماز کے بعد اس نے بہت دیر تک دعا میں اللہ سے روشنی اور امید مانگی۔ جب وہ مصلیٰ تہہ کر کے اٹھی تو بہت حد تک پر سکون تھی۔ رات والی پریشانی بھی کم تھی۔

نو بجے کے قریب اس نے عاقبہ سے اپنی ایک سہیلی کے گھر جانے کی اجازت مانگی جو قریب ہی دوسرے بلاک میں رہتی تھی۔

انہوں نے بھلا کیا کہنا تھا۔ سو حوریہ گھر سے نکل کر سیدھی ڈاکٹر آفتاب کے ہاسپٹل جا پہنچی۔ ڈاکٹر آفتاب کی خوبرو سیکریٹری نے حسب معمول کٹیلی نظروں سے اسے دیکھا اور اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

چہرے پہ معنی خیز مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر آفتاب کے ساتھ ان کا بیٹا بھی موجود تھا۔ دونوں اسے اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہوئے۔

''ڈاکٹر صاحب! میں آپ کو تین کروڑ دے دوں گی مگر بینک سے اتنا اماؤنٹ مجھے اتنی جلدی نہیں ملے گا آپ کو کچھ دن انتظار کرنا ہوگا۔''

''اوہ بسم اللہ۔ آپ بیٹھیں تو سہی، یہ میرا بیٹا ہے۔ آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا اسے۔ ابھی آپ کی باتیں ہی ہو رہی تھیں۔ یہ کہہ رہا تھا کہ ہاسپٹل مکمل طور پر آپ کے سپرد کر دیا جائے۔ پھر آپ جانیں آپ کا کام......''

ڈاکٹر آفتاب کا انداز ہمیشہ کی طرح دلکش تھا۔ مگر وہ بیٹھی نہیں اور ان ہی قدموں گھر واپس لوٹ آئی۔ ملائیکہ کی ہدایات پہ اس نے عمل کر لیا تھا۔

گھر آ کر اس نے ڈاکٹر آفتاب کا نمبر ملایا جو بزی مل رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد خود ہی ان کی کال آئی۔

''ڈاکٹر صاحب! میں جو آپ کو پیسے دوں گی، اس کا ذکر میرے گھر کے کسی فرد کے سامنے نہیں کرنا ہے۔''

''نہیں کروں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی عزت میری عزت ہے، جس پہ کسی صورت میں حرف نہیں آنے دوں گا۔'' ان کا لہجہ شہد آگیں تھا۔

''اگر اس لین دین کا حیدر بھائی یا کسی اور کو پتہ چل گیا تو ہماری شادی نہیں ہو سکے گی۔''

''آپ بالغ ہیں عاقل ہیں اپنی مرضی کا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہیں کوئی آپ پہ پابندی نہیں لگا سکتا۔ ایسا کچھ ہوا تو آپ میرے پاس آ جانا۔ ہم کورٹ میں شادی کر لیں گے۔ آپ بغاوت کریں اس معاشرے کے فرسودہ قوانین کے خلاف۔'' ڈاکٹر آفتاب پورے جوش میں آ چکے تھے۔ دوسری طرف حوریہ کے لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

''میں اگر پیسے لے کر آپ کے پاس آ جاؤں تو آپ مجھے کہاں رکھیں گے؟''

''ارے دنیا بہت بڑی ہے حوریہ جی! کہیں بھی اپنی دنیا بسا لیں گے۔ یا پھر آپ شروع کے کچھ ماہ ہاسپٹل کے وی آئی پی رومز میں گزار لینا۔ اس کے بعد میں آپ کو گھر لے جاؤں گا۔''

''مطلب آپ مجھے فوری طور پر گھر لے کر نہیں جائیں گے۔''

''نہیں۔ یک دم سے نہیں کیونکہ کچھ قباحتیں ہیں پھر کبھی بتاؤں گا آپ کو۔'' وہ بڑی صفائی سے ٹال کر اپنے مطلب کی طرف آ گئے۔

''حوریہ! آپ کی گاؤں والی جو حویلی ہے۔ اس کی کیا مالیت ہو گی اس وقت؟''

''مجھے نہیں پتہ وہ تو بند پڑی ہوئی ہے۔ حیدر بھائی یا حنان ہی جانتے ہیں خیر خبر کو۔''

''اچھا آپ اس حویلی کو بھی فلاحی کاموں کے لیے وقف کر دیں کیونکہ میں نے شروع میں بھی آپ سے کہا تھا کہ انسانی بھلائی کے کاموں میں تن من دھن سب کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب! آپ کچھ کہیں اور میں نا کروں یہ ہو نہیں سکتا کیونکہ آپ واقعی مجھے اچھے لگنے لگے ہیں۔ میرا سب کچھ آپ کا ہے۔ اتنی دولت جائیداد میرے کس کام کی؟''

''ارے ارے۔ ایسا نہ کہیں، ہمارا سب کچھ آپ کا ہے۔ میں شام کو آؤں گا۔ آپ کی فیملی سے ملوں گا اور بتاؤں گا کہ نکاح جمعے کو ہی ہوگا۔''

ڈاکٹر آفتاب سے اپنی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا مارے خوشی کے وہ ناچ اٹھیں گے۔

حوریہ نے جب فون بند کیا تو اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیر رہے تھے۔ اسے جو کچھ جاننا تھا جان چکی تھی اور تلخ حقیقتوں کی سفاکیوں نے اسے آبدیدہ کر دیا تھا۔

ڈاکٹر آفتاب، اپنے بھائی، بیٹے اور دونوں بیٹیوں سمیت ان کے ڈرائنگ روم میں

بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ پیسوں کا انتظام ہو گیا ہے اور شادی جمعہ کو ہی ہو گی۔ اس وجہ سے حیدر اور عافیہ کے دل میں جو بال آیا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ مٹھائی، کیک، کباب، رول، سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔

''ہم پھر کل کس وقت آئیں اپنی امانت لینے؟''

ڈاکٹر آفتاب کے بھائی نے براہ راست حیدر سے پوچھا۔ اس وقت تک حوریہ ڈرائنگ روم میں پہنچ چکی تھی۔

سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ جو بڑی سرد اور اجنبی نگاہوں سے آنے والوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں شرم وحیاء کا شائبہ تک نہ تھا۔

''آپ کو کل آنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مجھے اس شادی سے انکار ہے۔''

اپنی بات مکمل کر کے، سب کے حواسوں پہ بم گرا کر وہ رکی نہیں جس طرح آئی تھی اسی طرح ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

عافیہ بھابی اور حیدر بھائی دونوں اسے دیکھ رہے تھے۔ عافیہ کی تو دلی مراد پوری ہو رہی تھی۔ دل سے وہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ حوریہ کی شادی ڈاکٹر آفتاب سے ہو۔

جب سے اسے حوریہ کی مالی حیثیت کا علم ہوا تھا اس کے خیالات میں راتوں رات تبدیلی آئی تھی۔

آج حوریہ کے انکار کی سب سے زیادہ خوشی اسے ہی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں اپنے بھائی راشد کا نام تھا۔ جو حوریہ سے عمر میں سترہ اٹھارہ سال بڑا تھا۔

شراب اور جوئے کی لت کی وجہ سے کبھی کوئی کام ٹک کر اس نے کیا ہی نہیں تھا دس دن یہاں تو دس دن وہاں۔ وہ مستقل نوکری کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ان ہی حرکتوں کی وجہ سے ابھی تک اس کا رشتہ نہیں ہوا تھا۔

عافیہ اس بھائی کی وجہ سے بہت پریشان رہتی تھی۔ وہ دل سے چاہ رہی تھی کہ حوریہ کے ساتھ راشد کی شادی ہو جائے۔ کیونکہ ایسی صورت میں راشد کی زندگی بن جاتی تھی۔ حوریہ کا سب کچھ راشد کا ہو جاتا تو وارے نیارے ہو جاتے۔

حوریہ کی سادہ لوحی کے پیش نظر اسے مکمل امید تھی کہ وہ مان جائے گی۔ کیونکہ اوّل روز

سے ہی اسے اس گھر میں حوریہ کا وجود نا قابل برداشت لگتا تھا۔ حوریہ کی اچھی بھلی متوازن شخصیت کو مسخ کر کے اس نے احساس کمتری کے بوجھ تلے دبا ڈالا تھا۔ اس کی عمر اور شکل کو اس نے خاص طور پر ٹارگٹ بنایا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر آفتاب کے رشتے کو ناپسند کرنے کے باوجود وہ راضی ہونے پہ مجبور ہوئی تھی۔

حیدر تو باہر نکل گئے تھے عافیہ وہیں تھی۔

''اس اتوار کو نتاشا اور حنان کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو رہی ہے میں چاہ رہی ہوں کہ تمہارے اور نتاشا کے فرض سے اکٹھے ہی عہدہ برآ ہو جاؤں۔ میری کب سے آرزو تھی تمہیں بھابی بنانے کی جو قسمت سے اب پوری ہونے جا رہی ہے۔'' عافیہ کے الفاظ لہجہ انداز سب کچھ ہی بدلا ہوا تھا۔

''بھابی! میں سوچ کر جواب دوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے رخ موڑ لیا جیسے اب کوئی اور بات کرنا ہی نہ چاہتی ہو۔

''ضرور سوچو لیکن جواب ہاں میں ہونا چاہیے۔'' عافیہ بھابی کا انداز بہت شرارتی تھا۔

حوریہ کے اندر آج ایک اور بت ٹوٹا تھا۔

عجیب لوگ ہیں
ہم اہل اعتبار کتنے بدنصیب لوگ ہیں
جو رات جاگنے کی تھی
وہ ساری رات خواب دیکھ دیکھ کر گزارتے رہے
جو نام بھولنے کا تھا، اس ایک نام کو گلی گلی پکارتے رہے
جو کھیل جیتنے کا تھا، وہ کھیل ہارتے رہے
عجیب لوگ ہیں
ہم اہل اعتبار کتنے بدنصیب لوگ ہیں
کسی سے بھی فرض آبرو ادا نہ ہو سکا
لہولہان ساعتوں کا فیصلہ نہ ہو سکا
برس گزر گئے کوئی معجزہ نہ ہو سکا
وہ جل بجھا کہ آگ جس کی شعلہ نفس میں تھی

وہ تیر کھا گیا گمان جس کی دسترس میں تھی

سیاہ مہر کو فصیل شب کا انتظار ہے

کب آئے گا وہ شخص جس کا سب کو انتظار ہے

ہم اہل انتظار کتنے بدنصیب لوگ ہیں

عجیب لوگ ہیں

ہم اہل اعتبار کتنے بدنصیب لوگ ہیں

نتاشا اور حنان کی شادی کی ڈیٹ اتوار کو فکس ہو رہی تھی۔ پندرہ دن کے بعد شادی تھی۔ عافیہ کی تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں۔ پورے خاندان میں یہ خبر گردش کر رہی تھی کہ حوریہ، راشد سے شادی کے لیے مان گئی ہے اس خبر کو پھیلانے میں زیادہ ہاتھ عافیہ کا تھا۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ حوریہ نا کر ہی نہیں سکتی۔

وہ آج بھی صبح سے شاپنگ کے لیے نکلی ہوئی تھی۔ اس نے حوریہ سے بھی کہا کہ تم بھی چلو اپنی شاپنگ کر لو مگر وہ نہ مانی۔

وہ ملائیکہ کا نمبر ملا رہی تھی جب حنان اپنے دوست شیر افگن کو لیے گھر داخل ہوا۔ حنان کو شام میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں شیر افگن کے ساتھ اسلام آباد کے لیے نکلنا تھا۔ ان کا پروگرام تھا کہ کھانا کھا کر جائیں گے بعد میں چائے پی لیں گے۔

حنان اسے کھانا بنانے کا کہنے آیا تو وہ ملائیکہ سے ہی بات کر رہی تھی۔ اسے ہولڈ کروا کر اس نے حنان کی بات سنی۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔ حوریہ نے ملائیکہ سے لمبی چوڑی بات نہیں کی اور اسے اللہ حافظ کہہ دیا۔

پہلے اس نے کولڈ ڈرنکس حنان کے ہاتھ اندر بھجوائی۔ پھر کھانا بنانے میں لگ گئی۔ کباب اور یخنی فریزر میں پڑی تھی سو چاول بنانے اور کباب فرائی کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ساتھ اس نے مسالے دار چکن بنالیا۔

کھانا اختتامی مراحل میں تھا جب کمرے میں رکھا اس کا سیل زور وشور سے گنگنانے لگا۔ اس نے پہلی بار نظر انداز کر دیا۔ دوسری بار پھر کال آنے لگی وہ تب بھی سلاد کاٹنے میں لگی رہی۔ تیسری بار لینڈ لائن نمبر بجنے لگا۔ حنان پتہ نہیں کہاں تھا۔ فون ریسیو ہی نہیں کر رہا تھا۔

دوبارہ اس کا سیل بجنے لگا تو ناچار وہ کمرے کی طرف دوڑی۔ جانے کس کو اتنی جلدی تھی۔

موبائل سکرین پہ ڈاکٹر آفتاب کالنگ کے الفاظ چمک رہے تھے۔ یک دم ہی اس کے ہاتھ ست سے پڑ گئے۔ بمشکل تمام اس نے فون آن کر کے کان سے لگایا۔

''حوریہ امین! خود کو اوور سمارٹ سمجھی ہو تم نے میرے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ تمہیں پتہ نہیں کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔

میں تمہیں ٹائم دے رہا ہوں، اس کے بعد بھی اگر تم نے ناں کی تو تمہارے ساتھ جو ہوگا، تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ ڈاکٹر آفتاب بہت کمینی شے کا نام ہے۔ میں تمہیں اپنی بیوی کا نمبر دے رہا ہوں، وہ تمہیں سب کچھ بتائے گی۔ میرا ساتھ دو گی تو فائدے میں رہو گی ورنہ عزت سے بھی جاؤ گی اور جان سے بھی۔''

ڈاکٹر آفتاب کا لہجہ برف کی طرح سرد تھا۔

اس کا پورا جسم ایک دم بے جان سا ہو گیا۔ گویا ملائیکہ نے جس خوف کا اظہار کیا تھا، وہ سچ ہو گیا تھا۔

پہلے تو اس کا دل چاہا پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اتنا روئے کہ اس کا وجود بھی پانی بن کر بہہ جائے۔ اسی اضطرابی کیفیت میں وہ ڈرائنگ روم میں حنان کو بلانے کے ارادے سے گئی اس وقت شدت سے کسی ہمدرد کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اپنی ناگفتہ بہ حالت کا اسے مطلق احساس نہیں تھا۔

دروازہ کھول کر وہ بے دھڑک اندر داخل ہوئی۔ صوفے پہ بیٹھا میگزین دیکھتا شیر افگن گھبرا سا گیا۔ حوریہ کی حالت ہی ایسی تھی۔ پریشان اور متوحش چہرہ، زرد رنگت، کانپتے ہاتھ پاؤں، ڈھلکا آنچل۔ حالانکہ آج سے اس وقت سے پہلے وہ جب بھی اس کے سامنے آئی تھی باحجاب آئی تھی۔ آج وہ اسے بے حجاب نظر آئی تھی۔ حنان اپنے کمرے میں تھا۔ شاور لے کر اس کا ارادہ چینج کرنے کا تھا۔ وہ افگن کو انتظار میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اسے گئے ہوئے تین منٹ بھی نہیں گزرے تھے۔

شیر افگن صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا بات ہے آپ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہیں؟''

''حنان بھائی کہاں ہیں؟'' حوریہ کو اپنے لرزتے ہاتھ پاؤں اور گھبراہٹ پہ کم از کم

اس وقت اختیار نہیں تھا۔

"وہ اپنے کمرے میں گیا ہے شاور لے کر چینج کرنے۔" شیر افگن کی نگاہوں میں ابھی تک سوال برقرار تھا۔ حوریہ کو فیصلہ کرنے میں فقط چند سیکنڈ لگے تھے۔

"پلیز میری مدد کریں ورنہ میں بالکل تباہ ہو جاؤں گی، کسی کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ پلیز میری مدد کریں پلیز۔ آپ کو اللہ کا واسطہ۔ انسانیت کے واسطے میری مدد کریں پلیز......مجھ سے شادی کر لیں۔"

اس وقت حوریہ اپنی نسوانی انا کو فراموش کر چکی تھی۔ "کریں گے ناں میری مدد۔ کریں گے ناں شادی......؟" اس کی آنسوؤں سے لبالب بھری آنکھیں، لرزتا کانپتا وجود اور اللہ کا نام، انسانیت کا واسطہ شیر افگن کو بے اختیار سر ہلانے پر مجبور کر گئے۔

"میں انتظار کروں گی آپ کے آنے کا؟" اس نے الٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے اپنے آنسو پونچھے اور پھر تقریباً بھاگتی ہوئی وہاں سے نکلی۔

"میں انتظار کروں گی آپ کے آنے کا۔" اس کے وہاں سے جانے کے بعد بھی شیر افگن کو اس کی آواز اپنے کانوں میں سرگوشیاں کرتی محسوس ہو رہی تھی۔

❁

حوریہ کو بہت تیز بخار تھا۔

حیدر شام کو اسے ڈاکٹر نعیم کے پاس لے گیا۔ اس وقت اس کا بی پی خطرناک حد تک لو تھا۔ بار بار اس پہ غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ عافیہ پریشان تھی کہ اچانک بیٹھے بٹھائے اس کی طبیعت کو کیا ہو گیا ہے۔ اتوار کو ناشتا اور حنان کی شادی ڈیٹ فکس ہو رہی تھی ادھر یہ بیمار ہو گئی تھی۔ اس نے ابھی تک راشد کے سلسلے میں ہاں یا ناں میں کوئی جواب نہیں دیا تھا مگر عافیہ کا ارادہ تھا کہ اتوار کے دن ہی کوئی ہلکی پھلکی سی رسم کر کے حوریہ کو انگوٹھی پہنا دی جائے۔ مگر اس کی خراب طبیعت کے پیش نظر اسے اپنا پروگرام کھٹائی میں پڑتا نظر آ رہا تھا۔

اور ہوا بھی یہی۔ شادی کی ڈیٹ فکس بھی ہو گئی مگر حوریہ کی طبیعت بجائے سنبھلنے کے بگڑتی گئی۔

❁

شیر افگن ملک اپنے دادا ملک شجاعت احمد کے ساتھ ان کے گھر آیا تھا۔ اس کے دادا

نے بڑے سبھاؤ اور سلیقے کے ساتھ حوریہ کا رشتہ طلب کیا تھا۔ حنان مارے خوشی کے شیر افگن کے ساتھ لپٹ گیا۔ اپنا یہ دوست اسے بہت عزیز تھا۔

ملک شجاعت حیدر سے کہہ رہے تھے کہ "ہمیں شادی جلدی کرنی ہے بلکہ شیر افگن نے تو حنان سے صاف کہہ دیا تھا کہ تمہاری بارات کے دوسرے دن میں اپنی بارات لاؤں گا۔"

حیدر اپنی گاڑی میں اسی وقت مٹھائی لینے نکلا اور حنان نے یہ خوش خبری عافیہ بھابی کو سنائی۔ یہ سن کر شیر افگن کا رشتہ آیا ہے حوریہ کے لیے۔ عافیہ بھابی کا چہرہ جس طرح اترا تھا۔ وہ حنان سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ انہوں نے اپنے غصے کو مسکراہٹ کی آڑ میں چھپایا ہے۔

حنان کو اپنی خوشی پہ قابو نہیں تھا۔ ملک شجاعت نے حوریہ کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ حنان اس کے کمرے میں آیا۔ وہ نڈھال سے انداز میں بستر پہ دراز تھی۔ زرد رنگت، اترا چہرہ۔ چند دن میں ہی اس کا یہ حال ہو گیا تھا۔

"حوریہ! میرے دوست شیر افگن کے دادا جان آئے ہیں۔ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ادھر ہی لے آؤں کہ ڈرائنگ روم میں آؤ گی؟" حنان نے اپنی شریر مسکراہٹ کو سنجیدگی کی آڑ میں چھپا لیا تھا۔

حوریہ ہڑبڑا سی گئی۔

"حنان کے دوست کے سامنے شدت جذبات میں کی گئی بے وقوفی کو وہ اپنے تئیں بھول گئی تھی اور بارہا اس پہ دل کھول کر شرمندہ بھی ہوئی تھی کہ اس نے کیسی حماقت کر دی ہے۔ حنان کا دوست کیا سوچتا ہو گا۔

"بھابی! کچن میں ہیں، چائے لائیں تو تم بھی جلدی سے ان کے ساتھ آؤ۔ تمہیں دیکھنے آئے ہیں۔" حنان باہر جا چکا تھا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ہو چکا ہے۔

عافیہ کے پیچھے پیچھے وہ ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔ ملک شجاعت نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اسے نہ جانے کیوں رونا آ گیا۔ روئی روئی آنکھیں، زرد رنگت جھکی نگاہیں اور کمزور سی آواز۔ صاف ظاہر کر رہی تھی کہ یہ لڑکی کسی پریشانی اور خوف کا شکار ہے۔ ملک شجاعت کی نگاہوں میں حوریہ کے لیے پسندیدگی تھی۔

حیدر انہیں حوریہ کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگے۔

مما اور پپا کو کنونس کرنے کا مشکل مرحلہ شجاعت ملک کے ذریعے ہی طے ہوا تھا۔ وہ

وضع دار انسان تھے۔ حیدر بہت خوش تھا۔ رہا حنان تو اس کی شیر افگن سے دوستی رشتہ داری میں بدل رہی تھی، اس کے لیے یہ مقام شکر تھا۔

ملک شجاعت بہت جلدی شادی کرنا چاہ رہے تھے۔ کیونکہ شیر افگن کی جلدی جلدی کی رٹ نے انہیں بوکھلا دیا تھا۔ وہ تو ہتھیلی پہ سرسوں جمانے کی فکر میں تھا۔ ان کے سامنے اس نے بھی کہا تھا کہ اسے حوریہ سے شدید محبت ہے جو پل دو پل کی نہیں ہے بلکہ برسوں پر محیط ہے۔ اس کی بھابی زبردستی اس کی شادی اپنے بھائی سے کرنا چاہتی ہے جو کہ اسے گوارا نہیں ہے۔

حوریہ کو دیکھ کر، اس سے مل کر ان کے دل سے سب ملال رخصت ہو گیا تھا۔

حیدر نے ہاں کر دی تھی۔ حنان کی وجہ سے عافیہ کو بھی اپنی ناپسندیدگی ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

طوعاً وکرہاً حیدر اور حنان کی خوشی میں وہ خوش تھی۔ آج حنان کے دل پہ بھی رکھا بوجھ سرک گیا تھا۔ حوریہ اور ڈاکٹر آفتاب کے رشتے کے بعد وہ خود کو مجرم تصور کرتا تھا۔

ملک شجاعت بھی بوکھلائے ہوئے تھے۔ مگر صد شکر کہ یاسمین اور عبداللہ ملک آ رہے تھے۔ انہیں چار دن بعد کی سیٹ ملی تھی۔

ملک شجاعت نے انہیں سمجھا بجھا لیا تھا۔ پہلا بیٹا تھا۔ ان کے آنگن میں کھلنے والا پہلا پھول، اس کے بارے میں یاسمین نے بڑے خواب دیکھے ہوئے تھے۔ خیر ان دونوں میاں بیوی نے اس بات کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا اور معاملات خوش اسلوبی سے طے کر لیے۔

حیدر نے عافیہ کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ حوریہ کی گزشتہ زندگی کی ٹریجڈی کو فی الوقت شیر افگن کی فیملی کے سامنے شیئر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اپنے طور پہ اس نے اکیلے میں یہ بات صاف صاف شیر افگن کو بتا دی تھی کہ کل کو اس بات سے اسے اعتراض نہ ہو۔

اس نے سن کر کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ہاں اس نے یہ ضرور کہا تھا کہ ”فی الحال میری فیملی کے سامنے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں خود ہینڈل کر لوں گا۔“

یاسمین اور عبداللہ ملک پاکستان پہنچ چکے تھے۔

ادھر حوریہ بہت پریشان تھی۔ ڈاکٹر آفتاب کی کال ریسیو کرنا اس نے چھوڑ دی تھی وہ دھمکی آمیز مسیج بھیجنے لگے تو اس نے گھبرا کر موبائل آف کر دیا۔

یاسمین اور عبداللہ ملک دونوں جا کر حوریہ سے مل آئے تھے۔ بیٹے کو پسند کو انہوں نے دل و جان سے قبول کر لیا تھا۔

حنان کے ولیمہ کے ٹھیک بارہویں دن شیر افگن اور حوریہ کا نکاح تھا۔

دل و نگاہ پہ کس طور کے عذاب اترے
وہ ماہتاب ہی اترا نہ اس کے خواب اترے
کہاں وہ رُت کی جبینوں پہ آفتاب اترے
زمانہ بیت گیا ان کے آب و تاب اترے
اداس شب میں، کڑی دوپہر کے لمحوں میں
کوئی چراغ کوئی صورت گلاب اترے
کبھی تو ترے لہجے کی شبنمی ٹھنڈک
سماعتوں کے دریچوں پہ خواب خواب اترے

شادی سے صرف دو دن پہلے شیر افگن کے دونوں چھوٹے بھائی بھی پاکستان آ گئے تھے۔ بھائی کی شادی کی بہت خوشی تھی انہیں۔ ان کی طرف تو بہت ہنگامہ اور رونق تھی لیکن حوریہ نے حیدر بھائی اور عافیہ سے کہہ دیا تھا کہ شادی میں زیادہ لوگوں کو نہ بلایا جائے اور نہ ہی رسموں کے نام پر ہلا گلا کیا جائے۔ عافیہ نے تو شکر کا سانس لیا تھا کہ اخراجات میں کمی جو ہو رہی تھی۔

مگر حیدر اور حنان جز بز ہو رہے تھے کہ شیر افگن کی فیملی کیا سوچے گی۔ حوریہ نے اپنے فیصلے پہ نظر ثانی کرنے سے انکار کر دیا۔ اتنی ضدی وہ پہلے کبھی نہیں تھی۔ اصل بات سے آگاہ کر کے وہ انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اسے ڈاکٹر آفتاب کی مجرمانہ ذہنیت کا خوب اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی اس کی وجہ سے حنان یا حیدر بھائی کو ذرا بھی نقصان پہنچے۔

حوریہ کو اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ ملائکہ سچ مچ اس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھی۔ یقین آتے ہی وہ بھاگ کر اس سے لپٹی تھی۔

”تم بات نہ کرو مجھ سے۔ اتنی اہم بات بتانی تم نے گوارا نہیں کی۔ وہ تو بھلا ہو حنان بھائی کا جنہوں نے مجھے بتایا تمہاری شادی کا۔ تمہارا سیل نمبر اتنے دنوں سے آف ہے میں نے لینڈ لائن نمبر ٹرائی کیا تو حنان بھائی سے بات ہوئی۔ انہوں نے ہی سب کچھ بتایا مجھے اور میں نے اتنی مشکل

سے سیٹ ریزرو کروائی۔" ملائکہ کے گلے شکوے جاری تھے۔ حوریہ شرمندگی سے مسکرا رہی تھی۔

ملائکہ کی آمد نے اسے حقیقی معنوں میں خوشی بخشی تھی۔

وہ ابھی نتاشا کے ساتھ پارلر سے مہندی لگوا کر آئی تھی۔

نتاشا کی شادی کو چند روز ہی ہوئے تھے وہ سر سے پاؤں تک بجی سنوری بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ضد کر کے اس نے حوریہ کے پورے کے پورے بازوؤں اور پاؤں پر ٹخنوں سے اوپر تک مہندی لگوائی تھی۔ وہ حنان کے ساتھ بہت خوش تھی۔ عافیہ کے برعکس وہ من موجی اور شوخ مزاج تھی۔ عافیہ کی طرح اس نے حوریہ اور شیر افگن کی شادی کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا تھا۔

شادی سے ایک ہفتہ پہلے ہی اس نے حوریہ کو بیوٹی سیلون لے جانا شروع کر دیا تھا۔ حوریہ کے بال کمر سے نیچے تک جاتے تھے مگر ایک شیپ میں نہیں تھے۔ نیچے سے اس کے بالوں کی تھوڑی سی کٹنگ کروا کر اس نے حوریہ کے لمبے گھنے براؤن بالوں کو خوب صورت شیپ دلوا دی تھی۔

حوریہ نے خود پہ آج سے پہلے تک توجہ نہیں دی تھی مگر اب نتاشا اسے لیکچر دیتی تھی۔

رات ملائکہ اور وہ جاگتی رہیں۔ کتنے عرصے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ باتیں ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ رات کا آخری پہر تھا جب آسمان پہ بادلوں کی قطاریں جمع ہونا شروع ہوئیں۔

"ملائکہ! تمہیں پتہ ہے مجھے رنگوں سے کتنی دلچسپی تھی میٹرک کے بعد میں کتنے شوخ شوخ رنگوں کے کپڑے سلواتی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ رنگوں کو اپنی مٹھی میں بند کر لوں۔ نیلے، پیلے، سرخ، اودے، گلابی، بیلے، کاسنی، گولڈن، سبز میں قوس قزح کے سب رنگ چرا لوں اور رنگوں کی بارش میں نہاؤں۔ مگر! میرے شوق کی عمر بہت کم تھی۔ بہت ہی کم۔"

اس کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ ملائکہ نے اس کا سر شانے سے لگا لیا مگر اس کے رونے کی رفتار میں کمی نہیں آئی۔

عمر کا جس روز گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا میں نے اس روز سرخ جارجٹ کا سوٹ پہنا تھا بقول اماں فاطمہ کے میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔

پھر اسی دن سب رنگ مجھ سے چھن گئے۔ مجھ میں شاید شعور نہیں تھا تب ہی تو اس کے بعد عید پہ مہندی لگانے لگی تو عورتوں نے مجھے ٹوک دیا۔ پھر پھوپھو مجھے یہاں لے آئیں اپنے ساتھ۔ عافیہ بھابی بات بات پہ مجھے ٹوک دیتی تھیں کہ یہ کپڑے نہ پہنو، وہ رنگ نہ پہنو، اونچی آواز میں نہ ہنسو، زیادہ باتیں نہ کرو، لوگ کیا کہیں گے...... میں لوگوں کے ڈر سے آہستہ

آہستہ خاموش ہوتی چلی گئی۔ پھوپھو مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں مگر اس تبدیلی اور اس خاموشی کو وہ بھی محسوس نہ کر پائیں۔

اور میرے سارے رنگ تیز دھوپ میں بے رنگ ہوتے چلے گئے...... آج جب میں نے مہندی لگوائی تو بار بار یہ گمان ہوتا رہا کہ ابھی کوئی مجھے ٹوک دے گا۔ ابھی کوئی روک دے گا......"

ملائکہ نے کھل کر اسے رونے دیا۔ اتنے برسوں کی کڑواہٹ تھی اس کے اندر۔ اچھا تھا نکل جاتی۔

شہر کے سب سے بہترین پارلر سے نتاشا نے اس کے لیے اپائنٹ منٹ لی تھی۔ شیر افگن کی مما نے حوریہ کے لیے عروسی سوٹ بلڈ ریڈ کلر میں تیار کروایا تھا۔ جو بہت ہی خوبصورت تھا۔

ملائکہ نے شام اس کی رخصتی کے بعد اسلام آباد چلے جانا تھا۔ وہ صرف چند دنوں کے لیے پاکستان آئی تھی۔

باقی کے دن اسے اپنے میکے اور سسرال والوں کے ساتھ گزارنے تھے۔

حوریہ کو رخصت ہو کر شیر افگن کے آبائی شہر چکوال جانا تھا۔ اچھا خاصا طویل سفر تھا۔

حیدر نے صرف چند قریبی رشتہ داروں دوستوں کو ہی مدعو کیا تھا۔

ملائکہ نے گلے لگا کر حوریہ کو بہت سی دعائیں دی تھیں۔ رواج کے مطابق ادھر سے کوئی خاندان یا رشتہ دار لڑکی حوریہ کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ کیونکہ اس کے رشتہ داروں میں اب صرف اسی گھر کے چار نفوس تھے۔ بابا جان اور پھوپھو دو ہی بہن بھائی تھے۔ ادھر سے حوریہ کی ماں جی کی صرف ایک ہی بہن تھی جو اوائل عمر میں ہی فوت ہو گئی تھی۔ یوں حوریہ رشتوں کے معاملے میں غریب ہی تھی۔

عافیہ نے ایک بار بھی نہیں کہا کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ مردوں کو بھلا ان معاملات یا رسموں سے کیا سروکار تھا۔ مگر اس کمی کو حوریہ نے اچھی طرح محسوس کیا تھا۔

یاسمین بھی عورت تھی۔ ان کی حساس طبیعت نے اس عام سی بات کو فوراً نوٹ کیا تھا کہ حوریہ کی طرف سے شادی والے معاملے میں اتنی خاص سرگرمی نہیں دکھائی گئی ہے۔ شیر افگن ان کی پہلی اولاد تھی اسی حوالے سے ان کے بڑے ارمان تھے۔ بیٹے کی ضد کے آگے وہ ہار مان گئی تھیں مگر اندر ہی اندر انہیں بہت سی باتیں کھٹک رہی تھیں۔

گاڑی شیر افگن کا چھوٹا بھائی عادل ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ شیر افگن بیٹھا تھا

جبکہ پچھلی سیٹ پہ یاسمین اور حوریہ کے ساتھ عبداللہ ملک کی بھاوج بیٹھی تھیں۔ باقی گاڑیاں پیچھے تھیں۔ بارش کی وجہ سے عادل احتیاط سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد بارش کے آثار کہیں بھی نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ عادل نے بھی رفتار بڑھا دی۔ کلر کہار پہنچنے میں انہیں تین کے بجائے چار گھنٹے لگے تھے۔ ابھی مزید ایک گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ ادھر بھی بارش کا سلسلہ زور و شور سے جاری تھا۔

عادل کو ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹا کر شیر افگن نے خود اس کی جگہ سنبھال لی حالانکہ مما اور آنٹی نے بہت کہا کہ تم نہ کرو ڈرائیونگ مگر وہ نہ مانا کیونکہ عادل کی حالت وہ دیکھ چکا تھا۔ انگلینڈ اور پاکستان کی ٹریفک اور قوانین میں بہت فرق تھا۔ عادل گھبرایا ہوا سا تھا۔ کلر کہار پہنچنے کے بعد شیر افگن نے گاڑی گاؤں جانے والی ذیلی سڑک پہ موڑ دی۔ اب وہ اپنے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔

اس دوران حوریہ کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ اتنا بھاری جوڑا اور اس پہ سونے کی بھاری جیولری اور میک اپ نے ستیاناس کر دیا تھا۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ جلدی سے گھر آ جائے۔

یاسمین کو اس کی حالت کا بخوبی احساس تھا۔ جب ہی تو انہوں نے اس کا سر اپنے شانے پہ رکھ لیا تھا۔ ان کا دایاں بازو حوریہ کی کمر میں حمائل تھا۔ خدا خدا کر کے سفر تمام ہوا۔

ملک شجاعت، عبداللہ ملک اور آیان سمیت دیگر رشتہ داران سے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔

حوریہ کو سب سے پہلے جوس پلایا گیا۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ حالانکہ ملائکہ نے کتنی بار کہا کہ تھوڑا سا کھا لو مگر اس نے بھوک نہ ہونے کا عذر کر کے منع کر دیا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی یاسمین نے سب سے پہلے صدقے کے بکرے کو حوریہ کا ہاتھ لگوایا تھا۔ باقی کی رسمیں کرنے سے عبداللہ ملک نے روک دیا تھا کیونکہ حوریہ کی حالت سامنے تھی۔

شیر افگن کی ایک کزن نے اسے زبردستی نیم گرم دودھ پلایا اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد اسے چکن بریانی کھلائی۔

مٹھائی کی رسم کے لیے شیر افگن کو اندر حوریہ کے پاس لایا گیا۔ خاندان کی سب عورتیں ادھر جمع تھیں اور بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں شیر افگن نے حوریہ کو مٹھائی کھلا دی تھی اور کامیاب ٹھہرا تھا۔ جبکہ حوریہ کا ہاتھ باوجود کوشش کے اس کے منے تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس کا چہرہ گھونگھٹ کی آڑ میں تھا اور سر جھکا ہوا تھا۔

اسے اندازے سے ہی یہ معرکہ سر کرنا تھا مگر افگن بھی بہت ہوشیار تھا ناچارہ وہ گلاب

جامن بھی حوریہ کو خود ہی کھانا پڑی کیونکہ اس رسم میں شرط یہی تھی جو مٹھائی کھلانے میں ناکام ہو جاتا اسے دوسرے کے حصے کی مٹھائی بھی خود کھانی پڑتی اور دونوں بار یہی ہوا۔

بھائی کی جیت پہ عادل او آیان نے خوب تالیاں بجائیں۔ ان کے لیے یہ رسمیں بہت انوکھی اور پرکشش تھیں۔

شیر افگن کا کمرا فرسٹ فلور پہ سیٹ کیا گیا تھا۔ یاسمین اسے تھام کر اوپر لائیں۔ ساتھ آیان اور عادل بھی تھے۔ جونہی انہوں نے شیر افگن کے بیڈ روم کا دروازہ کھولا اور حوریہ نے پہلا قدم اندر رکھا، اس پہ پھول برسنے لگے۔ فلورل ڈیکوریشن بہت زبردست تھی۔ یہاں وہاں اس کے قدموں تلے پھول ہی پھول تھے۔

دہکتے ہوئے گلاب کے سرخ پھول، کمرا پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔

یاسمین نے اسے جہازی سائز بیڈ پر لا بٹھایا۔ جہاں پھولوں کی چادر سی بچھی ہوئی تھی۔

''تم اب آرام کرو۔'' یاسمین نے اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا اور باقیوں کو لے کر نیچے چلی گئیں۔

حوریہ اب آرام سے کمرے کی آرائش دیکھ رہی تھی، ساری فضا گلاب کی خوشبو سے معطر تھی۔ پہلی بار اس کے لبوں پہ ایک خوشگوار مسکراہٹ آئی مگر کچھ سوچ کر دل بجھ سا گیا۔ اسے پتہ تھا شیر افگن نے اس کی مدد کرنے کے خیال سے شادی کی تھی، ایک لحاظ سے وہ اس کا محسن تھا کہ مشکل کی اس گھڑی میں اس نے نہ جانے کس طرح اپنے گھر والوں کو اس شادی پر راضی کیا تھا۔

اسے اس حقیقت کو بھولنا نہیں چاہیے کہ اس نے ایک بے بس لڑکی سمجھ کر اس کی مدد کی ہے۔ گھٹنوں پہ سر رکھے وہ بہت سال پیچھے اپنے ماضی میں پہنچی ہوئی تھی۔

یہیں تھا میرا بچپن، یہیں کہیں پہ تھا
یہیں ہنسا تھا
یہیں پہ کہیں رویا تھا
یہیں درختوں کے سائے میں تھک کر سویا تھا
یہیں پہ کھیل تھے میرے
یہیں گھروندے تھے

یہیں پہ چوڑیوں سے نام کاڑھ لیتے تھے
یہیں پہ تتلیوں سے رنگ چھان لیتے تھے
یہیں پہ جگنوؤں سے اپنی بات چلتی تھی
کوئی ہنسی تھی جو ہر وقت ساتھ چلتی تھی
ان ہی جھروکوں سے کچھ چاند جھانکتے تھے مجھے
یہیں پہ تھا میرا بچپن
یہیں کہیں پہ تھا

حوریہ چار سال کی تھی جب نگینہ بیگم نے ہیپا ٹائٹس بگڑنے پہ زندگی کو الوداع کہا تھا۔ بابا جان نے اسے محبت سے پالا اور ماں باپ دونوں کا کردار ادا کیا۔

اماں فاطمہ کی بھر پور توجہ اور محبت بھی حوریہ کو میسر تھی۔ اماں فاطمہ اور پھر ان کے ماں باپ اور پھر ان کے ماں باپ نے بھی اس خاندان کی خدمت کی تھی۔ اماں فاطمہ تو جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ اولاد کوئی تھی نہیں سو حوریہ ہی ان کی محبت کا مرکز تھی۔ انہوں نے جوانی سے بڑھاپے کا سفر اسی حویلی میں طے کیا تھا۔

حوریہ عمر کی منزلیں طے کرتی گئی۔ بابا جان کے بہت قریبی دوست چوہدری رفیق احمد تھے۔ ان کا حویلی میں آزادانہ آنا جانا تھا۔ وہیں پہ حوریہ انہیں اپنے بیٹے کے لیے بھا گئی۔ اپنی خواہش کا اظہار انہوں نے حوریہ کے بابا نعمان سے کیا۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

حوریہ میٹرک میں تھی جب چوہدری رفیق احمد کی شدید پیار بھری ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کر امین نے اس کا نکاح عمر رفیق احمد سے کر دیا۔

اس وقت زہرا بیگم نے بھائی سے بہت کہا کہ اتنی جلدی مت کرو، حوریہ بہت چھوٹی ہے فی الحال منگنی کر لو مگر وہ دوست کو ناں نہ کر سکے۔ بڑی دھوم دھام سے نکاح ہوا۔ رفیق احمد کی پوری برادری جمع ہوئی۔ مگر اس خوشی کی عمر بہت مختصر تھی۔

نکاح کے بعد صرف دو ماہ کا عرصہ گزرا تھا۔ اس کے بعد زندگی آزمائش بن گئی تھی۔

عمر رفیق احمد کا گاڑی سے بہت شدید ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ دس دن وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد خاموشی سے دنیا چھوڑ گیا۔

یوں نوعمری میں ہی حوریہ کی آزمائش کا دور شروع ہو گیا۔ گاؤں دیہات کے لوگوں کا

اپنا مزاج اور سوچ ہوتی ہے۔ دبے لفظوں میں عورتوں نے اسے منحوس کہنا شروع کر دیا۔

رفیق احمد بیٹے کے دکھ سے نڈھال تھے تو قیامت نعمان پر بھی ٹوٹی تھی۔ حوریہ کی عمر ہی کیا تھی جو اتنا بڑا داغ بھی لگ گیا تھا۔ لوگوں کی سوچ محدود تھی۔ اٹھتے بیٹھتے اس حقیقت کا احساس دلانا بھولتے نہیں تھے۔

رفیق احمد نے وقت کے ساتھ ساتھ خود کو سنبھال لیا۔ اس روز اس کی عدالت میں پیشی تھی۔ خاندانی زمینوں کے جھگڑے پہ ایک مقدمہ کافی عرصہ سے عدالت میں زیر سماعت تھا۔ رفیق احمد کو امید تھی کہ دو تین پیشیوں کے بعد عدالت ان ہی کے حق میں فیصلہ دے گی۔ اور آج مقدمے کا فیصلہ ہونا تھا۔ نعمان احمد اور رفیق احمد دونوں اکٹھے شہر گئے تھے۔

توقع کے مطابق فیصلہ ان ہی کے حق میں ہوا تھا۔ جب وہ عدالت سے باہر نکلے تو رفیق احمد کے چچازاد اور تایازاد باہر عدالت کے احاطے میں ہی موجود تھے۔ انہوں نے کینہ توز نگاہوں سے رفیق احمد کو دیکھا اور اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ رفیق احمد اور نعمان بھی گاؤں کی طرف عازم سفر ہوئے۔

راستے میں درختوں کے گھنے جھنڈ کے پاس رفیق احمد کے چچازاد اپنے حواریوں کے ساتھ گھات لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ رفیق احمد کو اپنا دفاع کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا اور پل بھر میں انہیں خون سے نہلا دیا گیا۔ اس کے ساتھ نعمان بھی مارے گئے۔ حوریہ پہ ایک اور قیامت ٹوٹی تھی۔ لوگ ہمدردی کی آڑ میں طنز کے تیر چلاتے۔ اماں فاطمہ کا کمزور اور بوڑھا وجود اسے کہاں تک سہارا دے سکتا تھا۔ وہ خود آئے دن بیمار رہنے لگی تھیں۔

انہی حالات کے پیش نظر زہرا بیگم اسے اپنے ساتھ لاہور لے آئیں۔

اب پھوپھو زہرا ہی اس کے لیے سب کچھ تھیں۔ حیدر اور حنان دونوں اس کے لیے بھائیوں کی طرح تھے۔ پھوپھو نے سب روپیہ پیسہ اس کے نام اکاؤنٹ کھلوا کر اس میں جمع کروا دیا۔ گاؤں والی حویلی سے حوریہ کا قلبی و جذباتی تعلق تھا، وہ اس نے فروخت نہیں کی اور نہ اس کا کوئی ایسا ارادہ تھا۔ باقی زمینیں بھی جوں کی توں پڑی تھیں مگر زہرا کے دل میں ایک بار بھی لالچ نہیں آیا۔

شہر لانے کے بعد زہرا نے حوریہ کا ایڈمیشن کالج میں کروا دیا۔ گریجویشن کرنے کے بعد اس نے اپنی خواہش پہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا۔

اس تمام عرصے کے دوران عافیہ نے اس کو اپنا حریف تصور کرنا شروع کر دیا تھا۔

زہرا بیگم اسے بہت چاہتی تھی ہر کام اس کے مشورے سے ہوتا یہی بات اسے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ دو تین اچھی فیملیز نے حوریہ کے لیے اپنی دلچسپی کا اظہار تو کیا عافیہ نے کسی طرح ان کے کانوں تک یہ بات پہنچا دی کہ حوریہ کا پہلے نکاح ہو چکا ہے اور یہ اپنے شوہر کو کھا گئی ہے داغ لگا چاند ہے۔

یہ باتیں سن کر ظاہر ہے کس نے رشتہ کرنا تھا یہ معاملہ ختم ہو گیا تھا۔ کچھ الٹے سیدھے رشتے آئے جن کو زہرا بیگم نے صاف جواب دے دیا ان کے دل میں شروع سے خواہش تھی کہ حوریہ، حنان کی بیوی بنے، اسی وجہ سے انہوں نے کہیں اور اس کی شادی کے لیے بات چیت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور اسی بات کو عافیہ نے ان کی کمزوری سمجھ لیا تھا۔

زہرا بیگم اور حوریہ دونوں یہ نہ جان پائیں کہ اندرونِ خانہ عافیہ کیا کیا کرتی رہی ہے۔ اس کا حسد اسے چین نہیں لینے دیتا تھا۔

ڈاکٹر آفتاب کی دھمکی آمیز کال آنے کے بعد اس کا ارادہ تھا کہ حنان کو سب کچھ بتا کر ہینڈل کرنے کو کہے گی۔ مگر ڈرائنگ روم میں حنان کا دوست بیٹھا تھا اور عین وقت پہ اس نے اپنی زندگی کا سب سے خطرناک اور بولڈ اسٹیپ لیا تھا۔ اسی اسٹیپ پہ اس کی آئندہ زندگی کی بہتری یا بربادی کا انحصار تھا۔

اپنی بقا کے لیے اسے ایک مرد کا سہارا درکار تھا عارضی طور پر جب اس کے قدم مضبوط ہو جاتے وہ اس سہارے سے جان چھڑا لیتی۔

شیر افگن نے اپنا قول پورا کر دیا۔ اب وہ ڈاکٹر آفتاب سے بہت دور چکوال، شیر افگن کے آبائی گھر میں بیٹھی تھی۔

ماضی کا سفر بہت تکلیف دہ تھا اس کی آنکھوں کے گوشے سرخ ہو رہے تھے۔ مختصر سے اس وقت میں وہ خیالوں میں بہت سا سفر طے کر آئی تھی۔

شکستہ روح پر سے غم کے سارے پیرہن
اک اک کر کے اترتے جا رہے ہیں
لمحہ لمحہ
میں زمین سے دور ہوتی جا رہی ہوں

تھکن کی وجہ سے حوریہ کی آنکھ لگ گئی تھی، ورنہ اس کا ارادہ تھا کہ بھاری سوٹ اور جیولری سے جان چھڑائے گی۔ مگر نیند بڑی ظالم تھی اس کا پروگرام ادھورا رہ گیا تھا۔ شیر افگن جب اپنے بیڈروم میں داخل ہوا تو گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے وہ نیم دراز سو رہی تھی۔ اس کی ٹانگوں پہ نرم و ملائم کمبل پڑا تھا۔

یہاں بارشیں بہت ہوتی تھیں اور آج ہونے والی بارش نے موسم کو سرد کر دیا تھا۔ موسمی کیفیت کو دیکھتے ہوئے یاسمین نے کمبل بیڈ کی پائنتی رکھوا دیا تھا۔

حوریہ بیڈ پہ دراز ہوئی تو نیند آنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ ٹھنڈ لگنے پہ اس نے غنودہ کیفیت میں ہی کمبل پاؤں اور ٹانگوں پہ ڈالا تھا۔

گلاب کے پھولوں کی خوشبو پورے ماحول کو معطر کرتے ہوئے کچھ اجنبی اجنبی سی سرگوشیاں کرتی محسوس ہو رہی تھی۔

شیر افگن نے کپڑوں کی الماری سے اپنا نائٹ سوٹ نکالا۔ وہ روایتی دولہا کی طرح تیار نہیں ہوا تھا۔

نیم گرم پانی سے شاور لینے کے بعد اس کی تو ساری تھکن ہوا ہو گئی ساتھ نیند تھی۔ حوریہ ابھی تک محوِ خواب تھی۔ اتنی آہٹوں کے بعد بھی اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔

شیر افگن گلاس ونڈو کی طرف گیا اور پردہ ہٹایا۔ باہر ابھی تک بارش برس رہی تھی اس نے پردے دوبارہ برابر کر دیئے۔

بیڈروم کی ساری فینسی لائٹیں روشن تھیں۔ اس نے ایک کے سوا سب آف کر دیں۔ کوئی خیال آنے پہ اس نے وہ بھی بند کر دی۔ اب صرف حوریہ کی سائیڈ پہ بیڈ لیمپ جل رہا تھا۔ گاؤ تکیے کے ساتھ ساتھ باقی دو تکیے بھی حوریہ کے قبضے میں تھے۔ گاؤ تکیے سے اس نے ٹیک لگائی ہوئی تھی اور دوسرا اس کی گردن اور سر کے نیچے تھے۔ تیسرا تکیہ اس کے پہلو کے پاس پڑا تھا جہاں وہ اپنا الٹا ہاتھ اور بازو بھی رکھے ہوئے تھی۔

شیر افگن لائٹس آف کر کے بیڈ کی طرف آیا۔ وہ پاؤں سمیٹ کر گٹھڑی سی بنی سو رہی تھی۔ وہ اس کی بائیں سائیڈ پر بیٹھ گیا۔ اب وہ مکمل طور پر اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ دایاں بازو اس کے سینے پہ رکھا ہوا تھا جو سینے کے زیروبم سے ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ کہنیوں سے اوپر تک مہندی چھب دکھلا رہی تھی۔

''پلیز آپ کو اللہ کا واسطہ مجھ سے شادی کر لیں۔ میری مدد کریں ورنہ میں بالکل تباہ ہو جائیں گی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ یہ میں آپ سے ایک انسان ہونے کے ناطے کہہ رہی ہوں۔ انسانیت کے واسطے میری مدد کریں......''

شیر افگن یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے یاقوتی لب اسے بولتے محسوس ہو رہے تھے، حالانکہ وہ خاموش تھی مگر اس کی آواز شیر افگن کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ یوں سوتی ہوئی وہ اس کے خوابیدہ جذبات کو جگا رہی تھی، شیر افگن کا ہاتھ اس کے بازو کی طرف بڑھا اور چہرا حوریہ کی طرف جھکا اس سے پہلے کہ وہ کوئی گستاخی کرنے میں کامیاب ہوتا اس کے ہاتھ کے لمس سے حوریہ بیدار ہو گئی۔ وہ سنبھل گیا۔

حوریہ اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ اس نے اپنا آپ تیزی سے سنبھالا تھا۔

زندگی میں پہلی بار وہ یوں پور پور سجی تھی۔ رنگ اس کے سارے وجود میں دمک رہے تھے اور وہ اتنی دلکش اور پراسرار محسوس ہو رہی تھی کہ شیر افگن کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے سارے بھیدوں سے یکدم واقف ہو جائے۔

حوریہ نے بھی تصور نہیں کیا تھا کہ دلہن بن کر وہ اتنی حسین لگے گی۔ ابھی کچھ دن پہلے جن مہمانوں نے نتاشا کو دلہن کے روپ میں دیکھا تھا انہوں نے آج یہی کہا تھا کہ حوریہ اس کے مقابلے میں بہت خوبصورت لگ رہی ہے۔ خود اس نے بے دلی سے صرف ایک بار آئینہ دیکھا تھا۔ اسے اپنا رنگ روپ سب بیکار لگ رہا تھا۔

شیر افگن کنوارا نوجوان تھا جب کہ وہ خود داغ لگا چاند تھی۔ یہ چاند، شیر افگن کے آنگن میں اترنے کے کہاں لائق تھا۔ عافیہ بھابی نے اس کے پروپوزل پہ پورے یقین سے کہا تھا کہ یہ رشتہ چل نہیں پائے گا۔ لڑکے وقتی جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسی شادیاں کر لیتے ہیں مگر جذبات کا طوفان اترتے ہی یہ رشتہ کاغذ کی ناؤ بن جاتا ہے جس کے مقدر میں ڈوبنا ہی ہوتا ہے فقط۔

عافیہ تو یہی سمجھ رہی تھی کہ شیر افگن، حسان کے دوست کی حیثیت سے یہاں آتا جاتا رہا ہے تو حوریہ اسے پسند آ گئی ہے اس حد تک کہ اس نے اپنے بڑوں کو رشتے کے لیے بھجوا دیا۔

''لگتا ہے، بہت تھک گئی ہیں آپ؟'' شیر افگن کی گہری نگاہیں اس کے پورے وجود کا طواف کر رہی تھی۔

''جی ہاں ہے، کافی لمبا سفر تھا پھر اتنا بھاری لہنگا اور جیولری میں نے پہلے کبھی پہنی

نہیں تھی۔'' وہ بہت سلیقے سے خود کو سمیٹ کر پیچھے ہوئی تھی۔

''بہت خوبصورت لگ رہی ہیں آپ اور فلورل ڈیکوریشن کیسی لگی آپ کو......؟''

''جی بہت اچھے لگ رہے ہیں پھول۔'' اسے کچھ نہ کچھ بولنا ہی تھا۔

''لیکن آپ سے زیادہ اچھے نہیں۔ مجھے ریڈ روز بہت پسند ہیں، میں چاہ رہا تھا آپ جب یہاں آئیں تو یہ پھول ہی آپ کو خوش آمدید کہیں......''

وہ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ حوریہ کی صندلی پیشانی پہ یکدم پسینہ آ گیا۔ وہ پلٹا۔

اس کے ہاتھ میں زنجیر کے ساتھ بہت خوبصورت لاکٹ تھا۔ جو یقیناً حوریہ کے لیے تھا۔

''بہت جلدی میں لیا ہے۔'' وہ اس کا لاک کھول چکا تھا۔ حوریہ اضطراری انداز میں بیڈ سے اتری، فضا میں چوڑیوں کا جلترنگ ابھرا۔ شیر افگن اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اضطرابی کیفیت حوریہ کے چہرے سے مترشح تھی۔ ''کیا ہوا ہے؟ آپ کھڑی کیوں ہو گئی ہیں؟''

''میں یہ کپڑے تبدیل کرنا چاہ رہی ہوں۔''

''اوہ......آپ۔ جائیں کر لیں۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھرتا پیچھے ہٹ گیا۔ حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ حوریہ ابھی اسی روپ میں اور کچھ دیر اس کے سامنے رہے۔ وہ کپڑے نکال کر چلی گئی۔ شیر افگن اس کے انتظار میں بیڈ پہ نیم دراز ہو گیا۔

گھڑی کی ٹک ٹک وقت گزرنے کا احساس دلا رہی تھی۔ خاصی دیر بعد وہ واپس آئی۔ سادہ سے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس اور سر اور کندھوں کے گرد دوپٹہ لپیٹے اس نے گویا اپنے سارے اسرار محفوظ کر لیے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حوریہ جا کر صوفے پہ بیٹھ گئی۔

''آپ وہاں کیوں بیٹھ گئی ہیں۔'' وہ حیرت سے ٹھٹکا۔

''میں اس مقام کے قابل نہیں ہوں جو آپ مجھے دینا چاہ رہے ہیں۔ میں نے مجبوری کے عالم میں اپنی نسوانی انا کو مار کر آپ سے مدد مانگی۔ عام حالات میں میں ایسا کچھ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے یقین سا تھا کہ آپ ضرور میری مدد کریں گے اور میرا یقین سچا ثابت ہے۔ آپ نے مجھ سے ابھی تک نہیں پوچھا کہ وہ کون سے ایسے حالات تھے جن کی بنا پہ میں یہ سب کرنے پر مجبور ہوئی......؟''

حوریہ اسے سنبھل سنبھل کر سب حالات بتانے لگی۔ اس دوران وہ اپنے آنسو پینے کی

بھی کوشش کر رہی تھی۔

"تو آپ اب کیا چاہتی ہیں......" شیر افگن بیڈ سے اتر کر اس کے سامنے آ گیا تھا۔

"مجھے آپ کی ضرورت ہے کیونکہ ڈاکٹر آفتاب نے مجھے دھمکی دی ہے کہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"مطلب جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو ہمارے اور آپ کے راستے الگ ہو جائیں گے؟" وہ دلی جذبات کے چہرے سے عیاں نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

"جی ہاں۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔ شیر افگن کے لبوں پہ تلخ مسکراہٹ آ گئی۔

"جب آپ کو علم تھا کہ آپ کو کچھ عرصے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت ہے تو اس کے لیے شادی جیسے ڈرامے کی کیا ضرورت تھی؟" کوشش کے باوجود وہ خود کو یہ کہنے سے روک نہیں پایا تھا۔

"میں کسی اور ذریعے سے بھی آپ کی مدد کر سکتا تھا۔"

"مگر میں ایک کمزور لڑکی تھی۔ آپ کسی اور ذریعے سے میری مدد کرتے تو مجھ پہ انگلیاں اٹھتیں جو مجھے گوارا نہیں کسی صورت......"

"کیا کہوں میں حوریہ صاحبہ! آپ کو...... آپ نے مجھے مشکلات سے دوچار کر دیا ہے۔"

شیر افگن کو بہت غصہ آ رہا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ حنان کی جو کزن خود کو مظلوم ترین لڑکی کے روپ میں پیش کر رہی ہے، درحقیقت اتنی بھی مظلوم نہیں ہے۔ غصہ اسے بہت شدید آ رہا تھا۔

"میں نے آپ سے بہر حال شادی کی ہے نکاح نامہ میرے پاس ہے شوہرانہ حقوق میرے پاس محفوظ ہیں جنہیں آپ بھی چیلنج نہیں کر سکتیں۔"

اسے یوں لگا جیسے حوریہ ابھی رو دے گی۔

"میرے پاس ہے ہی کیا میری پہچان ہی کیا ہے ایک نوجوان بیوہ ایک داغ لگا چاند...... آپ کی فیملی سے یہ بات چھپائی گئی ہے۔ کل جب یہ بات کھلے گی تو تو...... وہ میرے بارے میں اچھا نہیں سوچیں گے، اس لیے آپ کے ساتھ میں کوئی ایسا تعلق بنانا چاہتی ہی نہیں۔ میرا آپ کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ عافیہ بھابی مجھے اپنے بھائی کے ساتھ نتھی کرنا چاہ رہی تھیں۔ مجھے پتہ تھا اگر ایک بار میں وہاں پھنس جاتی تو میرا نکلنا ناممکن تھا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ حنان یا

حیدر بھائی کو میری وجہ سے نقصان پہنچے، میں نے آپ کو اس وقت ڈرائنگ روم میں دیکھ کر اچانک فیصلہ کیا تھا کہ آپ اس گرداب سے نکالنے میں میرا ساتھ دے سکتے ہیں۔ میں مانتی ہوں، میں نے خودغرضی سے کام لیا ہے مگر جانے سے پہلے میں معافی مانگ لوں گی۔" اس کے آخری الفاظ پہ شیر افگن چونک گیا۔ اس کا غصہ حوریہ کے آنسوؤں سے دم توڑ چکا تھا۔

"جب حالات آپ کے حق میں ہو جائیں گے تو آپ کیا کریں گی؟" وہ اس کے آنسوؤں سے الجھن محسوس کر رہا تھا۔

"میں آپ کا گھر چھوڑ دوں گی۔ ہو سکتا ہے ملائکہ کے پاس چلی جاؤں مگر واپس پلٹ کر پھوپھو کے گھر نہیں جاؤں گی۔"

شیر افگن بہت گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر گلاس ونڈو سے پردے کھسکا کر کھڑکیاں کھول دیں۔ بارش ایک تواتر سے برس رہی تھی۔

"حوریہ! آپ سو جائیں۔"

دونوں ہاتھ ریلنگ پہ ٹکائے باہر اندھیروں میں کچھ کھوجتا شیر افگن بارش میں مکمل طور پر بھیگ چکا تھا۔

مرے نصیب میں پھر یہ بہار ہو کہ نہ ہو
نہ جانے پھر وہ مرا غمگسار ہو کہ نہ ہو
یہی بہت ہے ایک شخص چین پا جائے
بھلے درخت بہت سایہ دار ہو کہ نہ ہو
مگر یہ طے ہے کہ میں اس کے غم میں رہتا ہوں
مرے لیے وہ بھلے بے قرار ہو کہ نہ ہو
میں دھوپ بن نہیں سکتا کسی کے لیے
مرے لیے کوئی ابر بہار ہو کہ نہ ہو

صبح دم شیر افگن کی آنکھیں شب بیداری کی چغلی کھا رہی تھیں، شاید وہ رات بھر نہیں سویا تھا۔ ساڑھے دس بجے دروازے پہ دستک ہوئی تو حوریہ کی آنکھ کھلی۔

اس نے فوراً اٹھ کر کشن جگہ پر رکھا اور دوپٹہ سنبھال کر دروازہ کھولا۔ باہر شیر افگن کی

کزن ثمینہ تھی۔

"صبح بخیر۔ آپ فریش ہو جائیں، میں ناشتہ ادھر ہی لاتی ہوں کیونکہ باقی سب کر چکے ہیں۔" وہ پلٹ کر چلی گئی۔ حوریہ کو جانے کیوں شرمندگی سی ہوئی۔

شیر افگن سینے کے بل لیٹا ہوا تھا۔ حوریہ واش روم سے منہ ہاتھ دھو کر آئی تو وہ تکیے کے سہارے نیم دراز سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت سرخ ہو رہی تھیں۔

ثمینہ ناشتہ لے کر آئی تو تب وہ اٹھ کر باتھ روم میں گیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ نہا کر نکلا۔

صوفے پہ بیٹھ کر اس نے ٹیبل اپنی طرف گھسیٹی۔ حوریہ ہنوز کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"آئیں، آپ بھی ناشتہ کر لیں۔" یہ پہلی بات تھی جو شیر افگن نے اس سے کی تھی۔ وہ جھجکتے ہوئے اس سے قدرے دور ہو کر بیٹھ گئی۔

شیر افگن نے چائے کپ میں ڈال کر باقی ٹرے اس کی طرف سرکا دی۔ اس نے بھی صرف چائے ہی پی۔

"امید ہے کہ میری عزت کا آپ خیال رکھیں گی۔ کچھ بھی ہو بہرحال آپ میری بیوی بن چکی ہیں۔ آپ کے خیالات اور ارادوں کا میری فیملی کو پتہ نہیں ہے اور انہیں پتہ چلنا بھی نہیں چاہیے۔ باقی رہ گیا ڈاکٹر آفتاب کا مسئلہ تو اسے میں ہینڈل کر لوں گا۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری فیملی نے بڑے ارمانوں سے میری شادی کی ہے۔ کبھی خود سے ہٹ کر بھی سوچنا چاہیے۔"

آخر میں اس کا لہجہ سرد سا ہو گیا۔ چائے کا کپ اس نے واپس ٹرے میں رکھ کر پھر ایک سگریٹ سلگا لیا۔

ناشتے کے برتن واپس لینے کے لیے آنے والی لڑکیوں میں بہت سے نئے چہرے تھے جو حوریہ کے لیے یکسر اجنبی تھے۔ وہ سب ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ حوریہ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کے شوخ سوالوں کا کیا جواب دے۔

"آپ یہ سوٹ پہن کر آئیں، میں پھر آپ کا میک اپ کرتی ہوں، آپ کو نیچے لے کر جانا ہے کیونکہ پھوپھو کا حکم ہے۔ عورتیں آ رہی ہیں گاؤں کی۔ سب کو دلہن دیکھنے کا زبردست شوق ہو رہا ہے۔"

یہ اریبہ تھی شیر افگن کی ماموں زاد، شوخ اور منہ زور۔ اس نے خود ہی حوریہ کے لیے بہت

اسٹائلش سا سوٹ نکالا۔ ساتھ میچنگ جیولری اور سینڈل بھی تھے۔ شیر افگن چینج کر کے نیچے جا چکا تھا۔

حوریہ کو بھی لڑکیاں مہمان خواتین کی طرف لے آئیں۔ اکثریت کی نگاہوں میں اس کے لیے پسندیدگی تھی۔

سارا دن عورتیں نئی دلہن کو دیکھنے آتی رہیں۔ سہ پہر کے بعد سب کھانا کھانے بیٹھے تو شیر افگن کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ ایان اسے دوستوں کے درمیان سے بلا کر لایا تو اس نے بھوک نہ ہونے کا عذر کیا۔

حوریہ دیکھ چکی تھی اس نے صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا صرف چائے کا ایک کپ لیا تھا اور اب بھی اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ یاسمین کھانے سے فارغ ہوئیں تو وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

"افگن! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں" اس کی سرخ سرخ آنکھیں جو شب بیداری کی چغلی کھا رہی تھیں یاسمین کو پریشان کر گئیں۔

"جی مما! میں ٹھیک ہوں، بس سر میں درد ہے۔" اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

یاسمین نے جھک کر اس کا ماتھا چوما اور سر دبانے لگیں۔

"اب تمہاری بیوی آ گئی ہے، اسی سے خدمتیں کراؤ اپنی۔" ٹی وی لاؤنج میں سب بیٹھے تھے۔ حوریہ ان کی بات پہ نروس سی ہو گئی کیونکہ سب کی توجہ ایک دم اس کی طرف ہو گئی تھی۔

"جاؤ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ تھوڑا سو لو، فریش ہو جاؤ گے۔ اور حوریہ بیٹا! تم بھی جاؤ اوپر۔ تھک گئی ہو گی بیٹھ بیٹھ کر۔"

انہوں نے باری باری دونوں کو حکم دیا۔ حوریہ کو تو دونوں ماموؤں کی بہوئیں لے آئیں تھام کر۔ شیر افگن کافی دیر مما کی گود میں آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ انہوں نے زبردستی اسے اٹھایا۔

حوریہ کو اس نے توجہ سے نہیں دیکھا تھا مگر کمرے میں آنے کے بعد نظر رہ رہ کر اسی کی طرف اٹھ رہی تھی۔ کاپر اور سی گرین کلر کے سوٹ میں ملبوس وہ کل سے بھی زیادہ دلکش لگ رہی تھی۔ پھر وہ جو سویا تو چھ بجے کے بعد ہی اٹھا۔

آنکھ کھلنے پہ سامنے حوریہ ہی نظر آئی جو صوفے پہ بے زار کن انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا آپ کو......؟" شیر افگن نے خود ہی مخاطب کیا۔

"کچھ نہیں۔" اس کے پوچھنے پہ وہ اور بھی پریشان نظر آنے لگی۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کرتا۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑا اس کا سیل گنگنانے لگا۔

حوریہ کی بیسٹ فرینڈ ملائیکہ کی کال تھی۔ اس نے کل بارات والے دن شیر افگن سے اس کا سیل نمبر لیا تھا۔ حوریہ کا تو نمبر ہی آف تھا۔

''السلام علیکم۔'' شیر افگن نے سیل آن کر کے کہا۔

ملائیکہ اس کی خیر خیریت پوچھ رہی تھی۔ شیر افگن نے کچھ دیر بعد اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہنوز لیٹا ہوا تھا۔

''یہ لیں، آپ بات کریں حوریہ سے۔'' اس نے سیل فون حوریہ کے ہاتھ میں دیا۔

وہ اس وقت جتنی خوش ہوئی ملائیکہ کی آواز سن کر پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

''اور سناؤ، کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ نہیں سوئی ہوئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اٹھی ہوں۔''

''اف یہ کون سا ٹائم ہے سونے کا؟'' ملائیکہ نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

''رات کو بھی کافی لیٹ سوئی تھی۔ ابھی سہ پہر میں آنٹی نے کہا کہ جا کر آرام کرو۔''

''ایک دن میں ہی جنابہ کی نیندیں ڈسٹرب ہو گئی ہیں۔'' ملائیکہ کی کھلکھلاتی آواز سیل فون سے باہر تک آ رہی تھی۔ یقیناً شیر افگن بھی سن رہا تھا۔ ''اور تمہارے ہزبینڈ کیسے ہیں۔ کیا ملا منہ دکھائی میں......؟''

وہ چپ سی ہو گئی تھی۔ تب ہی پاس لیٹے شیر افگن نے اس کے ہاتھ سے اچانک سیل فون لے لیا۔

''میں نے رونمائی میں ان کو اپنا آپ دے دیا ہے۔ پتہ نہیں آپ کی دوست کو یہ گفٹ اچھا لگا کہ نہیں۔''

دوسری طرف سنتی ملائیکہ پھر ہنس پڑی۔

شیر افگن اپنے مخصوص اسٹائل میں اس سے بات کرتا رہا جس میں اعتماد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

ولیمہ اگلے روز تھا جو بہت دھوم دھام سے ہوا۔ لاہور سے عافیہ، نتاشا اور حنان اور حیدر بھائی گیارہ بجے تک پہنچ گئے تھے۔ عبداللہ ملک نے پوری برادری، دوستوں اور جاننے والوں کو مدعو کیا تھا۔

حوریہ اپنوں کو دیکھ کر بہت خوش تھی۔ عافیہ کھوجتی نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ نتاشا حوریہ کے کندھے سے لگی اس کے کانوں میں اپنے مخصوص لاابالی انداز میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔

''شیر افگن بھائی سے کچھ انڈرسٹینڈنگ ہوئی کہ نہیں ابھی تک؟ میں اور حنان تو ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے مگر آپ اور شیر افگن بھائی میں تو ایسا سلسلہ ہی نہیں تھا۔'' اس کے سوالوں نے حوریہ کو زچ کر دیا تھا۔

اس کا بیڈروم دیکھ کر اس نے ستائشی انداز میں سراہا تھا۔

''پورا کمرہ گلابوں سے بھر دیا، لگتا ہے آپ کے ہزبینڈ بہت رومنٹک ہیں۔'' نتاشا کی سرگوشی اتنی اونچی تھی کہ شیر افگن کی کزنز نے بھی سن لی۔

''یہ تو حوریہ کو پتہ ہو گا کہ کتنے رومینٹک ہیں...... کیونکہ اتنی جلدی شادی کروائی ہے شیر افگن نے۔'' یہ عاصمہ تھی۔ شیر افگن کی چچازاد جس کی کچھ عرصہ پہلے شادی ہوئی تھی۔

حوریہ ان سب کے درمیان اکیلی تھی۔ شیر افگن قدرے سائیڈ پہ تھا۔ عاصمہ اسے بھی لے آئی۔

''حوریہ اتنی چپ چپ ہیں۔ کیا کر دیا ہے آپ نے؟'' نتاشا اسے دیکھتے ہی شروع ہو گئی۔

''پوچھ لیں ان سے، میں نے تو کوئی گستاخی نہیں کی ہے ابھی تک۔'' شیر افگن نے جو بات کی تھی وہ اتنی مشکل بھی نہیں تھی جو حوریہ کی سمجھ میں نہ آتی وہ پانی پانی ہو گئی شرم سے۔

''آپ اتنے صبر والے لگتے تو نہیں ہیں افگن بھائی!'' ...... یہ نادیہ تھی اس کی خالہ زاد، بڑے زور کا قہقہہ پڑا۔

''اور کیا آپ نے تو شور مچایا ہوا تھا کہ پندرہ دن میں شادی کرو میری......''

''میری دلہن کو تنگ نہ کرو سب۔'' اس نے بڑے پیار سے حوریہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا جیسے ابھی رو دے گی۔

''اوہو دو دن میں ہی اتنا خیال اور پیار۔'' عاصمہ آنکھیں مٹکا کر بولی۔

''جی ہاں زندگی بھر کا جو ساتھ ہے۔'' اس نے حوریہ کے حنائی ہاتھوں پہ اپنا مضبوط ہاتھ رکھتے ہوئے دبایا تو سب کے سامنے اس کی اس حرکت پہ حوریہ بری طرح نروس ہو گئی۔

''حوریہ کو نیند آ رہی ہے، دو دن سے انہیں ریسٹ کرنے کا موقع نہیں ملا ہے تو آپ سب فی الحال انہیں اکیلا چھوڑ دیں اور کمرہ خالی کریں۔''

شیر افگن نے سائیڈ ٹیبل سے اپنی رسٹ واچ اور موبائل بھی اٹھایا۔ وہ منتظر تھا ان سب کے جانے کا۔

''ہو ہو ہو'' عاصمہ نے سور مچا دیا۔'' کتنی اچھی قسمت ہے آپ کی، کتنا پیار کرنے لگے ہیں افگن بھائی آپ سے...... خوش نصیب ہیں آپ......''

نتاشا نے کتنے رشک سے اسے دیکھا تھا۔

''ورنہ آج کل کنواری لڑکیوں کو بھی اتنے اچھے لڑکے نہیں ملتے......'' عافیہ نے اس تمام عرصے میں پہلی بار زبان کھولی تھی۔

اس کی آواز اتنی آہستہ تھی کہ صرف حوریہ تک ہی پہنچ پائی تھی۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو گیا۔ عافیہ کو عجیب کمینی سی خوشی ہوئی۔

شیر افگن کی آنکھوں سے جذبات کے لپکتے شرارے اور محبت کا والہانہ اظہار اسے ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔

''ابھی آج تیسرا دن ہے۔ یہ چڑھتا دریا اترتے دیر نہیں لگے گی پھر تمہیں میری باتیں یاد آئیں گی۔ اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ شیر افگن تمہیں اسی طرح پیار کرتا رہے گا۔ اسے اور اس کی فیملی کو کچھ پتہ نہیں ہے کہ نوعمری میں تمہارا نکاح ہو چکا ہے اور یہ کہ تم بیوہ ہو شیر افگن نے تو تمہیں کنواری جان کر شادی کر لی مگر کل جب یہ بات کھلے گی تو کیا ہو گا؟ اس کی فیملی اور پورا خاندان تو تم نے دیکھ لیا ہے۔ شیر افگن کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ میں نے تو تمہارے بھائی سے کہا تھا کہ یہ صرف دو انسانوں کا نہیں دو خاندانوں کا معاملہ ہے آپ اتنی بڑی بات نہ چھپائیں مگر حیدر نہیں مانے۔ سو میں بھی چپ ہو گئی۔ اب خود ہی عقل سے کام لینا۔ آج کل کے لڑکوں کا پتہ نہیں ہوتا، کبھی اس ڈال کبھی اس ڈال۔ میں تمہاری دشمن تو نہیں ہوں۔ پہلے ہی تم اتنے دکھ اٹھا چکی ہو۔ اسی وجہ سے میں نے راشد کے لیے تمہارا رشتہ مانگا تھا کہ سب کچھ معلوم ہے اسے اور وہ اس حقیقت سمیت تمہیں راضی خوشی قبول کر رہا تھا۔ اب سوچو ذرا، کل جب یہ بات شیر افگن اور اس کی فیملی کو پتہ چلے گی تو کیا ہو گا؟ سوچنا اس بات پہ۔ پھر کھوٹے کھرے کی پہچان ہو گی تمہیں۔''

عافیہ اس کے بالکل قریب جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ باقی لڑکیاں جا چکی تھیں۔

نتاشا شیر افگن کے ساتھ سارا گھر دیکھ رہی تھی۔ حوریہ نے کتنی مشکل سے اپنا آپ سنبھالا تھا۔ عافیہ اپنے تئیں ہمدردی جتا کر اب سب سسرال والوں کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

حوریہ کو نئی پریشانیاں لاحق ہو گئی تھیں۔

۞

دل تاں پاگل ہے
دو کڑیاں لے کہ چپ کر جاؤ

''نہیں نہیں کڑیاں نہیں پڑیاں۔ کیونکہ دل کی بیماری میں کڑیوں (لڑکیوں) کی نہیں بلکہ پڑیوں (دوائی) کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوائی کی پڑیوں کی۔'' عادل نے درستی کے نام پر ایان کی کلاس لے ڈالی تو پاس بیٹھی حوریہ ہنس پڑی۔

''شکر ہے رخ مبارک پہ ہنسی تو آئی۔ میں تو سمجھ رہا تھا ابھی رونے دھونے کا لمبا سا سیشن ہو گا اور مجھے ایک رومال لانا ہو گا۔''

''مجھے پتہ ہی نہیں چلا ٹائم اتنا جلدی گزار گیا۔'' حوریہ نے بڑی محبت سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

وہ ان کے جانے کا سن کر اداس تھی۔ وہ دونوں کتنی دیر سے اسے ہنسانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایان الٹے سیدھے گانے گا رہا تھا۔ لطیفے سنا رہا تھا۔ بالآخر حوریہ ہنس ہی پڑی۔

شیر افگن، یاسمین اور عبداللہ ملک بھی ادھر ہی بیٹھے تھے۔ عادل نے کہا تھا، آج رات جاگ کر گزاریں گے اور ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔

شیر افگن گاہے بگاہے نظر اٹھا کر اس کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ عادل اور ایان کی کمپنی میں حوریہ کتنی خوش لگ رہی تھی۔ بات بے بات ہنسی لبوں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ جبکہ کمرے میں جب وہ اس کے ساتھ اکیلی ہوتی تو یوں بن جاتی جیسے صدیوں سے چپ رہنے کی قسم کھالی ہو۔

وہ رات باتیں کرتے ہوئے ہی گزری تھی۔ صبح سویرے انہوں نے چکوال سے لاہور کے لیے نکلنا تھا۔ حوریہ بار بار آنکھیں صاف کر رہی تھی۔ یاسمین نے شیر افگن سے کہا تھا پہلی فرصت میں تم نے حوریہ کو لے کر ہمارے پاس آنا ہے۔

ایک تلخ سی ہنسی نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا تھا۔

کبھی کبھی شیر افگن کو شدید غصہ آتا۔ حوریہ نے اسے قربانی کا بکرا بنایا تھا۔ یہ بات ٹھیک تھی کہ اسے پہلے حوریہ سے کوئی محبت نہیں تھی وہ تو اسے حنان کی کزن ہونے کے ناتے سے جانتا تھا۔ اس نے روتے سسکتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی اسے خدا کا واسطہ دے کر شادی کے لیے کہا۔

اس کی آنسوؤں اور واسطوں نے اسے یہ جھوٹ بولنے پہ مجبور کیا کہ مجھے حوریہ سے شدید محبت ہے اور مجھے اس سے شادی کرنی ہے، بہت جلدی ورنہ اس کے گھر والے اس کی شادی کہیں اور کر دیں گے۔

حنان نے حوریہ کی گزشتہ زندگی کے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا تھا شیر افگن نے اس سے کہا کہ فی الحال میری فیملی تک یہ بات نہ پہنچے۔ میں بعد میں موقع دیکھ کر خود ہی بتا دوں گا۔" عین وقت پر وہ بدمزگی نہیں چاہتا تھا، اسی وجہ سے اس نے حوریہ کے نکاح اور بیوگی والی بات چھپالی۔

اسے حقیقتاً یہ سب جان کر دکھ ہوا تھا۔ اس کے لیے یہ بات قطعاً اہمیت نہیں رکھتی تھی کہ حوریہ پہلے کسی کی منکوحہ رہ چکی ہے۔ بلکہ اسے حوریہ سے ہمدردی ہو گئی کہ حوریہ نے اس ٹریجڈی کے بعد کتنا مشکل وقت گزارا ہوگا ورنہ اس کے گھر والے چون سال کے عمر رسیدہ شخص کے ساتھ کبھی اس کی شادی پہ راضی نہ ہوتے۔

نکاح کے بعد اس کے دل میں موجود بے نام سے جذبے کو نام بھی مل گیا تو دل خود بہ خود ہی اس کی طرف مائل ہونے لگا۔

شادی کی اولین رات اسے دلہناپے کے بھرپور روپ میں محوِ خواب دیکھ کر شیر افگن کے ان چھوئے ریشمی خواب جاگ پڑے۔ اس کا خیال تھا وہ اس کے جذبات کی پذیرائی کرے گی اس کی ممنون ہوگی۔

وہ اس کی پور پور کو محبتوں میں بھگونے کا خواب لے کر اس کے قریب آیا تھا۔ مگر کیا ہوا۔

حوریہ کو ایک محبت کرنے والے شوہر اور تحفظ کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ اسے ڈاکٹر آفتاب کے عفریت سے بچنے کے لیے عارضی سہارا درکار تھا۔ جو شیر افگن کی صورت میں مل چکا تھا۔

۞

وقتِ رخصت حوریہ بار بار آنسو صاف کر رہی تھی۔ یاسمین نے جاتے وقت اسے پھر سینے سے چمٹایا تو بے اختیار سسکیاں اس کے لبوں کی قید سے آزاد ہو گئیں۔ کیسا سکون ملتا تھا۔ کیسا ممتا بھرا احساس تھا ان کی آغوش میں۔ اس کا دل الگ ہونے کو چاہ ہی نہیں رہا تھا۔ کیسی اپنی اپنی

سی خوشبو آ رہی تھی ان کے وجود سے۔ عبداللہ ملک سے بھی ملتے وقت اس کی یہی حالت ہوئی۔

عادل اور ایان بھی بہت اداس تھے۔

"آپ نے بھائی کے ساتھ لازمی آنا ہے یو کے میں آپ کو پورے ملک کی سیر کراؤں گا۔" ایان نے اس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں لے کر دبایا۔

"شیر افگن! حوریہ کا بہت خیال رکھنا ہے، ہمیں شکایت کا موقع نہ ملے۔" یاسمین نے جاتے وقت پھر یاد دہانی کرائی تو ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آ گئی۔

ایئرپورٹ سے مما پپا کو چھوڑنے کے بعد شیر افگن اسے ساتھ لے کر چھوٹے چچا کی طرف آ گیا۔ ساتھ ملک شجاعت بھی تھے۔

حوریہ بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دل یہاں رکنے کو نہیں کر رہا تھا۔ وہ فوراً سے بیشتر یہاں سے جانا چاہتی تھی۔ مگر رکنا مجبوری تھی۔

ایک رات گزار کر وہ دوبارہ چکوال کی طرف عازمِ سفر ہوئے۔

ملک شجاعت لاہور میں تھے انہوں نے کہا تھا کہ اب وہ باقی زندگی گاؤں میں ہی گزاریں گے۔

۞

شیر افگن کی شادی کے لیے لی جانے والی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اس نے دادا جان کو کال کر کے کہا وہ انہیں لینے آ رہا ہے۔ وہ واپسی کے لیے تیار رہیں۔

وہ صبح ہی تیار ہو کر گاڑی لے کر چلا گیا تھا۔ حوریہ کو اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ پریشان سی تھی جانے کہاں گیا ہے۔

ایک بار اس کے جی میں آئی کہ پوچھے آپ کہاں ہیں۔ فون اس کے پاس موجود تھا۔ وہ کال کر سکتی تھی۔ ایک دو بار اس نے فون کرنے کی سوچی مگر پھر کچھ سوچ کر ارادہ بدل دیا۔

گھر میں کام کرنے والی ملازم عورتوں سے اس نے پچھلا احاطہ صاف کروایا جو درختوں سے گرنے والے پتوں سے اٹا ہوا تھا۔

گھر بہت بڑا تھا۔ دو مرد ملازم تھے، دو عورتیں تھیں، ایک چھوٹا لڑکا تھا اور ایک ڈرائیور تھا۔ عبداللہ ملک جانے سے پہلے یہ سب انتظام کر گئے تھے۔

حوریہ نے یاسمین اور عبداللہ ملک کے جانے کے بعد اوپر شیر افگن کے کمرے کے

ساتھ ہی اپنے لیے بھی ایک کمرہ سیٹ کر کے ضروری چیزیں وہاں پہنچا دی تھیں۔ اب کوئی ڈر نہیں تھا کہ کسی کو پتہ چل جائے گا۔ ویسے بھی ایک دن اسے یہاں سے چلے ہی جانا تھا۔ پھر جو بھی جو کچھ بھی کہتا، اسے پروا نہیں تھی۔

رات تک شیر افگن دادا جان کو لے کر گھر پہنچ چکا تھا۔ وہ حوریہ سے بہت پیار اور محبت سے ملے۔

شیر افگن نے ان سے کہا تھا کہ حوریہ آپ کے ساتھ گاؤں والے گھر میں ہی رہنا چاہتی ہے اِسے فطرت سے قریب تر رہنا اچھا لگتا ہے۔

ملک شجاعت خود تنہائی سے اکتا کر چھوٹے بیٹے کے پاس لاہور رہ رہے تھے۔ تین سال پہلے جب انجائنا کا اٹیک ہوا تو بہو بیٹے انہیں لاہور لے آئے۔ اس کے بعد وہ وقتاً فوقتاً گاؤں آتے رہے مگر یہ وہم وگماں میں نہیں تھا کہ وہ دوبارہ گاؤں والے گھر میں رہائش اختیار کر سکیں گے۔ حوریہ نے ان کی خواہش پوری کر دی تھی۔

شیر افگن اگلے دن اتوار کو لاہور واپس آ گیا۔

❁

شیر افگن، عثمان علوی کے آفس میں بیٹھا ہوا تھا جو اس کا بہت اچھا دوست تھا۔

اسپیشل پولیس سروسز میں بہت حساس عہدے پہ کام کر رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر آفتاب کے معاملے میں اس سے بات کرنے آیا تھا۔ ساری بات سننے کے بعد اس نے کہا کہ ”فکر مت کرو، میں ساری معلومات حاصل کر کے تمہیں بتاؤں گا۔“

عثمان کی قابلیت پہ اسے بھروسہ تھا کہ وہ اس کی مطلوبہ معلومات اسے مہیا کر دے گا۔ اس کے بعد سوچنا تھا کہ کیا کیا جائے۔

حوریہ نے ڈاکٹر آفتاب کے رشتے، اپنے انکار اور پھر اس کی دھمکیوں کے بارے میں تو بتا دیا تھا مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ ڈاکٹر آفتاب نے اس سے پیسوں کی ڈیمانڈ کی ہے اور نہ یہ کہ عین شادی سے کچھ روز پہلے اس نے حیدر بھائی سے پیسے مانگے تھے۔ نہ اس نے یہ بتایا کہ میرے نام کچھ زمین اور جائیداد ہے۔

اپنے تئیں اس نے یہ بات چھپا کر عقل مندی کی تھی۔ کیونکہ اب اسے کسی پہ اعتبار نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹر آفتاب کی ڈیمانڈ نے باور کرا دیا تھا کہ پیسہ اس کائنات کی بہت بڑی حقیقت

ہے اس کے بغیر وہ بالکل زیرو اور بے وقعت ہے۔

عافیہ بھابی کا انداز اس نے کتنا جلدی بدلتا دیکھا تھا۔ وہ زور و شور سے اسے بھابی بنانا چاہ رہی تھیں حالانکہ پہلے ان ہی کا کہنا تھا کہ تمہیں کوئی کنوارا لڑکا قبول نہیں کرے گا پھر وہ خود ہی اپنے کنوارے بھائی کے لیے اسے راضی کرنا چاہ رہی تھی۔ اسے پیسے کا کرشمہ ہی کہا جا سکتا تھا۔

شیر افگن کے گھر سے جانے کے بعد اسے یہ پیسہ ہی تحفظ دے سکتا تھا تب ہی تو اس نے یہ بات شیر افگن سے بھی چھپائی تھی۔ آخر باقی زندگی بھی تو اسے گزارنی تھی۔

کتنا اچھا ہوتا وہ بھی عام سی لڑکی کی طرح باقی دن بھی یہاں گزار سکتی مگر یہاں بھی گزشتہ زندگی کی تلخیاں آڑے آ رہی تھیں۔ اگر ان باتوں کی اہمیت نہ ہوتی تو حیدر بھائی شیر افگن سے سب کیوں چھپاتے۔

وہ اپنی آنکھوں کو سختی سے اس کے خواب دیکھنے سے روک چکی تھی۔ وگرنہ دل تو چاہتا تھا۔ اس کے شانوں پہ سر رکھ کر تمام آنسو بہا دے۔ اپنی تمام پریشانیاں اس کے سپرد کر کے سکون سے سو جائے۔

مگر خواہشوں پر کس کا زور چلا ہے۔ اپنی سوچوں کی شوریدہ سری سے وہ خود بھی ڈر ڈر جاتی۔ وہ اونچا لمبا کڑیل مضبوط سا نوجوان نظر انداز کیے جانے کے قابل تو نہیں تھا۔ وہ سامنے آتا تو حوریہ دیکھنے سے بھی اجتناب کرتی۔

وہ نہ ہوتا تو خواہشیں اسے پکارتیں۔ خوابوں کی وادی میں اس کے پیچھے چلتے چلتے وہ تھک کر نڈھال ہو جاتی۔

اس نے حوریہ کے خیالات اور ارادے جان کر اس کے ساتھ زبردستی کوئی تعلق بنانے سے سختی سے خود کو روکا تھا۔ کیا تھا وہ، کوئی فرشتہ، کوئی مسیحا، انسان یا پھر کچھ اور......

وہ ابھی تک اسے جان نہیں پائی تھی۔

کہیں تم اپنی قسمت کا لکھا تبدیل کر لیتے
تو شاید ہم بھی اپنا راستہ تبدیل کر لیتے
جدائی بھی نہ ہوتی زندگی سہل بھی ہو جاتی
جو ہم اک دوسرے کا مسئلہ تبدیل کر لیتے

❁

آج موسم خاصا سرد تھا۔ شمال سے آنے والی سرد ہواؤں نے پورے ماحول کو یخ بستہ کر دیا تھا۔

ثمینہ نے دادا جان کے کمرے کا آتش دان بہت سی لکڑیاں جلا کر روشن کر دیا تھا۔
حوریہ ان کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی وہ گرم گرم چائے خود بنا کر لائی تھی۔
دادا جان، شیر افگن کو یاد کر رہے تھے۔ حوریہ کا دل دھڑک اٹھا۔

پندرہ دن سے زیادہ ہو گئے تھے اسے لاہور گئے ہوئے۔ اس دوران اس نے حوریہ سے کس طرح کا بھی رابطہ نہیں کیا تھا۔ ہاں دادا جان کو وہ روزانہ کال کرتا۔ گیٹ پہ گاڑی کا ہارن مسلسل بج رہا تھا۔

آنے والا شیر افگن کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ہارن اس کی گاڑی کا تھا۔ ٹھیک دو منٹ بعد وہ ان کے سامنے تھا۔

ملک شجاعت نے لمبے چوڑے شیر افگن کو سینے لگا لیا۔

بے تابی سے اس کا ماتھا چوما۔ حوریہ نے حسرت سے ان دونوں جو دیکھا۔

وہ دادا جان سے ملنے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہو۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" حوریہ نے اس کی طرف سے نظر ہٹالی تھی۔

دادا جان اس سے شکوے کر رہے تھے۔

"اتنے دن لگا دیے اس بار۔"

"دادا جان! جاب میں یہ سب چلتا ہی ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔

"حوریہ بھی بہت پریشان رہی۔"

"کیوں؟" اس کی نگاہ اچانک دادا جان کے پہلو میں بیٹھی سر جھکائے حوریہ کی طرف اٹھی۔

"کیوں کے کچھ لگتے...... شادی کے فوراً بعد اسے چھوڑ کر چلے گئے ہو، پریشان نہیں ہو گی تو خوش ہو گی کیا......" انہوں نے اسے تقریباً ڈانٹ دیا۔

وہ شرمندہ ہونے لگی۔

"ان کی اپنی مرضی تھی گاؤں میں رہنے کی۔ میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔" اس نے اپنی طرف سے ان کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی اور کافی کامیاب بھی رہا۔

دادا جان نے حوریہ کو اس کے لیے کھانے کا انتظام کرنے کو کہا۔ وہ جا کر ثمینہ سے کہہ آئی۔ پھر ثمینہ نے ہی کھانا لگا کر شیر افگن کو بلایا۔

کھانے کے بعد اسے کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ وہ حوریہ خود بنا کر لائی کیونکہ ثمینہ کو بنانا نہیں آتی تھی۔

جونہی اس نے کافی پی کر کپ رکھا، دادا جان نے اپنی طرف سے گڈ نائٹ کہہ دیا۔

"میں سونے لگا ہوں، تم دونوں بھی جاؤ اور حوریہ! تم اوپر جاؤ۔ جاتے ہوئے دروازہ بند کر جانا۔"

انہوں نے بیڈ پر دراز ہو کر کمبل ٹانگوں پہ ڈال لیا۔ یہ ان کی طرف سے اعلان تھا کہ اب تم لوگ بھی جاؤ۔ انہوں نے آج حوریہ کو بھی اوپر جانے کو کہا تھا۔ ان کی حد درجہ توجہ پہ وہ نروس ہو رہی تھی۔

شیر افگن تو تھکا ہوا تھا۔ بیڈ روم میں آ کر اس نے پہلے شاور لیا پھر چینج کیا۔ وہ بال خشک کرتا باتھ روم سے باہر نکل رہا تھا جب اس نے نیلے رنگ کے آنچل کی ہلکی سی جھلک دیکھی۔ حوریہ اس کے کمرے میں دودھ رکھنے آئی تھی اور پھر ان ہی قدموں پلٹ گئی تھی۔ وہ ساتھ والے بیڈ روم میں تھی۔

نو بج گئے تھے۔ وہ ابھی تک بیدار نہیں ہوا تھا۔ اس کے بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ دادا جان صبح کے جاگے اس کے انتظار میں تھے، وہ اٹھے تو ناشتہ اکٹھے کریں۔ حوریہ آٹھ بجے نیچے آ گئی تھی۔ ثمینہ ناشتے کا اہتمام کر رہی تھی۔

دادا جان سے رہا نہیں گیا آخر۔ حوریہ سے کہا کہ "دیکھو شیر افگن جاگ گیا ہے کہ نہیں، اگر نہیں جاگا تو اسے جگا کر لے آؤ۔"

ان کا حکم وہ ٹال نہیں سکتی تھی۔ مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق اس کے بیڈ روم کے دروازے پہ پہنچ گئی۔ اس نے دستک دینے کے لیے دروازے پہ ہاتھ مارا۔ دروازہ لاک نہیں تھا کھلتا چلا گیا۔

وہ نہا کر بالوں میں برش کر رہا تھا۔ آہٹ پہ اسے دیکھ کر چونکا۔

حوریہ نے نگاہ چرائی۔ اس نے صرف پینٹ پہنی ہوئی تھی شرٹ بیڈ پر ہینگر میں تھی۔

"دادا جان آپ کو بلا رہے ہیں، کہہ رہے ہیں اکٹھے ناشتہ کریں گے۔" وہ جلدی

جلدی بول کر پلٹی۔

"بات سنیں۔" اس نے جاتی حوریہ کو پکارا۔ وہ اپنی شرٹ اور پینٹ کی پاکٹ ٹٹول رہا تھا۔

"جی!" وہ پاس نہیں آئی دور سے ہی دیکھتی رہی۔

والٹ سائیڈ ٹیبل پہ پڑا تھا۔ یاد آنے پہ اس نے وہاں سے اٹھایا۔

"حوریہ! یہ آپ رکھ لیں ضرورت پڑ جاتی ہے۔" خاموش کھڑی حوریہ کے ہاتھ میں اس نے تقریباً زبردستی کچھ نوٹ تھمائے۔ وہ اس کے بہت قریب کھڑا تھا۔

"اگر اور ضرورت ہو تو بتا دیجئے گا کیونکہ جب تک آپ یہاں ہیں، کلی طور پر میری ذمہ داری ہیں۔"

اس نے حوریہ کے پاس سے گزر کر بیڈ سے اپنی شرٹ اٹھائی۔ اس دوران حوریہ سے اس کا کندھا نہ چاہتے ہوئے بھی ٹچ ہوا تھا۔ وہ عین سامنے کھڑی تھی۔ وہ دوبارہ باتھ روم میں چلا گیا۔

شیر افگن کے مردانہ لمس کو پہلی بار اس نے شدت سے محسوس کیا۔

❁

عثمان کے آفس میں وہ اس کے سامنے موجود تھا۔ عثمان نے ہی بلوایا تھا کہ ڈاکٹر آفتاب اور اس فاؤنڈیشن کے بارے میں میرے پاس بڑی اہم معلومات ہیں۔ "تم آؤ تو ڈسکس کریں۔" آفس سے فارغ ہونے کے بعد وہ اسی کی طرف چلا آیا۔

عثمان اسی کے انتظار میں تھا۔ اس کے پاس بڑے چونکا دینے والے انکشافات تھے۔

"بھئی یہ ڈاکٹر آفتاب تو اعلیٰ درجہ کا فراڈیہ نکلا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب فاؤنڈیشن کے تحت چلنے والے پروجیکٹ میں سے ایک "آفتاب سرجیکل اینڈ میڈیکل کمپلکس" ہے اور ایک بہت اہم "نیویارک چائنا ہسپتال" ہے جس بارے میں ڈاکٹر موصوف کا دعویٰ تھا کہ یہ پاکستان میں اپنی نوعیت کا واحد ہسپتال ہے۔ اور یہاں چائنیز طریقۂ علاج مریضوں پہ استعمال کیا جاتا ہے۔ لاہور میں یہ ہاسپٹل قائم ہوئے چھ سال ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے لاہور میں ڈاکٹر آفتاب کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن یہاں قدم جمانے کے ساتھ ہی اس نے اپنے دیگر پروجیکٹ بھی اسٹارٹ کر دیے۔

یوں اس کی شہرت بڑھتی گئی۔ کمزور عقیدے والے تو اسے اللہ والا سمجھنے لگتے۔ کیونکہ اپنی باری آنے پہ جو مریض بھی اندر جاتا ڈاکٹر موصوف کو قرآن پڑھتا ہوا ہی دیکھتا۔ چرب زبانی اسی پہ ختم تھی۔

ہر قسم کے مریضوں کو وہ فوراً ٹیسٹ کے لیے بھیج دیتا۔ اور کم پیسوں کے لالچ میں مریض ٹیسٹ کرا لیتے۔ غریب مریضوں سے ڈاکٹر صاحب کم پیسے بھی لے لیتے۔ جو ایڈمٹ ہوتا۔ اسے کھانا، میڈیسن سب کچھ ہاسپٹل سے مل جاتا۔ مریضوں کی تیماری کے لیے خوبصورت نرسیں چوبیس گھنٹے دستیاب ہوتیں۔ کچھ تو مستقل ہاسپٹل میں ہی رہ رہی تھیں۔ ڈاکٹر آفتاب کے آفس کے پیچھے وی آئی پی روم کے نام سے ایک وارڈ ہے۔ نرسز اور ڈاکٹر آفتاب کی خوبرو سیکریٹری بھی وہیں رہتے تھے۔

ڈاکٹر آفتاب جس بات کے لیے مشہور تھا، وہ یہ تھی کہ وہ دس دن میں ہر مرض ہر بیماری کے علاج کا دعویٰ دار تھا۔ ہر مریض جب ایڈمٹ ہوتا تو اس کے جسم کے سارے ٹیسٹ کئے جاتے پھر بتایا جاتا کہ تمہیں فلاں فلاں بیماری ہے۔ دس دن کے بعد جب ڈسچارج کیا جاتا تو از سر نو ٹیسٹ کروائے جاتے۔ یہ ٹیسٹ ڈاکٹر شعیب کی زیرِ نگرانی کئے جاتے جو آرمی کا سابقہ کیپٹن تھا۔

پھر ان ٹیسٹ سے پتہ چل جاتا کہ مریض کو اب وہ بیماری یا بیماریاں نہیں ہیں جس کا شکار ہو کر وہ یہاں آیا تھا۔ پھر ان سے ایک فائل میں ان کے خیالات لکھوائے جاتے۔ ظاہر ہے وہ اچھے ہی ہوتے۔

یوں مریض خوش خوش گھر جاتا کہ وہ مکمل صحت یاب ہو کر جا رہا ہے۔ اس کے بعد مریض چیک اپ کے لیے بھی آتا جس میں ہر چکر میں پانچ سے سات ہزار ایک ماہ کی دوائی کے طور پہ وصول کئے جاتے۔ ایک مریض کے ریفرنس سے اور بھی مریض آ جاتے یوں ہسپتال کا کام زور شور سے چل جاتا تھا۔

ہومیو پیتھک ڈاکٹر نے آپریشن تھیٹر بھی بنایا ہوا تھا۔ جہاں ہر طرح کے آپریشن کئے جاتے اور بھاری فیس وصول کی جاتی۔ یہ ڈاکٹر ہومیو پیتھی، ایلو پیتھی، آکو پنکچر کے ساتھ قرآنک تھراپی کے ذریعے بھی علاج کا دعویدار ہے۔

ہاسپٹل کے ساتھ ڈاکٹر آفتاب نے ایک این جی او بھی بنائی ہوئی ہے اور بے سہارا یتیم بچوں اور عورتوں کے لیے ایک ادارہ بھی ہے جس کے بارے میں بڑے بڑے دعوے کئے جاتے ہیں۔ خیر یہ سب تو ہے ہی۔ ڈاکٹر آفتاب کا بیک گراؤنڈ بہت انٹرسٹنگ ہے۔

لاہور میں جو اس کے بارے میں سامنے ہے، وہی پتہ ہے سب کو لیکن لاہور سے پہلے وہ کہاں تھا کسی کو نہیں پتہ۔ اس نے کہا تو یہی کہ وہ ملک سے باہر اپنے فرائض سرانجام دے

رہا تھا۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

ڈاکٹر آفتاب لاہور آنے سے پہلے پنڈی اڈیالہ روڈ گلشن آباد میں اپنا ہی دھندہ چلا رہا.
تھا۔ وہاں اس سے کچھ بے احتیاطی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اس کا پول کھلنے کے قریب تھا سو وہ
وہاں سے ہسپتال ختم کر کے لاہور میں آ گیا، یہاں بھی اس کی یہی سرگرمیاں تھیں۔

ڈاکٹر آفتاب نے پوش علاقے میں گھر لیا جہاں ماڈرن اونچے گھرانوں کے لڑکے
لڑکیوں کی آمد و رفت دن رات جاری رہتی۔ عشق کے مارے لڑکے یہ اونچے گھرانوں کے بچے
اپنا وقت رنگین گزارنے کے عوض ٹھیک ٹھاک پیسہ ادا کرتے۔

ہسپتال میں کام کرنے والی تقریباً سب لڑکیاں نہایت غریب گھرانوں سے تعلق رکھتی
تھیں۔ ڈاکٹر آفتاب نے چن چن کر خوبصورت لڑکیوں کو رکھا تھا۔ یہ لڑکیاں بظاہر مریضوں کی
خدمت کے لیے تھیں مگر درحقیقت یہ کونسی خدمات سرانجام دیتیں سب کو ہی معلوم ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر آفتاب نے شادی کے نام بے شمار مجبور عورتوں کا پیسہ کھایا۔ ان کی جائیداد
ہضم کر ڈالی۔

آفتاب نے اپنے اغواء کا ڈرامہ رچا کر تاوان میں خاصی تگڑی رقم وصول کی۔

ایسی بے شمار عورتوں سے اس نے شادی کی۔ انسانیت کے سہارے کے نام پر
انسانوں کے مسیحا کے نام سے اس دو چہروں والے ڈاکٹر نے عورتوں کے ساتھ کوئی اچھا سلوک
نہیں کیا۔ شادی اس کے لیے دوسرے الفاظ میں آمدنی کا ذریعہ تھی۔

ڈاکٹر آفتاب کا اپنا بیٹا اور بھائی سمیت اس کی دونوں بیٹیاں بھی اس مذموم کام میں
اس کے ساتھ رہیں۔

ڈاکٹر آفتاب کا بیٹا جعلی ڈاکٹر ہے اور خیر سے وہ بھی باپ کے نقش قدم پہ چل رہا
ہے۔ ایک بیٹی بھی جعلی ڈاکٹر ہے۔ لیکن لاہور آنے کے بعد اس نے ہسپتال جوائن نہیں کیا......"

شیر افگن پوری دلچسپی سے سن رہا تھا۔

"ابھی تازہ صورتِ حال سنو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔ ڈاکٹر آفتاب نے ضرورت ہے
کا اشتہار دیا تھا اسے ہسپتال کے لیے نرس کی ضرورت تھی۔ خیر نرس اس نے منتخب کر لی۔

کچھ ہی دنوں میں اس نرس کو یہاں جاری جعلی سرگرمیوں کا علم ہو گیا یہ نرس کوالیفائیڈ
تھی۔ اس نے کچھ بے ایمانیاں پکڑ لیں۔ یہاں ٹیسٹ کے بعد غلط جعلی رپورٹس بنائی جاتیں۔

اسے شک ہوا۔ اس نے اپنی ایک مریض رشتہ دار کو ڈاکٹر آفتاب کے پاس جانے کو کہا، نرس بیماری کی نوعیت سے اچھی طرح آگاہ تھی۔ وہاں جانے کے بعد ان خاتون کے چھ ٹیسٹ کئے گئے اور انہیں دنیا جہاں کی بیماریاں بتائی گئیں۔

نرس کو پوری طرح یقین ہو گیا کہ یہاں مسیحائی کی آڑ میں اور کچھ ہو رہا ہے۔ حقیقت کھلنے پہ اس نے خاموشی سے جاب چھوڑ دی۔

اس نے اپنی ایک دوست سے ہسپتال کے بارے میں ذکر کیا۔ اتفاق سے اس دوست کی والدہ نے بھی ہزاروں روپے لگا کر ڈاکٹر آفتاب سے علاج کروایا تھا۔ بات نکلتے نکلتے ایک صحافی تک پہنچ گئی۔ اس سے اہلِ محلہ نے ڈاکٹر آفتاب کے بارے میں کچھ شکایتیں کی تھیں وہ بھی اسی علاقے کا رہنے والا تھا جہاں ہسپتال تھا۔

وہ صحافی اپنی ٹیم اور کیمرہ مین کے ساتھ ہسپتال پہنچ گیا۔ وہاں ڈاکٹر آفتاب نے پہلے دھمکیاں دیں پھر غنڈے بلوا لیے پھر آخر میں رشوت کی پیشکش کی۔ لیکن اس نے یہ چونکا دینے والا سچ ایک اخبار کو دے دیا۔

اپنی رپورٹ میں اس نے چشم کشا حقائق کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر آفتاب نے اپنے تعلقات کام میں لانے چاہے مگر بات بہت اوپر تک چلی گئی اور دراز رسی کس دی گئی۔ ڈاکٹر آفتاب اب جیل میں ہے۔"

عثمان علوی نے اخبارات اس کے سامنے رکھے جس میں ڈاکٹر آفتاب کے کالے کرتوتوں کا ذکر کیا تھا۔

"اور ہاں ڈاکٹر موصوف آرمی میں ڈاکٹر نہیں تھے اسے ناپسندیدہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی بنا پر آرمی سے نکال دیا گیا تھا۔ یہ کچھ عرصہ پاکستان سے غائب رہا۔ واپس آیا تو ڈگریوں کی قطار اپنے نام کے ساتھ لگالی تھی جو کہ ظاہر ہے جعلی اور خود ساختہ تھی ویسے ایک بات ماننے کی ہے بندہ بہت جینئس ہے۔ اتنے سال لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتا رہا۔ اس نے لوگوں کے سامنے اپنی ایک ہی شادی ظاہر کی تھی، ابھی بعد میں اس حقیقت کے بعد اس کی کئی بیویاں سامنے آئی ہیں جو اسی ایک سانپ کی ڈسی ہوئی ہیں۔ سنا ہے اب ڈاکٹر آفتاب ایک کم عمر لڑکی سے شادی کے چکر میں تھا وہ لڑکی بھی صاحب جائیداد اور تعلیم یافتہ تھی ورنہ اس سے پہلے اس نے جتنی بھی شادیاں کیں سب بیویاں واجبی تعلیمی منظر کی حامل تھیں اس کی سیکریٹری جو اس

کی بیوی بھی ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ڈاکٹر اس لڑکی سے شادی کرے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ڈاکٹر اس کو چھوڑ نہیں پائے گا۔ اس نے دھمکی دی اگر ڈاکٹر نے اس لڑکی سے شادی کی تو وہ سارا بھانڈا پھوڑ دے گی۔ مجبوراً ڈاکٹر کو شادی سے پہلے پیسوں کا مطالبہ کرنا پڑا اور وہ لڑکی بچ گئی۔ بہت بڑا جھوٹا ہے یہ شخص۔ اتنا کافی ہے یا کچھ اور بھی بتاؤں اس جعلی ڈاکٹر کے بارے میں.....؟" عثمان نے اس کی دلچسپی محسوس کر لی تھی۔

"نہیں جو مجھے معلوم ہوا ہے وہ کافی ہے۔" ایک دبا دبا جوش اس کے چہرے سے جھانک رہا تھا۔ عثمان سے تمام اخبارات اس نے لے لیے۔

حوریہ کو سنانے کے لیے اس کے پاس بہت بڑی خوشخبری تھی۔ جس ڈاکٹر آفتاب کی دھمکیوں سے گھبرا کر اس نے اپنی نسوانی انا کو داؤ پر لگایا تھا اپنے مزاج سے ہٹ کر بے باکی کا مظاہرہ کیا تھا اب اس شخص سے اسے ڈرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا اور شاید اس کے ساتھ ساتھ ان کی مجبوری کا رشتہ بھی۔

سوچتے ہوئے وہ معمول سے زیادہ افسردہ تھا۔

❁

دادا جان اسے سامنے پا کر بہت خوش ہوئے۔ وہ ابھی ابھی گھر پہنچا تھا۔

حوریہ تیار ہو رہی تھی۔ ساتھ والے گاؤں میں ملک شجاعت کے دوست کے پوتے کی مہندی تھی، انہیں ادھر ہی جانا تھا۔ وہ کہیں آتی جاتی نہیں تھی۔ دادا جان نے ہی اسے ساتھ لے جانے پہ راضی کیا تھا۔

اب شیر افگن آ گیا تھا تو وہ اسے بھی ساتھ لے جانے کو کہہ رہے تھے۔ وہ تیار ہو کر دادا جان کی طرف آئی تو اسے خلاف توقع سامنے پا کر ٹھٹک سی گئی۔ شیر افگن نے خود ہی خیریت دریافت کی۔

بلیک کلر کی اوپن لانگ شرٹ اور چوڑی دار پائجامہ میں ملبوس وہ بڑی نکھری نکھری سے نظر آ رہی تھی۔ دادا جان نے شیر افگن کو بھی تیار ہونے کو کہا۔

وہاں پہنچنے کے بعد دادا جان تو تقریباً گھنٹہ ہی وہاں رکے اور پھر شیر افگن سے کہا کہ مجھے گھر چھوڑ آؤ۔ ابھی فنکشن چل رہا ہے۔ حوریہ کو بعد میں آ کر لے جانا۔ وہ انہیں گھر چھوڑ کر دوبارہ گیا۔ رات کافی زیادہ ہو گئی تھی۔ حوریہ اس کے پیغام بھیجے جانے پہ باہر آئی۔

وہ گاڑی کا اگلا دروازہ کھولے اسی کا منتظر تھا۔ وہ آگے بیٹھتے ہوئے جھجک سی گئی۔

باہر رات کا خاموش سناٹا اپنے اندر جانے کون کون سی داستانیں سمیٹے ہوئے تھے۔ خاموشی سے اکتا کر شیر افگن نے میوزک آن کر دیا۔ یہ تو طے تھا وہ اسے خود سے مخاطب کرنے والی نہیں تھی۔

تو ہی حقیقت خواب تو
دریا تو ہی پیاس تو
تو ہی دل کی بے قراری تو ہی سکوں
ہم سفر تو ہم قدم تو ہم نوا میرا

خاموشی کا طلسم بڑی سچائی بیان کر رہا تھا۔ یہ لڑکی اس کے دل میں چھپے خالص جذبات کو کیوں نہیں سمجھ رہی تھی۔ شیر افگن نے بھی کوئی بات نہیں کی۔

دادا جان سو چکے تھے۔ اوپر پہنچ کر اس نے پہلے کپڑے بدلے پھر کھلے بالوں کی چوٹی بنائی۔ بیڈ کی پائنتی پڑا کمبل کھول کر اس نے جونہی اوڑھا، باہر بیڈ روم کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" وہ بند دروازے کے پاس جا کر آہستہ آواز میں بولی۔ الجھن میں تھی کہ کون ہے۔

"حوریہ! میں ہوں دروازہ کھولیں۔" شیر افگن تھا۔

پہلے اس کے جی میں آیا کہ نہ کھولے شاید وہ ایسے ویسے ارادے کی نیت سے آیا ہو مگر دماغ نے اس کی یہ دلیل اسی وقت مسترد کر دی سو اس نے دروازہ کھول دیا۔

"یہ لیں کچھ نیوز پیپر ہیں، آپ کے لیے خوشخبری ہے۔ صبح آپ سے تفصیل سے بات کروں گا۔" وہ وہیں سے اخبارات اس کے ہاتھ میں تھما کر پلٹ گیا۔ وہ دروازہ لاک کر کے اندر آئی۔

اس اخبار میں اس کے لیے زندگی کی نوید تھی۔ اس نے اخبار کھولا۔ جلی حروف میں چونکا دینے والی سرخیاں تھیں۔

جعلی ڈاکٹر آفتاب لوگوں کی زندگی سے کھیل رہا ہے۔

انسان کے روپ میں بھیڑیا۔

ڈاکٹر آفتاب کا جعلی ڈاکٹر بیٹا ہسپتال میں کیا کرتا ہے۔

"خوبرو لڑکیاں، ڈاکٹر آفتاب کے ہسپتال میں کیا کرتی ہیں۔

ہومیو ڈاکٹر نے کس قانون کی رو سے اپنے ہاسپٹل میں آپریشن تھیٹر بنا رکھا ہے وہ کونسا ایس ایس پی ہے جو اس کی ایک کال پہ پانچ منٹ میں آ جاتا ہے۔ڈاکٹر آفتاب کے غنڈوں نے صحافی کو پیٹ ڈالا۔رشوت کی پیشکش۔

ڈاکٹر کی خوبرو سیکریٹری چھ ماہ کے دوران ایک بار بھی گھر نہیں گئی کیوں؟ ان سارے جوابوں کی تفصیل اندرونی صفحات میں تھی۔

جوں جوں وہ پڑھتی گئی،۔اس کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا۔

اب تو اس کی آنکھوں سے نیند روٹھ گئی تھی۔وہ بے چینی سے صبح کا انتظار کر رہی تھی کہ کب شیر افگن بیدار ہوتا ہے اور اس سے بات ہوتی ہے۔

پہلے یک بار جی میں آئی اس کے کمرے میں جا کر ابھی بات کر لے پھر خود ہی اپنے خیال کو رد کر دیا۔

سرما کا چاند کھلی کھڑکی سے اندر جھانک رہا تھا۔اس نے اٹھ کر کھڑکی بند کرنی چاہی تو ٹھٹک گئی۔باہر ٹیرس پہ شیر افگن کھڑا تھا۔

''یہ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے کھڑکی بند کر کے پردے گرا دیے۔

بے آواز طریقے سے اس نے ٹیرس کی سمت کھلنے والا دروازہ کھولا۔وہ مغربی دیوار پہ دونوں بازو ٹکائے آگے جھانک رہا تھا۔آہٹ پہ اسے دیکھ کر چونکا۔

''آپ بھی جاگ رہی ہیں۔'' حوریہ کو اس کی آواز معمول سے زیادہ بھاری اور گہری سی محسوس ہوئی جس سے ایک اضطراب اور بے کلی سی جھانک رہی تھی۔

''مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔'' اس سے قدرے فاصلے پہ وہ بھی ریلنگ پہ بازو ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

''تمہاری نیند نہ آنے کی وجہ مجھے پتہ ہے۔'' وہ دل میں سوچ ہی سکا۔

''دادا جان کل لاہور جا رہے ہیں۔'' شیر افگن نے بے تاثر لہجے میں بتایا۔

''کیوں؟''

''میرا ٹرانسفر اسلام آباد میں ہو گیا ہے سو وہ چھوٹے چچا کے پاس جا رہے ہیں۔'' اس نے اب سگریٹ سلگا لیا تھا۔

اس ٹھنڈ میں بھی وہ ہلکی سی نائٹ شرٹ پہنے ہوئے تھا،حوریہ کو اسے دیکھ کر خود

سردی لگنے لگی۔

''آپ جا کر سو جائیں،اطمینان سے کل بات ہو گی جو آپ کرنا چاہ رہی ہیں۔'' وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔

حوریہ کو اپنی توہین سی محسوس ہوئی جیسے وہ اسے یہاں سے بھگانا چاہ رہا ہے۔پھر اس نے کوئی بات نہیں کی،اپنے کمرے میں آ گئی۔

باہر شیر افگن ٹیرس پہ پڑی کرسیوں میں سے ایک گھسیٹ کر بیٹھ چکا تھا۔دوسری پہ اس کی ٹانگیں دھری تھیں۔

دادا جان کل لاہور جا رہے تھے۔اس نے اسلام آباد ٹرانسفر کرا لی تھی۔دادا جان سمیت سب کو اس نے یہی کہا تھا کہ وہ حوریہ کو اپنے ساتھ لے کر جائے گا۔

شروع میں پریشانی تو ہونی تھی سب کے سوالوں کا سامنا کرنا تھا۔مما پپا کی ناراضی سہنی تھی۔کتنا حیران ہوں گے سب یہ سن کر کہ حوریہ اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے اس کی محبت من چاہی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے شادی کے محض چار ماہ بعد...... ہاہاہاہا......اس کے اندر کوئی ہنسا۔

مما پاپا دادا جان کو وہ کیسے حقیقت بتا پائے گا کہ وہ قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے۔جس لڑکی کو وہ مظلوم و بے بس اور لاچار سمجھتا تھا۔اسے سرے سے کسی تحفظ کی ضرورت ہی نہیں تھی۔اسے عارضی طور پر ایک سہارے کی ضرورت تھی اور اب اس کی ضرورت پوری ہو گئی ہے اور اس کا کوئی کردار بھی نہیں ہے اس ڈرامے میں۔سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں غصے سے دہکنے لگیں۔

۞

دادا جان کو ڈرائیور لاہور چھوڑ آیا تھا۔

جانے سے پہلے حوریہ کے بارے میں انہوں نے شیر افگن کو ڈھیروں ہدایات دی تھیں۔سن کر وہ دل میں خوب ہنسا۔

''دادا جان! ان محترمہ کو ہماری محبت،توجہ اور پیار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے دل میں تنفر سے سوچا۔

۞

وہ بول رہا تھا اور حوریہ صرف سن رہی تھی۔چپ چاپ بے حس و حرکت کسی بت کی طرح ساکت۔

"ڈاکٹر آفتاب کی تمام حقیقت آپ پر کھل گئی ہے، شکر کریں کہ اس شخص سے بچ گئی ہیں۔ خود کو وہ ناقابلِ تسخیر تصور کرتا تھا مگر اس کا انجام آپ کے سامنے ہے، اب آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حالات اب آپ کے حق میں ہو چکے ہیں اور آپ مضبوط پوزیشن کی بھی مالک ہیں سو اب آپ کے یہاں رہنے کا کوئی بھی جواز نہیں بنتا۔

آپ اس گھر سے اپنی مرضی سے جو بھی چاہیں لے جا سکتی ہیں۔ آپ پیکنگ کر لیجیے گا اور جہاں بھی کہیں میں آپ کو چھوڑ آؤں گا۔ اور یہ دل سے نکال دیجیے کہ میں نے آپ پر احسان کیا ہے۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اس کی بھی مدد کرتا۔

میں نے زور زبردستی سے آپ سے کوئی تعلق بنانے کی کوشش نہیں کی میں چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا کیونکہ سب اختیار آپ مجھے سونپ چکی تھیں۔ کہیں میں بہت خوش ہوں، میرے لیے یہ احساس ہی سکون بخش ہے کہ میں نے آپ کو نکاح کے بعد سے لے کر آج تک چھوا بھی نہیں۔ اور آپ بھی خوش ہوں گی کہ جیسی یہاں آئی تھیں ویسے ہی جا رہی ہیں۔ آپ صاحبِ حیثیت ہیں۔ دولت مند ہیں۔ نئی زندگی شروع کر سکتی ہیں۔ ملائکہ کے پاس جا سکتی ہیں۔"

حوریہ نے دھواں دھواں ہوتے چہرے سمیت اس کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ اس نے تو یہ بات اس سے چھپا رکھی تھی پھر اسے کیسے پتہ چلی۔

وہ اس کی طرف دیکھ نہیں پا رہی تھی مبادا وہ اس کی آنکھوں میں پھیلنے والی نمی نہ دیکھ لے۔ جب سب کچھ طے تھا کہ ان کا ساتھ عارضی ہے تو پھر آج اس وقت اس کا دل ویران کیوں ہوا جا رہا تھا۔

جب اس نے سوچ رکھا تھا، وہ یہاں سے جانے کے لیے آئی ہے تو پھر یہ دکھ یہ آنسو کیا معنی رکھتے ہیں......

"آپ پریشان مت ہوں۔ آپ کے پاس زندگی کو آسان کرنے کے لیے بہت سے مادی وسائل ہیں اور آپ ہر شخص کو لالچی سمجھنا چھوڑ دیں، کیونکہ ہر کوئی ڈاکٹر آفتاب نہیں ہوتا۔"

شیر افگن اس کے بعد رُکا نہیں گھر سے نکل گیا۔

حوریہ خود کو یقین دلا رہی تھی کہ اس نے جو کچھ سنا ہے وہ سچ ہے۔ شیر افگن ہی سب کچھ کہہ کر گیا ہے۔ یہ تو ہونا ہی تھا...... اس کے لبوں پر زخمی سی مسکراہٹ آگئی۔

تمہارے ساتھ بھی تھی بے سکونی
تمہارے بعد بھی اک بے کلی ہے
ڈٹے ہیں اپنی ضد پہ دونوں
انا دیوار سی راہ میں کھڑی ہے

حوریہ اپنے کپڑے اور دیگر چیزیں رکھ رہی تھی۔ شیر افگن نے دروازے سے ہی جھانک کر اس کی سرگرمی ملاحظہ کی۔

وہ نارمل طریقے سے سب کچھ کر رہی تھی۔ گویا اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔

اس گھر سے اس مطلبی و خود غرضی لڑکی کو کتنی محبتیں ملی تھیں۔ مما پپا اپنی بیٹی کی طرح چاہنے لگے تھے اسے، عادل اور ایان، بڑی بہن کی طرح احترام دیتے تھے۔ اور دادا جان تو اسے دیکھ کر جیتے تھے گویا۔ شیر افگن جیسے لاڈلے پوتے کی بیوی ہونے کے ناطے ان کا رویہ اور محبت خصوصی رہی تھی۔

کسی بات کو تو وہ سوچ لیتی۔ اور شاید وہ ڈاکٹر آفتاب کی طرح اسے بھی لالچی سمجھ رہی تھی۔ شیر افگن کو سب کچھ گوارا تھا مگر اس کی ذات کو کوئی نشانہ بنائے یہ کسی حال میں وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

شیر افگن گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ حوریہ نے آخری نظر ان در و دیوار پہ ڈالی۔ اسے وہ دن یاد آ گیا جب پھولوں کی پتیاں نچھاور کرتے ہوئے اس کا والہانہ استقبال ہوا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ ہر سیڑھی پہ رکتی اور پھر پلٹ کر دیکھتی۔ پھر وہ نیچے آئی۔ برآمدے میں دادا جان کی چیئر اپنی مخصوص جگہ پڑی تھی۔ شدتِ ضبط سے اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔ اسے یوں لگا کہ اگر ایک منٹ بھی یہاں کھڑی رہی تو غم کی شدت سے بکھر جائے گی، ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔

تیز تیز قدموں سے اس نے طویل برآمدہ اور صحن عبور کر کے گاڑی تک کا سفر طے کیا۔ شیر افگن اسی کے انتظار میں تھا۔ وہ آ رہی تھی، سیاہ عبایا اور اسکارف میں آنکھوں کے سوا سارا جسم چھپائے ہمیشہ کی طرح پراسرار اور دلکش لگ رہی تھی اسے۔ حوریہ کی آنکھیں اسے سرخ محسوس ہوئیں یا شاید اس کا وہم تھا۔ وہ گرنے کے انداز میں سیٹ پر بیٹھی تھی۔

شیر افگن اسے اس کے گاؤں والے آبائی گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔ جہاں اس نے جنم لے کر بچپن سے جوانی تک کا سنہرا دور گزارا تھا۔ اس نے خود درخواست کی تھی کہ مجھے وہاں چھوڑ آئیں۔ شیر افگن کو اس کے بچکانہ فیصلے پر اعتراض تھا مگر وہ کچھ کہنے کا حق نہیں رکھتا تھا۔

حیدر بھائی کی طرف وہ جانا نہیں چاہتی تھی، اس لیے سختی سے انکار کر چکی تھی۔ ملائیکہ کی طرف اتنی جلدی نہیں جا سکتی تھی۔ کاغذی کارروائیوں میں ہی سال چھ ماہ لگ جاتے تھے۔ لے دے کے اس کے پاس گاؤں والی حویلی کا سہارا ہی تھا۔

رات اس نے شیر افگن سے کہا تھا" آپ مجھ پہ آخری احسان کر دیں مجھے وہاں چھوڑ آئیں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا تھا۔

الماری سے کپڑے نکالتے ہوئے نیچے کونے میں مخملیں کیس پہ اس کی نظر پڑی تھی۔ اس میں وہی لاکٹ تھا جو شادی کی اولین رات شیر افگن نے اسے دیا تھا۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھی تھی۔ لاکٹ اس نے اپنے شولڈر بیگ میں احتیاط سے رکھا تھا۔

❁

گاؤں قریب آتا جا رہا تھا۔ فاصلہ سمٹ رہا تھا۔ توں توں حوریہ کو اپنے حواس کمزور پڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ گاڑی براؤن گیٹ کے آگے رک چکی تھی۔ اس کے قدموں نے اترنے سے انکار کر دیا۔

"آپ کی منزل آ چکی ہے مجھے اجازت دیں۔ میں بہت جلد اپنے وکیل سے طلاق کے پیپرز تیار کروا کر سائن کر دوں گا۔ پھر آپ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جائیں گی۔" وہ اس کا بیگ نکال کر گاڑی کی ڈگی سے باہر رکھ چکا تھا۔

حوریہ نے بمشکل تمام گھسیٹ کر خود کو باہر نکالا۔ وہ دوبارہ گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ ہی نہیں ہو رہی تھی۔

حوریہ دنیا مافیا سے بے خبر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ بلیو جینز، بلیو لائننگ والی شرٹ میں ملبوس اپنی ڈارک براؤن چمکیلی آنکھوں کو ڈارک گلاسز کے پیچھے چھپائے ہلکی ہلکی داڑھی میں، بالوں کے شارٹ کٹ اسمارٹ سٹائل میں وہ اسے اپنی دسترس سے ہمیشہ کے لیے دور جاتا لگ رہا تھا۔

تیسری کوشش میں گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ ان چند ثانیوں میں وہ اپنی آنکھوں سے گویا اس کا ایک ایک نقش حفظ کر چکی تھی۔ زن سے گاڑی دوڑاتا وہ اس کے پاس سے گزر گیا۔

حوریہ کا جی چاہا اسے آواز دے کر روک لے۔ کہ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ مگر وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ فقط دھول لہراتی رہ گئی تھی۔ جس میں اردگرد کے منظر دھندلا رہے تھے۔

❁

گاؤں کے آس پاس کے گھروں کی عورتیں باہر نکل آئی تھیں۔ اتنے برسوں کے بعد اس کی آمد حیرت انگیز تھی۔ وقت کافی گزر چکا تھا اسے یہاں سے گئے مگر پھر بھی اس کی پہچان کے نقوش مدہم نہیں پڑے تھے۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

حیدر بھائی نے حویلی کی دیکھ بھال کے لیے جن میاں بیوی کو رکھا تھا وہ بھاگے بھاگے آئے۔ اس دیکھ بھال کا انہیں معقول معاوضہ ملتا تھا اس لیے تابعداری میں پیش پیش تھے۔

آس پڑوس کی اور عورتیں بھی اس کے پاس جمع ہو گئی تھیں۔ جن کے پاس طرح طرح کے سوال تھے۔

بہت سی آنکھوں نے اسے ایک جاذب نظر نوجوان کے ہمراہ گاڑی سے اترتے دیکھا تھا۔ جو اسے اتارنے کے بعد واپس چلا گیا تھا۔ اس کے بارے میں جاننے کا تجسس تھا انہیں، لیکن حوریہ فی الحال کسی سوال کا جوب دینا نہیں چاہتی تھی۔

حوریہ شکل سے ہی ہراساں اور پریشان لگ رہی تھی۔ چاچی فریدہ کو لگ رہا تھا، دال میں کچھ کالا ہے۔ اتنے سالوں کے بعد اس کی ایک اجنبی کے ہمراہ واپسی خالی از علت نہیں تھی۔

"آج رات ادھر ہی سو جاؤ۔ صبح اپنے گھر چلی جانا خیر سے۔" اس نے خاموشی سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

شکر تھا چاچی فریدہ نے اس کے بعد کوئی سوال نہیں کیا۔ حد سے زیادہ تھک گئی تھی وہ لیکن نیند بڑی دیر کے بعد آئی جب وہ جاگ جاگ کر بے حال ہو چکی تھی۔

❁

دوسرے دن وہ اپنی حویلی میں آ گئی۔

سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہی کمرے، ویسا ہی گول ستونوں والا برآمدہ وہی بل کھاتی سیڑھیاں، وہی اپنائیت بھری فضا، سب کچھ ویسا ہی تو تھا۔

بابا جان کے کمرے میں جا کر اس نے ایک ایک چیز کو چھو کر دیکھا۔ پھر اپنے کمرے میں آ گئی جہاں اماں فاطمہ اس کے ساتھ سویا کرتی تھیں۔

روبینہ اور انور کے لیے وہ اجنبی تھی۔ لیکن مالکن ہونے کے ناطے وہ اس سے اپنائیت سی محسوس کر رہے تھے۔ بہت خاموش گم صُم اور اداس سی لگ رہی تھی مالکن۔ خاصی بے ضرر۔ دوپہر کے کھانے کا انہوں نے پوچھا کہ کیا بنایا جائے تو اس نے کہا جو مرضی بنالو......

حوریہ نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا اور کمرے میں گھسی رہی۔ روبینہ کھانے کا کہنے آئی تو اس نے اندر سے ہی کہہ دیا بھوک نہیں ہے۔

شام ہوگئی مگر اس کے کمرے کا دروازہ بند ہی رہا۔

روبینہ سے رہا نہیں گیا اور اس نے دستک دے ڈالی۔ تیسری دستک پہ حوریہ نے دروازہ کھول دیا۔ سرخ متورم آنکھیں، ناگفتہ بہ حالت وہ صدیوں کی بیمار نظر آ رہی تھی۔

''مجھے ایک کپ چائے بنادو۔'' اس سے پہلے کہ روبینہ کوئی سوال کرتی، حوریہ حکم دے کر دوبارہ اندر چلی گئی۔

روبینہ کے ذہن میں بہت سے سوال آ رہے تھے لیکن جواب معلوم کرنے کی جرأت بہرحال اس میں نہیں تھی۔

۞

رات کو بڑا تیز طوفان آیا۔ روبینہ اور انور سارے دروازے بند کر کے کب کے اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔

حوریہ سارا دن وقفے وقفے سے روتی رہی۔ دن کو کھانا کھایا ہی نہیں گیا، رات اس نے چند نوالے زہر مار کیے۔ اب وہ دروازہ بند کیے لیٹی تھی جب تیز چلنے والی ہوا یکایک ہی آندھی اور طوفان میں بدل گئی۔ باہر تیز ہوا کی شائیں شائیں اور بادلوں کی کڑکڑاہٹ سی۔ بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی۔ درختوں کے سایے کھڑکی کی طرف جھکے تھے۔ بجلی کے چمکنے سے سارا ماحول ایک ثانیہ کے لیے منور ہو جاتا اسے یوں لگا جیسے کھڑکی کے باہر بہت سی نادیدہ بلائیں اسے دیکھ رہی ہیں۔

بے اختیار گھبرا کر اس نے روبینہ اور انور کو آوازیں دیں مگر اس قیامت کے شور میں ان تک حوریہ کی کوئی بھی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ زور زور سے رونے لگی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی خوف نے اس کے دل و دماغ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

''شیر افگن! کہاں ہو، پلیز آجاؤ میری مدد کرو۔'' اس کا نام سسکاری کے ساتھ اس کے لبوں سے برآمد ہوا۔ جیسے وہ پاس ہو اور سن رہا ہو۔

خوف سے بے حال ہوتے ہوتے اس کے حواس ہی ساتھ چھوڑ گئے۔

۞

حیدر، حنان، عافیہ اور نتاشا چاروں اس کے گرد کھڑے پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ صبح روبینہ نے کتنی بار حوریہ کے دروازے پر دستک دی مگر اندر سے کوئی جواب نہیں ملا، وہ انور کو بلا لائی۔ دونوں برابر دستک دے کر اسے بلاتے رہے۔ پندرہ منٹ کے بعد روبینہ چاچی فریدہ کو بلا لائی۔ باہمی مشورے کے بعد دروازہ توڑ دیا گیا۔ اندر حوریہ بے ہوش پڑی تھی۔

اس کے ماتھے پر خون جما ہوا تھا۔ شاید وہ کسی چیز سے ٹکرائی تھی نبض آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

اس دوران انور، چاچی فریدہ کے شوہر اور ایک پڑوسی کی مدد سے حوریہ کو گاڑی میں ڈال کر گاؤں کے سب سے مستند ڈاکٹر کے پاس لے آیا۔ حوریہ کو اس نے ابتدائی طبی امداد دے دی تھی۔ اور گلوکوز بھی لگا دیا تھا۔ خطرے یا پریشانی والی بات نہیں تھی۔ انور نے حیدر کو فون کر دیا تھا۔

وہ خوف اور کمزوری کی وجہ سے بے ہوش ہوئی تھی اور بی پی بھی خطرناک حد تک لو ہو رہا تھا۔ ان چاروں کے آنے تک اسے کچھ کچھ ہوش آنے لگا تھا۔

ڈاکٹر نے دوائیں دے کر سب ٹھیک ہے کا اشارہ کیا تو وہ اسے لے کر گھر آ گئے۔ ابھی بھی اس کی آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں۔ پلکوں پہ منوں بوجھ دھرا محسوس ہو رہا تھا۔

انور اور روبینہ کو جو کچھ معلوم تھا حیدر کو بتا چکے تھے۔ اس سے زیادہ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ان کی آمد پر چاچی فریدہ بھی آ گئیں۔ یہ انہیں بھی پتہ تھا کہ ایک سانولا، خوش شکل، چھوٹی چھوٹی داڑھی والا اونچا لمبا نوجوان گاڑی میں یہاں تک حوریہ کو چھوڑ کر گیا تھا لیکن وہ کون تھا چاچی فریدہ کو نہیں پتہ تھا۔

ان سب کو معلوم ہو گیا کہ وہ شیر افگن کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ حلیہ سو فیصد اسی کا تھا۔ عافیہ نے حیدر سے کہا کہ ابھی فون کر کے اس سے پوچھو کہ حوریہ کو یہاں اکیلا کیوں چھوڑ کر گیا۔ وہ کافی غصے میں تھی اور حیدر کے ساتھ حنان کو بھی تاؤ دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ حنان نے حیدر سے کہا کہ پہلے حوریہ سے اصل بات معلوم کرتے ہیں، اس کے بعد شیر افگن سے بات ہوگی۔

جہاں تک حنان کو اس کے بارے میں علم تھا وہ حساس، رحم دل اور محبت کرنے والا شخص تھا۔ بقول عافیہ بھابی کے اس نے حوریہ پہ ظلم کیا اور یہاں پھینک گیا لیکن وہ اس بات سے

متفق نہیں تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب کردار کا لڑکا تھا، اس طرح کی حرکت کی توقع اس سے رکھی ہی نہیں جا سکتی تھی۔

حنان نے عافیہ اور حناشا کو منع کر دیا کہ فی الحال حوریہ سے کوئی سوال نہ کیا جائے۔

اسے ساتھ لے کر وہ لاہور واپس آ گئے۔

❁

گھر پہنچتے ہی حنان نے شیر افگن کو فون کیا۔ وہ فی الحال چکوال میں تھا۔ آواز سے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔

''حوریہ سے تو بات کراؤ میری۔ ذرا حال احوال پوچھوں۔ شادی کے بعد ایک بار کے علاوہ وہ ادھر آئی ہی نہیں۔ ذرا کلاس تو لوں اس کی۔'' حنان نے اپنے انداز سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اسے حوریہ کی گاؤں موجودگی کا علم ہے اور یہ کہ اس وقت وہ گاؤں میں نہیں بلکہ اس کے پاس ہے۔

اس کے سوال پہ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ خاصی دیر بعد وہ بڑی مشکل سے بولا۔

''حوریہ اس وقت یہاں نہیں ہے۔''

''تو کہاں ہے؟'' اس نے اپنے اندرونی غصے پہ بمشکل قابو پایا۔

''وہ اس وقت اپنے گاؤں والی حویلی میں ہوں گی اور ان کے کہنے پہ میں نے انہیں وہاں ڈراپ کیا تھا۔'' وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

''کیوں تم نے حوریہ کو وہاں اکیلا چھوڑا؟'' اب کی بار اس کا غصہ ظاہر ہو ہی گیا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ میں نے ان کی خواہش پہ سب کچھ کیا ہے تو تم یقین کر لو گے میرا؟'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ حنان کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

پھر شیر افگن نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ کتنی دیر حنان خاموش رہا۔

''میں اس سے بات کرتا ہوں کہ اس نے یہ سب کیوں کیا اس کے بعد اس کا حل سوچیں گے اور تم دادا جان یا کسی اور سے مت کہنا۔''

''میں نے کیا کہنا ہے۔ اس وقت سے پریشان ہوں جب سب پوچھیں گے حوریہ کہاں گئی تو میں کیا جواب دوں گا۔'' حنان کو اس بات پہ پیار سا آ گیا۔

حوریہ مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی۔ حنان، عافیہ بھابی کے بارے میں سوچ

سوچ کر متنفر ہو رہا تھا۔ حوریہ کے ذہن کو زہر آلود کرنے والی یہی تھیں۔ اس کے اس فیصلے کا محرک یہی تھیں۔

''تم گھر میں مجھ سے حیدر بھائی سے ذکر کر سکتی تھیں۔'' خاصی دیر بعد وہ بولا۔ اب وہ اس سے نگاہیں نہیں ملا رہا تھا۔

پہلے وہ اس پہ خاصا گرجا برسا، خوب کھری کھری سنائیں۔ زندگی میں پہلی بار اسے اتنا شدید غصہ آیا تھا۔ حوریہ خائف سی ہو کر بول ہی پڑی۔ وہ سب کچھ بتاتی گئی جو عافیہ بھابی وقتاً فوقتاً ہمدردی کی آڑ میں اسے کہتی آئی تھیں، جب اس نے یہ کہا کہ عافیہ بھابی نے پورے یقین سے یہ کہا تھا کہ تمہیں کوئی اچھے گھرانے کا رشتہ نہیں ملے گا۔ نہ ہی کوئی کنوارا لڑکا تمہیں اپنی بیوی بنانا پسند کرے گا تو اس بات پر حنان کا دل چاہا اپنے سر کے بال نوچ لے۔

''بیوقوف لڑکی! تم جن باتوں سے ڈرتی رہیں، وہ تو شادی سے پہلے ہی حیدر بھائی اور میں نے شیر افگن کو بتا دی تھیں۔ اور اس نے اپنی مما پاپا کو پاکستان چھوڑنے سے پہلے تمہارے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی سے آگاہ کر دیا تھا۔ جن باتوں کی ان کے نزدیک اہمیت نہیں، تم خوامخواہ انہیں سر پر سوار کیے رہیں۔ اور تم اب کوئی مزید حماقت نہیں کرو گی۔ شیر افگن آ رہا ہے۔ شکر کا مقام ہے اتنا کچھ ہونے کے باوجود وہ میرے کہنے پہ منت سماجت کرنے پر مان گیا ہے۔ تمہیں قدر کرنی چاہیے اس کی محبت کی۔ ایسے لوگ تو قسمت والوں کو ملتے ہیں.....''

حنان جا چکا تھا، وہ تو اسی ایک جملے کے حصار میں قید تھی کہ وہ آ رہا ہے۔

❁

عافیہ نے بڑی حیرت سے حوریہ کی سرگرمیوں کو دیکھا۔

تین دن کے بعد وہ آج کمرے سے نکلی تھی۔ بہت خوبصورت جوڑا زیب تن کیے، بال سنوارے، بات بات پہ مسکراتے لب۔ کتنی انوکھی اور مختلف لگ رہی تھی۔ ورنہ جس حوریہ سے عافیہ واقف تھی وہ دبو بزدل اور چھوٹے سے دل کی مالک احساسِ کمتری کا شکار لڑکی تھی۔

''کیا بات ہے بہت خوش ہو آج۔ ورنہ جب سے ہم تم کو گاؤں سے لے کر آئے تھے۔ تم چوبیس گھنٹے کمرہ بند کیے پڑی تھیں۔'' اس کی نظر اندر تک اتر جانے والی تھی۔

''بھابی! شیر افگن آ رہے ہیں ناں۔ رات کو ان کا فون آیا تھا کہ تیار رہنا، آج میں تمہیں لے جاؤں گا۔'' حوریہ کے لبوں پر خوبصورت مسکان سجی تھی۔

ہمیشہ سے سادہ اور عام سے حلیے میں رہنے والی حوریہ اس وقت بہت پرکشش لگ رہی تھی۔

''تم گاؤں کیوں گئی تھیں اور تمہیں وہ اکیلا کیوں چھوڑ آیا تھا وہاں پہ؟'' اس ایک سوال کا جواب حاصل کرنے کی خاطر وہ مری جا رہی تھی۔

''میں نے ہی ضد کی تھی کہ میں اکیلے کچھ دن گاؤں میں گزارنا چاہتی ہوں۔ میری ضد کے آگے وہ مجبور ہو گئے تھے ورنہ یہاں بھی نہیں رہنے دیتے کہ رات نہیں رکنے دوں گا۔'' اس نے بڑے دھڑلے سے جھوٹ بولا۔ عافیہ کا چہرہ اتر سا گیا۔

وہ توقع کر رہی تھی کہ کوئی چٹ پٹی سی کہانی ہوگی مسالے دار واقعہ ہوگا مگر یہاں تو کھودا پہاڑ نکلا چوہا والا معاملہ تھا۔

حسان دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے لیٹا ہوا تھا۔ ثنا باہر گھر کے کاموں میں لگی ہوئی تھی۔

حوریہ کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے دل پہ بوجھ سا آگرا تھا۔ امی، حوریہ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ ان کی خواہش پہ اسے بھی اعتراض نہیں تھا۔ مگر امی کے مرتے ہی بھائی نے اس کی سوچوں کو یکسر بدل ڈالا تھا۔ اس کی زندگی میں حوریہ بہت پیچھے، بہت ہی دور رہ گئی۔ شادی ہو گئی تھی مگر اس کے باوجود بھی وہ کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتا۔ بڑی خاموشی سے اس کی آنکھوں سے ابھی بھی ایک آنسو نکلا تھا۔

شیر افگن آ رہا تھا۔ اس کے بعد اسے پکی امید تھی کہ حوریہ وہ سب پالے گی جس کے خواب دیکھتی آئی تھی۔

اس نے شیر افگن کے لہجے میں حوریہ کے لیے پریشانی دیکھی تھی۔ اور حوریہ کی آنکھیں بھی اس کی آمد کا سن کر دمک اٹھی تھیں۔

''حوریہ ہمیشہ خوش رہے میرے اللہ!'' اس نے صدقِ دل سے دعا کی۔ اب اس کا دل شانت تھا۔

اس کی پلکوں پہ اٹکا پانی کا نمکین قطرہ ہنس پڑا تھا۔

شیر افگن ڈائننگ ٹیبل پہ عین اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ حوریہ سے تو کھانا ہی نہیں کھایا جا رہا تھا۔

یہاں آ کر اس نے پرانی باتوں کو نہیں چھیڑا تھا۔ بس حیدر بھائی سے کہا کہ میں حوریہ کو لینے آیا ہوں۔ واپسی کے لیے اس نے جہاز میں دو سیٹیں ریزرو کروائی تھیں وہ حوریہ کے ساتھ

اسلام آباد جا رہا تھا۔

ایئر پورٹ سے باہر ڈرائیور ان ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ پورے راستے میں شیر افگن نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ حوریہ کی تو ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی اسے مخاطب کرنے کی۔ گاڑی میں بھی ڈرائیور کی موجودگی میں اس نے کوئی بات نہیں کی۔ اس کی منزل آ چکی تھی۔

ڈرائیور سلام کر کے چلا گیا۔ اب حوریہ وہاں اکیلی کھڑی تھی۔ کیوں کہ شیر افگن اندر چلا گیا تھا۔ وہ اس سے بولا نہیں تھا، نہ اسے اندر آنے کو کہا تھا۔ حوریہ کو پتہ تھا وہ بہت زیادہ ناراض ہے۔ وہ اسے حق بجانب تصور کر رہی تھی۔

اپنی ذات پہ اس کا اعتماد بحال ہوا تھا تو وہاں اپنے جذبوں کی سچائی بھی اس پہ عیاں ہو گئی تھی۔

حوریہ اس کے کمرے کے بند دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا ہاتھ دستک کے لیے آگے بڑھا۔ اور پھر اس نے بڑے یقین کے ساتھ اپنی محبت کے دروازے پہ دستک دی۔

کبھی آؤ کہ ہم مل بیٹھ کر پوری کریں
جو باتیں ادھوری رہ گئی ہیں
زباں تک آتے آتے جم گئی ہیں
کہ جیسے برف باری میں
درختوں کے ہرے پتوں پہ جاناں

شیر افگن نے دروازہ کھول دیا۔ ہچکچاتے ہوئے اس نے قدم آگے بڑھائے۔

وہ بالوں میں برش کر رہا تھا۔ مڑ کر دوبارہ اپنے شغل میں معروف ہو گیا۔ حوریہ اس کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ سر جھکائے۔ اس کی طرف دیکھنے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔ کیونکہ اب اس کی نگاہیں حوریہ پہ ہی مرتکز تھیں۔

''آپ ایسی لڑکی کو معاف کر سکتے ہیں جس کا اعتبار ہر رشتے سے اٹھ چکا ہو جو اپنی کم [illegible]گی سے ڈرتی ہو کیونکہ جس کی رفاقت کے وہ خواب دیکھتی ہے، وہ آسمان ہے اور وہ خود زمین ہے۔ وہ اپنے ہی جذبوں کی تپش سے پگھل رہی ہو، قطرہ قطرہ موم بن کر۔ بتائیے آپ ایسی لڑکی کو معاف کر سکتے ہیں......؟'' حوریہ کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ اسے قابو نہیں رہا تھا۔

شیر افگن نے اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کے مضبوط حصار میں تھی۔

''جیسے وہ آسمان کہہ رہی ہے، وہ خود بھی تو پگھل رہا ہے۔ اور تم تو اس کی پیاس کے لیے دریا ہو......''

حوریہ نے اپنی حیران آنکھیں اٹھائیں مگر زیادہ دیر اس کی جذبوں کی یورش سے تپتی آنکھوں کے سامنے ٹھہر نہیں سکی اور پلکوں کی چلمن گرالی۔

''اتنی جلدی گھبرا گئی ہو۔ یہاں کوئی معافی نہیں ہے۔'' اس کی گستاخ نگاہیں صاف طور پر پیغام دے رہی تھیں۔

''چار ماہ میں میں نے خود پہ بہت جبر کیا، اب تمہاری سزا شروع ہوگی، دیکھتا ہوں، کتنا برداشت کرتی ہو۔'' اس کے چہرہ جھکانے پر وہ بہت ہنسا۔

شیر افگن نے اسے شرمندہ نہیں کیا تھا۔ اس کے جذبوں کو پذیرائی بخش دی تھی اور اس سے وہ کتنی خوش تھی۔ کوئی اس کے دل سے پوچھتا جو محبت کی خوبصورت تال پہ دھڑک رہا تھا۔

سوتے میں اس کے چہرے پہ الوہی سی مسکان بجی ہوئی تھی۔ شیر افگن نے اسے محبت کا اعتبار دے کر چاہت کے خوبصورت رنگوں سے سجا دیا تھا۔

وہ رنگ جو کبھی نہ مٹنے والے تھے۔ پکے اور سچے رنگ، محبت کے خالص رنگ۔

اب حوریہ کو کوئی بے رنگ نہیں کہہ سکتا تھا۔

......۞......

اٹا تھا۔

رہِ حیات کے سلسلے

ان آنکھوں نے جو کچھ دیکھا؟ (کیا دیکھا؟)
اے دل یہ بتا کس منہ سے کہیں (اسی فٹے منہ سے)
کچھ اپنوں کا سا ناتا ہے (اگر قرابت داری کا اتنا ہی لحاظ ہے تو پھر یہ شور)
بہتر ہے یہی خاموش رہیں (کس نے روکا ہے؟)
جب کر نہ سکیں ہم ان سے گلہ (حسرت ان غنچوں پہ ہائے)
غیروں سے شکایت کون کرے (اب کیا کر رہے ہو؟)

ولید ٹیرس پر جھکا گزشتہ پندرہ منٹ سے دل دوز آواز میں یہی گنگنائے جا رہا تھا اور تیمور اس کا سنگی، اس کا ساتھی بجائے داد دینے کے دل جلے فقرے کس رہا تھا۔

بات ہی ایسی تھی۔ بے چارے ولید کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اشرف علی کی بہو پہ جو نظر پڑ گئی تھی اور یہ نظر ایسی تھی کہ پلٹ کر واپس آنے سے انکاری تھی۔ اشرف علی کی بہو بس مقابلہ حسن میں حصہ لینے سے رہ گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ولید نے ساجدہ کو برآمدے سے لان تک چہل قدمی کرتے دیکھا تو تیمور کو بھی آواز دے ڈالی۔

گلابی باریک جارجٹ کے کپڑوں میں ملبوس دوپٹہ بے نیازی سے گلے میں ڈالے ساجدہ کو چنداں احساس نہ تھا کہ دو نوجوان لڑکے اسے کن نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

''یہ آپ دونوں کیا کر رہے ہیں؟'' حوریہ کی آواز پہ وہ دونوں بے اختیار ہڑبڑا گئے اور نظروں کے زاویے کو فوراً درست کیا۔ حوریہ کی نظر ابھی تک ساجدہ پہ نہیں پڑی تھی کیونکہ وہ ان

پیچھے بھگی۔

''کچھ نہیں، بس موسم انجوائے کر رہے تھے۔'' ساجدہ کو غڑاپ سے اندر گھستا دیکھ کر دونوں نے سکون کا سانس لیا۔ ولید کی شکر گزار مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔

حوریہ کی نگاہوں میں شک کی کیفیت ذرا دیر کے لیے لہرائی پھر وہ مطمئن ہو کر واپسی کے لیے مڑی اور پھر وہیں ٹھہر سی گئی۔ ولید اور تیمور نے نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کی طرف اشارہ کیا تو وہ عجیب سی مشکل میں گرفتار نظر آنے لگی۔ مصطفیٰ اِدھر ہی آ رہا تھا۔ سنجیدہ سے مصطفیٰ کے سامنے اس کی یہی کیفیت ہوتی جبکہ وہ دونوں بھائی چھیڑ چھیڑ کر اس کا ناک میں دم کر دیتے۔

چھوٹے سے دل کی مالک ڈرپورک سی حوریہ انہیں بڑی عزیز تھی۔ تینوں بھائیوں کی وہ اکلوتی بہن تھی۔ بڑے بھائی عادل اپنی فیملی کے ساتھ بسلسلہ ملازمت قطر میں مقیم تھے۔ ولید کا نکاح ہو چکا تھا۔ تیمور ابھی تک کنوارا تھا جبکہ حوریہ کی منگنی ابھی چار ماہ پہلے مصطفیٰ کے ساتھ ہوئی تھی۔

حوریہ کی شک والی عادت سے وہ دونوں بڑے بے زار تھے۔ ٹیلی فونک افیرز کی بے شمار کہانیاں وہ من وعن امی حضور کے گوش گزار کر دیتی۔ بعد میں ابا حضور کی عدالت میں طلبی ہوتی تو ان کے کوچے سے رسوا ہو کے نکلنا پڑتا جس پر دانت پیسنے کے سوا وہ کچھ نہ کر سکتے۔ البتہ موقع ملنے پر حوریہ سے بدلہ ضرور لیا جاتا۔

مصطفیٰ ولید اور تیمور کے ساتھ اندر جا چکا تھا۔ وہ بانو کی مدد کے خیال سے باورچی خانے میں آ گئی، جہاں وہ مصطفیٰ کی آمد کا سنتے ہی اچھے خاصے اہتمام میں مصروف تھی۔

چائے پی کر مصطفیٰ اٹھ کھڑا ہوا تو ولید اور تیمور دونوں اسے گیٹ تک چھوڑنے آئے۔ ساجدہ، اپنے شوہر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ ولید نے ٹھنڈی آہ بھری تو مصطفیٰ نے اسے حیرت سے دیکھا جس پر تیمور نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے کچھ سمجھاتے ہوئے ساجدہ کا مختصر سا تعارف کرایا۔

''یہ ہمارے فرسٹ ڈور ممبر ہیں۔'' ادھورا سا تعارف تھا لیکن مصطفیٰ نے زیادہ کرید نہیں کی اور بائے بائے کہہ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

❁

شام ڈھل رہی تھی۔ پروا آنگن میں ستون سے ٹیک لگائے اداس نگاہوں سے غروب ہوتے سورج کو دیکھ رہی تھی۔

اس کے اردگرد بڑی چہل پہل تھی، پر اس کے دل میں جانے کیوں ویرانی اور سناٹا تھا۔

اماں بھاگ بھری وضو کر کے مغرب کی نماز پڑھنے اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی، اسے یوں گم صم سا دیکھا تو اس کی طرف آ گئی۔

''بیٹا رانی! اندر آؤ، اذان ہو چکی ہے۔ نماز پڑھ لو۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو وہ خالی خالی سی نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئی پھر دھیان آنے پر دھیرے سے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

''ٹھیک ہے، میں وضو کر کے آتی ہوں۔'' وہ دوپٹہ سر پر درست کرتی سیدھی واش بیسن کی طرف آ گئی۔

نماز پڑھنے کے بعد اس نے بڑے خشوع وخضوع سے بابا کی درازی عمر کی دعا مانگی تو دل میں پھیلا سناٹا دھیرے دھیرے دم توڑنے لگا۔

جب بھی چھٹیوں میں وہ حویلی آتی تو بابا کو نہ پا کر اس کی یہی کیفیت ہوتی۔ اب بھی اسے واپس آ کے اطلاع ملی کہ بابا سائیں تو مہینہ ہوئے دبئی گئے ہوئے ہیں۔ کالج دس دن کے لیے بند تھے، وہ خوشی خوشی آئی تھی۔ یہاں آ کر ساری خوشی اداسی میں بدل گئی کہ بابا سائیں ہمیشہ کی طرح غائب تھے۔

جائے نماز تہہ کر کے وہ گلاس ونڈو کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس کا کمرہ جدید سہولیات سے آراستہ اور بڑا خوابناک سے تھا۔ بابا سائیں اس کے ذوق اور آرام کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ اسے پھولوں سے عشق تھا۔ گلاس ونڈو کھولتے ہوئے باہر سامنے رنگ برنگے پھول نظروں کو تراوٹ پہنچاتے نظر آتے۔

اس کی زندگی میں ہر چیز ہر سہولت کی فراوانی تھی۔ بس کمی تھی تو بابا سائیں کے پیار کی، وہ شروع سے ترستی آئی تھی۔ ان کی مصروفیات سے سمجھوتہ نہیں کر سکی تھی اب تک۔

پہلے سمجھ اور عقل نہیں تھی، وقت کے ساتھ ساتھ وہ حساس اور سمجھ دار ہو گئی تھی۔ اب تو ذہن میں سوالات جنم لینے لگے تھے جو وہ بابا سائیں سے پوچھنا چاہتی تھی۔ پر اس کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔

چھ ماہ سے اس کی بابا سائیں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ صرف فون پر سرسری سی بات ہوئی تھی۔ ان کی طرف سے وقت کی کمی کا عذر ہوتا اور اس کے دل میں بہت سی باتوں کی حسرت ہی رہ جاتی۔

زارا کا فون آنے سے اس کے خیالات کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ ''کیا کر رہی ہو۔'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ٹھیک ہوں اور کچھ بھی نہیں کر رہی۔ اداس ہوں، بوریت ہو رہی ہے۔'' الفاظ کے برعکس اس کے لہجے میں کہیں بھی بوریت اور اداسی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ساری اداسی اور کلفت زارا کی آواز سنتے ہی اڑنچھو ہو گئی تھی۔

''واپس آجاؤ نا۔'' اس نے بڑی منت سے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں کل ہی اللہ داد کے ساتھ واپس آنے کی کوشش کروں گی۔''

''کوشش نہیں کرنی بلکہ ضرور آنا ہے، ورنہ تم جانتی ہو، میں کتنی بری آدمی ہوں۔''

''ہاں، میڈم! ہمیں پتہ ہے تم کتنی بری ہو۔ آخر کو اتنی پرانی دوستی ہے۔'' وہ بے ساختہ ہنسی تھی جس پر دوسری طرف موجود زارا تپ سی گئی۔

''دانت نہ نکالو اور جلدی آؤ، میں سچ مچ تمہیں مس کر رہی ہوں۔'' وہ بڑی بے چارگی سے بولی۔

''چلو ٹھیک ہے، اب فون بند کرو۔ میں رات کھانے کے بعد کال بیک کروں گی۔''

''ٹھیک ہے، اپنا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ، جلدی آنا۔'' زارا آخری بار پھر بولی تو اس نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا۔

وہ بڑی سرشار سی تھی۔ زارا سے بات کرنے کے بعد ساری بیزاری دور ہو گئی تھی۔

''بھائی جان! آپ کی برتھ ڈے ہے، مجھے تو زبردست سی ٹریٹ لینی ہے۔'' نائلہ لاڈ سے اس کے گلے میں لٹک ہی تو گئی۔

''ٹریٹ کی بچی تم ہر ماہ مجھ سے ٹریٹ کے نام پر ٹھیک ٹھاک رقم ٹھگ لیتی ہو۔'' سلیمان نے مصنوعی خفگی سے اسے دیکھا تو وہ منہ بسورنے لگی۔

''میں نے تو ساری فرینڈز میں شو ماری ہے کہ زبردست سی ٹریٹ دوں گی۔ میرے بھائی آفیسر ہیں، کوئی مذاق نہیں۔ اب تو میرے ساتھ آپ کی عزت کا بھی سوال ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے، تم جیت گئیں۔ اب ذرا اچھی سی چائے تو پلواؤ۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے، ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی لے آنا۔''

''ٹھیک ہے، میں ابھی لاتی ہوں۔'' وہ پھرتی سے باہر نکل گئی تو سلیمان ہنس پڑا۔

شام کو خولہ آپی اور آصف بھائی چلے آئے تو گھر میں چھوٹی موٹی سی دعوت کا گمان ہونے لگا۔ سونو اور سنی پورے گھر میں بھاگتے دوڑتے پھر رہے تھے۔

چھوٹا سا خوش و خرم گھرانہ اصغر گیلانی کا تھا۔ سب سے بڑی خولہ، اس کے بعد سلیمان اور سب سے چھوٹی نائلہ تھی۔ خولہ شادی شدہ دو پیارے پیارے بچوں کی ماں کے اعزاز پر فائز اپنے گھر میں خوش و خرم تھی۔

اصغر گیلانی کو اپنے ہونہار اور خوبرو بیٹے پہ بڑا مان اور غرور تھا۔ تینوں بچوں کی پرورش سلجھے ہوئے ماحول میں ہوئی تھی، اس لیے اصغر اور ثمینہ اپنے بچوں کی طرف سے مطمئن تھے۔

پروا کے کپڑے اور دیگر سامان زینت نے صبح ہی پیک کر دیا تھا، وہ جانے کے لیے تقریباً تیار تھی، جب بابا سائیں کا فون آ گیا۔

''میں آ رہا ہوں، تم واپس نہ جانا۔'' اسے کچھ کہنے سننے کا موقع دیے بغیر انہوں نے لائن کاٹ دی۔

تب سے وہ سوچوں کے گرداب میں پھنسی تھی۔ زینت دوبارہ اس کے کپڑے وارڈروب میں رکھ چکی تھی۔ ملازم بھی سرگرم نظر آ رہے تھے۔ آخر کو حویلی کا مالک اتنے عرصے بعد واپس آ رہا تھا۔ اماں بھاگ بھری ایک ایک کو ہدایات دے رہی تھی۔ پروا نے اپنی نگرانی میں دوبارہ بابا سائیں کا کمرہ صاف کروایا۔ ایک ایک چیز کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا۔ کسی طرح تسلی ہی نہیں ہو رہی تھی۔

اسے بے چینی سے بابا سائیں کی آمد کا انتظار تھا۔ صبح سے اس کے سیل نمبر پہ زارا کے کئی ایس ایم ایس آ چکے تھے۔ تنگ آ کر پیمانہ، صبر لبریز ہونے کے بعد اس نے کال کی تو پروا نے کال ریسیو ہی نہیں کی۔ وہ بابا سائیں سے ملنے کی خوشی میں مگن سی سب کچھ بھولی ہوئی تھی۔

پروا محبتوں اور رشتوں کو ترسی ہوئی لڑکی تھی، ماں کی محبت اور شفقت کیا ہوتی ہے، وہ اس احساس سے محروم تھی کیونکہ ذکیہ بیگم اس کی پیدائش کے چار ماہ بعد اس دار فانی کو خیر باد کہہ چکی تھیں۔ تب اماں بھاگ بھری نے اسے اپنے ممتا بھرے وجود کا سہارا اور حرارت بخشی تھی۔ شروع سے ہی ہوسٹلز میں رہی اور پلی بڑھی تھی۔ ایسے میں بابا سائیں کا وجود بڑا غنیمت تھا۔ وہ ٹوٹ کر ان

سے محبت کرتی تھی۔ اماں بھاگ بھری اور بابا سائیں دونوں اس کے لیے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔

بابا سائیں کا تھوڑی دیر قبل فون آیا تھا، وہ پندرہ منٹ میں سکھر پہنچنے والے تھے، تب سے اس کی نگاہیں گیٹ پہ لگی ہوئی تھیں۔

پندرہ منٹ کے بجائے آدھ گھنٹہ اور پھر دو گھنٹے گزر گئے۔ انہیں نہ آنا تھا، نہ آئے۔ ان کی بجائے ان کا خادم اور دست راست نواز چلا آیا۔

"بابا سائیں، ایک ضروری کام کی وجہ سے لاہور چلے گئے ہیں۔" اس نے پردا کے مایوس چہرے سے نگاہیں چراتے ہوئے بتایا تو تب اسے اپنے اوپر کوئی اختیار نہ رہا۔ وہ بھاگتی ہوئی مڑی اور اپنے کمرے میں آ کر رونا شروع کر دیا۔

اس کی آواز مہمان خانے تک آ رہی تھی۔ نواز اور اماں بھاگ بھری نے ایک دوسرے سے یوں نگاہیں چرائیں جیسے وہ ہی مجرم ہوں۔ نواز اپنے آپ میں عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ اماں بھاگ بھری باہر چلی گئی۔ تب نواز کا ہاتھ اپنی قمیص کی اوپری جیب کی طرف بڑھا، جہاں سے خوبصورت نئے ماڈل کے قیمتی سیل فون کا اوپری حصہ نظر آ رہا تھا۔ وہ اسے باہر نکال کے نمبر ملانے لگا اور پھر رابطہ ہونے پر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگا۔

◉

آسمان پہ آوارہ بادل ایک دوسرے کے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ زارا بڑے غصے کے عالم میں لان سے گیٹ تک کے چکر کاٹ رہی تھی۔ اسے پروا پہ بہت شدید غصہ تھا۔

دو دن سے اس نے سیل فون آف کیا ہوا تھا۔ لینڈ لائن نمبر پہ جواب ملتا۔ وہ سو رہی ہیں یا باہر گئی ہوئی ہیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا، کہیں سے پروا آ جائے اور وہ اسے کچا چبا جائے۔ اپنے خطرناک ارادوں کا اظہار اس نے ببانگِ دہل ثناء آپی کے سامنے کیا تھا۔

سچ مچ بہت بور ہو رہی تھی۔ ثانیہ، ارم اور خوشبو بھی تو غائب تھیں۔ تینوں شہر سے باہر چھٹی منانے گئی ہوئی تھیں۔

ثناء آپی کے امتحانات ہو رہے تھے، مصطفیٰ بھائی اپنی جاب میں مصروف تھے۔ مما گھر کے دھندوں میں پھنسی تھیں۔ ایک اکیلی اس کی جان تھی۔ شروع کے دو دن تو اس نے ڈھیر ساری موویز اور رسالوں کے درمیان گزارنے کی کوشش کی پھر بے سود رہا، ثناء اس کا حال دیکھ کے ہنستی تو وہ کھسیانی سی ہو جاتی۔

"ایک بار آنے دو ان چاروں کو، خاص طور پہ اس پروا کا حشر نشر نہ کیا تو نام نہیں۔" وہ اپنے قاتلانہ عزائم نئے سرے سے ترتیب دے رہی تھی۔ جب گیٹ کے باہر جانی پہچانی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ اسے خوشگوار حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ ولید، تیمور اور حوریہ تینوں اسی طرف آ رہے تھے۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو زارا!" حوریہ گرم جوشی سے اس کے گلے لگی تو حیرت کی زیادتی سے وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔

عین اسی وقت مصطفیٰ بھائی بھی چلے آئے۔ ثناء کچن سے برآمد ہو کر نئے سوٹ میں ملبوس شاداں و فرحاں سی تھی اور زارا کا حال دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ مصطفیٰ بھائی نے گفٹ دے کر اسے ساتھ لگایا تو اسے اپنے آپ غرور سا ہونے لگا۔

سارا پروگرام ثناء کا تھا۔ اس نے بالا ہی بالا سرپرائز دینے کے چکر میں زارا کو ہر بات سے لاعلم رکھا تھا۔ پر زارا کو افسوس سا تھا کہ اس کی ایک بھی دوست جنم دن پہ یہاں نہیں ہے۔ زارا نے کیک کاٹ کر سب کو اپنے ہاتھ سے کھلایا۔

حوریہ پلیٹ میں کیک کا چھوٹا سا ٹکڑا اور چاٹ لے کر قدرے سائیڈ پہ ہو کے بیٹھ گئی۔ وہ تو اپنی شرمیلی فطرت کی وجہ سے آ ہی نہیں رہی تھی۔ امی اور ثناء کے دباؤ کی وجہ سے انکار کی اسے جرأت ہوئی ہی نہیں۔

وہ واپس اٹھنے کی تیاری میں تھے جب سلیمان، نائلہ کے ساتھ آ گیا۔ ان دونوں کو زارا کی سالگرہ کے بارے میں بالکل پتہ نہیں تھا۔ یہ نائلہ تھی جس نے شور مچایا تھا کہ ثناء آپی کی طرف جانا ہے پھر سلیمان کو مصطفیٰ سے ضروری کام بھی تھا، وہ دو دن کے لیے اسلام آباد تھا۔ مصطفیٰ سے ملنا لازمی تھا۔ نائلہ کو بھی ساتھ لے آیا۔

ثناء کا آئیڈیا تھا کہ حوریہ کو بھی بلوائیں گے۔ مصطفیٰ نے بھی تائید کی تھی، پھر اب سلیمان کے ساتھ نائلہ کو دیکھ کر مصطفیٰ کو شرمندگی سی ہوئی کہ انہیں بھی کہہ دیا جاتا تو اچھا تھا۔

دونوں گھرانوں کے دیرینہ تعلقات تھے، ایک ہی پڑوس میں رہنے کے باعث ملنا جلنا بھی تھا پھر سلیمان اور مصطفیٰ اکٹھے پلے بڑھے تھے۔ دونوں نے سی ایس ایس کے بعد اکٹھے پولیس ڈپارٹمنٹ جوائن کیا تھا۔ دوستی اور قربت بھی خوب تھی بلکہ اصغر اور ثمینہ دوستی کے اس رشتے کو مضبوط رشتے میں بدلنے کے خواہاں تھے۔ اگرچہ انہوں نے عملاً اس کا اظہار نہیں کیا تھا مگر دل میں تمنا بے پناہ تھی۔ یہ سلیمان تھا جس کی وجہ سے وہ اب تک دل کی بات زباں تک نہ لائے

تھے۔ وہ ہاتھ جو نہیں آتا تھا، وہ ثناء کو بہو بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

میڈیکل کے فورتھ ایئر کی طالبہ ثناء انہیں بے پناہ پسند تھی۔ شروع سے نگاہوں کے سامنے پلی بڑھی تھی۔ عام لڑکیوں کی سی تیز طراری اس میں نہ ہونے کے برابر تھی۔

سلیمان نے تو دوٹوک کہہ دیا تھا، ابھی اس کے پاس دو ڈھائی سال تک وقت نہیں ہے۔ ثمینہ ماں تھیں، ان کے تو سارے ارمانوں پہ اوس پڑ گئی۔ در پردہ انہوں نے اپنا مشن جاری رکھا ہوا تھا۔ سلیمان کو راضی کرنے کا جو فی الحال پورا ہوتا نظر نہ آتا تھا۔

سلیمان اور مصطفیٰ اپنی باتوں میں مگن تھے۔ چاروں لڑکیوں نے الگ ٹولی بنائی ہوئی تھی۔ ولید تو ضروری کام کا کہہ کر چلا گیا جبکہ تیمور نے وہیں محفل جمالی۔ خواتین کی موجودگی میں اس نے بور ہونا سیکھا ہی نہیں تھا۔ ایک سے ایک لطیفے سنا رہا تھا، شگوفے چھوڑ رہا تھا۔

ہنس ہنس کے نائلہ کے پیٹ میں تو بل ہی پڑ گئے۔ حالانکہ حوریہ کئی بار گھور چکی تھی، نگاہوں ہی نگاہوں میں سرزنش کر رہی تھی کہ اجنبی لڑکی ہے۔ پہلی بار اتنی بے تکلفی ٹھیک نہیں۔ پر وہ تیمور ہی کیا جو مان جاتا۔

"حوریہ! ایک منٹ میری بات تو سنیں۔" مصطفیٰ نے اسے روک لیا۔

اس نے دوپٹہ ماتھے تک لیا ہوا تھا، کان بھی ڈھکے چھپے تھے۔ اسے تو پہلے سے بڑھ کے اچھی لگی۔ کم کم ہی آمنا سامنا ہوتا۔ مصطفیٰ کی لاکھ کوشش کے باوجود بات سلام دعا سے آگے نہ بڑھتی۔ وہ گھر جاتا تو قصداً اِدھر اُدھر ہو جاتی۔ اصل میں شادی سے پہلے حوریہ کو کسی قسم کی بے تکلفی پسند نہیں تھی۔ مصطفیٰ سے آپ جناب کے دائرے میں رہ کر بات کرتی۔

"جی بولیں۔" اس نے ذرا کی ذرا...... پلکوں کی چلمن اُٹھا کر اسے دیکھا اور پھر فوراً ہی نگاہ چرالی۔ مصطفیٰ بڑے جذب سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اچھی لگ رہی ہیں۔" بڑا سادہ سا لہجہ تھا، یہ کہہ کر وہ اس کے آگے سے ہٹ گیا۔

نائلہ نے حوریہ کو پہلی بار دیکھا تھا، وہ اسے اچھی لگی تھی۔

"زارا! تمہاری ہونے والی بھابھی کی آنکھیں کتنی بڑی بڑی اور نشیلی ہیں۔" وہ اس کے کان میں منہ گھسیڑ کو بولی تو زارا اترا سی گئی۔

"ہاں، بھائی ان آنکھوں پہ ہی تو مر مٹے تھے۔" اس نے انکشاف کیا۔

"واقعی ایسے ہی لگتا ہے، پر معاف کرنا، یہ بڑی سمپل اور بیک ورڈ سی لگتی ہیں جبکہ مصطفیٰ

بھائی کتنے اَپ ٹوڈیٹ اور اسٹائلش سے ہیں۔" دل کی بات دل میں رکھنا نائلہ نے سیکھا ہی نہ تھا جو دل میں آتا، منہ پہ کہہ دیتی۔ زارا کو اس کی بات اچھی نہیں لگی۔ فوراً ہی وضاحت کرنے لگی۔

"مصطفیٰ بھائی کو حوریہ آپی کی انفرادیت اور سادگی نے ہی تو متوجہ کیا تھا، ورنہ ایک سے ایک الٹرا ماڈرن لڑکی تھی ان کے حلقے میں۔ ذرا انہیں دیکھو، کتنی باوقار اور معصوم سی لگتی ہیں۔ چھچھوری لڑکیوں والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ تھوڑا سا میک اَپ کر لیں تو بہت سی لڑکیوں سے اچھی لگیں مگر یہ خود ہی سادگی پسند ہیں اور ہمیں تو ہر روپ میں اچھی لگتی ہیں۔" زارا بھرپور انداز میں وکالت کر رہی تھی۔ نائلہ کو بریک سا لگ گیا، وہ چپ سی ہو گئی۔

حوریہ اور تیمور اجازت لے کر چلے گئے۔ سلیمان اور نائلہ ان کے جانے کے کافی دیر بعد اٹھے۔

نیندراں نہیں آندیاں
تیرے بنا نیندراں نہیں آندیاں
ساری رات لواں انگڑایاں

ولید کو نصیبو لال زیادہ ہی بھانے لگی تھی، جب ہی تو ٹیرس پر لٹکا باآواز بلند گا رہا تھا۔ تیمور کا ابھی تک نزول نہیں ہوا تھا، ورنہ وہ بھی سر میں سر ملاتا۔

جس سے اس کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا۔

آنکھیں الجھ جائیں کسی سے نہ میں ڈرتا ہوں
یارو! حسینوں کی گلی سے میں گزرتا ہوں!

ساجدہ باہر لان میں آچکی تھی، اس کی سوئی کشور کمار پہ اٹک سی گئی۔ فیروزی کپڑے، فیروزی جوتی کے ساتھ گہرے رنگ کی لپ اسٹک میں ساجدہ اپنے اوپر نازاں اور اترائی اترائی سی لگ رہی تھی۔ ولید حیران ہوتا تھا کہ وہ کپڑوں کے ساتھ سر سے پاؤں تک میچنگ ڈھونڈھ لیتی ہے۔ دیگر کپڑوں کے ساتھ فیروزی کپڑے بھی باریکی میں اپنی مثال آپ تھے۔

تیمور کی آواز پہ وہ بے چارہ اچھل ہی تو پڑا اور ناپسندیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا جیسے رنگ میں بھنگ ڈال دیا ہو کیونکہ اس کے آنے سے تھوڑی دیر قبل اس نے اپنی گناہگار آنکھوں سے ساجدہ کو ساتھ والے آفاق عالم سے نگاہوں ہی نگاہوں میں اشارے کرتے دیکھا تھا۔

''تم کر کیا رہے تھے؟''

''جھک مار رہا تھا۔'' وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔

''تمہیں اس کے سوا آتا کیا ہے۔''

تیمور، ساجدہ کی بل کھاتی لمبی چوٹی کی جگہ جسے وہ تیل لگا کر بڑے اہتمام سے باندھتی تھی، کھلے دراز بال دیکھ کر حیران سا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اس کے بال بہت خوبصورت تھے۔

''آؤ نیچے چلتے ہیں۔'' اس نے ولید کے گلے میں بازو ڈال کر گھسیٹا تو خلاف توقع وہ اس کے ساتھ آ گیا۔

۞

پروا، اللہ داد کے ساتھ نکلنے کی تیاری میں تھی۔ اماں بھاگ بھری نے خود اس کے بالوں میں کنگھی کر کے چوٹی بنائی۔ بادام کا حلوہ، ڈھیروں خشک میوہ جات ڈلوا کر انہوں نے رات اپنی نگرانی میں زینو سے تیار کروا دیا تھا۔

لائٹ پرپل سوٹ میں ملبوس وہ ہمیشہ کی طرح بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اماں بھاگ بھری نے اسے خود سے لپٹا لیا۔ آنسو جھر جھر اس کی آنکھوں سے بہنے لگ گئے تھے۔ اماں بھاگ بھری بھی ہمیشہ کی طرح آبدیدہ ہو گئی۔

آہنی گیٹ کھل چکا تھا۔ الوداعی نگاہوں سے حویلی کے در و دیوار کو دیکھتی وہ کالے شیشوں والی گاڑی میں آ بیٹھی۔ اس سے پہلے کہ اللہ داد گاڑی آگے بڑھاتا، سامنے سے آنے والی لینڈ کروزر نے اس کا راستہ روک لیا، وہ پریشان سا ہو کر نیچے اتر آیا۔

اس کے مقابل نواز کھڑا تھا۔ اس نے اللہ داد کے کان میں کچھ کہا تو وہ پریشان سا نظر آنے لگا۔

''بی بی سائیں! آپ اندر چلیں، ہم فی الحال نہیں جا رہے ہیں۔'' وہ اتنا کہہ کر سوال جواب کا موقع دیے بغیر نواز کے ساتھ لینڈ کروزر میں بیٹھ گیا۔

اس کی پریشانی حد سے سوا تھی۔

''پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے یہ سب۔'' وہ بڑبڑاتی اندر چلی آئی۔

۞

تو ہے میری میں ہوں تیرا (مگر میں نہیں ہوں)

آ جا میری بانہوں میں آ (ہائے میں شرم سے مر جاؤں)

دل میں میرے جو رہتا ہے (کون ہے وہ بدقسمت)

کیا تو نے اس کو دیکھا ہے (نہیں بابا ابھی تک یہ حادثہ نہیں ہوا)

''تیمور کے بچے! چپ کر جاؤ، میں ریاض کر رہا ہوں۔''

''اچھا، میں سمجھا آپ فریاد کر رہے ہیں۔''

''اچھا ٹھہرو تم ذرا۔'' ولید کو جلال میں سامنے پڑا بیٹ نظر آیا تو وہ اسی کو اٹھا کر تیمور کے پیچھے بھاگا۔ وہ سیدھا حوریہ کے پیچھے جا کر چھپنے کی کوشش کرنے لگا جو کھانا پکانے میں لگی ہوئی تھی۔

''میں کہتا ہوں سامنے آؤ۔'' ولید بڑے جارحانہ موڈ میں تھا۔

''آپ لوگ بچوں کی طرح ہر وقت لڑتے رہتے ہیں، میں ابو کو بتاؤں گی۔'' حوریہ ناراض سی لگ رہی تھی۔

''نہ نہ میری سویٹ بہنا! یہ ظلم نہ کرنا۔ آئندہ ہم نہیں لڑیں گے۔''

''وعدہ۔''

''پکا وعدہ۔'' وہ دونوں اس کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔

''اے بھائی! میں فیوچر پلاننگ کر رہا ہوں۔'' تیمور نے ولید کو اطلاع دی جو چھلے مٹر کے دانے اٹھا اٹھا کر منہ میں ڈال رہا تھا۔

''کیا سوچا ہے آخر، پتہ تو چلے۔'' وہ اس کی آنکھوں سے جھانکتی شرارت محسوس کر چکا تھا۔

''میرے پاس دو ہزار ہیں۔ دو ہزار میں بیس مرغیاں تو مل ہی جائیں گی۔ روزانہ بیس انڈے دیں گی۔ مہینے کے چھ سو انڈے اور اگر میں یہ انڈے فروخت کروں تو روز کے ایک سو بیس روپے اور سالانہ......اوہ میرے خدا......! دولت ہی دولت۔ میں ایسی مرغیاں لوں گا جو بڑے سائز کے انڈے دیں گی۔''

''پر تیمور صاحب! مرغیاں روز تو انڈے نہیں دیتیں۔'' ولید نے اسے سہانے خواب سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ اس نے سن کر بھی ان سنی کر دی۔

''میں ایسی مرغیاں لوں گا جو ہر وقت انڈے دیا کریں گی، یعنی انہیں انڈے دینے کے سوا کوئی کام نہیں ہو گا۔'' وہ مزے سے بولا تو حوریہ نے بمشکل اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔

''اچھا پتہ ہے دانت صاف نہ کرنے کے کیا فائدے ہیں؟'' ولید کی طرف سے نیا

سوال آیا پر تیمور کو سمجھ میں نہیں آیا، اس لیے سوچتی نگاہوں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''میرا مطلب ہے، دانت نہ صاف کرنے کے فائدے بتاؤ۔''

''اوہ اچھا......اچھا......اچھا......'' تیمور کا اچھا زیادہ ہی لمبا ہو گیا۔

''سب سے پہلے ٹوتھ پیسٹ کی بچت، ٹوتھ برش کی بچت۔''

''سب سے بڑا فائدہ بتاؤ۔''

''مجھے نہیں پتہ۔'' اس نے ہار مان لی تو ولید نے احسان کرنے والی نگاہوں سے اسے دیکھا اور سب سے بڑا فائدہ بتایا۔

''سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ دانت حساس نہیں ہوتے، مسوڑھوں سے خون نہیں آتا کیونکہ دانت بچتے ہی نہیں ہیں۔ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔ نہ روٹی چبانے میں دقت نہ بوٹی چبانے کی زحمت۔ آٹا گوندھ کر روٹی پکانے کے بکھیڑے سے بچاؤ۔ آٹا گھولو اور گلاس میں پانی ملا کر پی جاؤ۔ جس روز سبزی کھانے کا موڈ ہو، سبزی کو دیسی طریقے سے پیس لو یا جوس بنا کر پی جاؤ۔ ایک اور فائدہ، مصروف رہو گے۔ یعنی بوریت دور کرنے کا تیر بہدف نسخہ۔'' حوریہ چاول دم دینے کے بعد ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

''کتنے گندے ہیں آپ۔''

''ہماری بے وقوف سی بہن!'' ولید نے مسکراتی نگاہوں سے تیمور کو اشارہ کیا تو وہ سمجھ گئی کہ دونوں اسے تنگ کرنے کے موڈ میں ہیں، تب ہی تو وہ سنک میں پڑے برتنوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

دوپہر کا وقت تھا، حوریہ گھر میں اکیلی تھی۔ ولید اور تیمور صبح سے غائب تھے۔ چھٹی کا دن تھا۔ امی چھوٹی خالہ کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ ابو کچھ دیر پہلے شاہنواز انکل کی طرف جانے کے لیے نکلے تھے۔ حوریہ صبح جلدی اٹھ گئی تھی۔ اس کا ارادہ تفصیلی صفائی کا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے فارغ ہو کر نہائی تھی۔ اب اسے ٹھیک ٹھاک قسم کی بھوک لگ رہی تھی۔ صبح ناشتے میں دو سلائس لیے تھے، اب بھوک سے برا حال تھا۔

چاول پکانے کے ارادے سے اس نے پیاز کاٹ کر پتیلی چولہے میں رکھی۔ ساتھ

مٹروں کا پیکٹ نکالا۔ اتنے میں ڈور بیل بجنا شروع ہو گئی۔ اس کا خیال تھا، شاید بھائیوں میں سے کوئی ہوگا۔ پر گیٹ کھولنے پہ جو صورت نظر آئی، وہ مصطفیٰ کی تھی۔ وہ گھبرا سی گئی پھر ناچارا سے اندر آنے کا راستہ دیا۔

اس کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر حوریہ نے سب کی غیر موجودگی کی اطلاع بھی دے دی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، ایک بار پھر بیل گنگنائی، وہ خوش سی ہو گئی۔ یہ یقیناً بھائیوں میں سے کوئی ہوگا۔ اس کا قیاس تھا، پر اب کی بار ساجدہ تھی۔

حوریہ آج تک ان کے گھر نہیں گئی تھی اور نہ ساجدہ کبھی آئی تھی۔ کچھ مہینے قبل ساجدہ جب بیاہ کر آئی تھی تو امی سلامی دینے کے لیے ان کے ہاں گئی تھیں۔ اس کی ساس سے ان کے اچھے تعلقات تھے، اس لیے جب حامد کی شادی ہوئی تو وہ بطور خاص بارات کے ساتھ بھی گئی تھیں۔ اپنے گھر میں وہ چلتے پھرتے نظر آ ہی جاتی پھر آج اتنے قریب سے پہلی بار حوریہ نے دیکھا تھا۔ جدید تراش کا یہ سوٹ اس نے پہلی بار پہنا تھا۔

شرٹ کا گلا حسب روایت آگے پیچھے سے کافی گہرا تھا۔ فٹنگ قابل دید تھی۔ شہر آنے کے بعد ساجدہ نے بڑی تیزی سے شہری رنگ ڈھنگ اور جدید فیشن اپنائے تھے۔ حامد تو اس سے مرعوب اور دبا ہوا نظر آتا۔ تازہ بنی بھنوؤں اور فیشل میں وہ دیکھنے کی چیز لگ رہی تھی۔

ابھی جب وہ ان کے گھر کی بیل بجا رہی تھی تو اس کی آنکھوں میں ڈورے سے تیر رہے تھے۔ اس کا خیال تھا آج چھٹی ہے اور وہ اسمارٹ و شریر سا لڑکا گھر ہی پر ہوگا مگر یہ کیا گیٹ کھولنے والی اس کی بہن تھی۔ ساجدہ گڑبڑا سی گئی۔ فوراً نگاہوں کے زاویے درست کیے۔

''آئیں بھابھی! اندر آئیں نا، باہر کیوں کھڑی ہیں۔'' اس وقت ساجدہ کی آمد اسے کسی رحمت کے فرشتے کی آمد لگ رہی تھی۔ وہ سیدھی اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ مصطفیٰ، حوریہ کے ساتھ ایک اجنبی صورت کو دیکھ کر احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ ہمارے ساتھ والے گھر میں رہتی ہیں۔ ساجدہ حامد نام ہے، آپ دونوں بیٹھ کر بات کریں، ابھی آتی ہوں۔'' حوریہ بڑی ہلکی پھلکی سی ہو کر چائے کے ساتھ دیگر لوازمات تیار کرنے لگی۔

تھی تو بداخلاقی کہ اس نے دو مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور خود کچن میں آگئی پر یہ اس کی مجبوری تھی۔ ساجدہ نے بڑی گہری نگاہ سے مصطفیٰ کا جائزہ لیا۔ ٹوپیس سوٹ میں ملبوس

اپنے جاذب نظر نقوش کے ساتھ پہلی نظر میں ہی وہ اسے اچھا لگا۔ خود مصطفیٰ کو بھی اندازہ ہو گیا کہ یہ آگ لگاتے حسن کی مالک ساجدہ اسے بڑی توجہ سے دیکھ رہی ہے۔ اندر ہی اندر وہ مغرور سا ہو گیا۔

ایسا نہیں تھا کہ کوئی خوبصورت لڑکی اس نے پہلی بار دیکھی تھی پر ساجدہ جیسا شعلوں کو ہوا دیتا حسن اسے نے کم از کم پہلی بار دیکھا تھا۔

''نام کیا ہے آپ کا۔'' خود ساجدہ نے ہی تکلف کی دیوار گرانے میں پہل کی۔

''مجھے مصطفیٰ کہتے ہیں۔''

''اور آپ؟''

''میں ساجدہ ہوں۔'' وہ بڑے تفاخر سے بولی۔ اس کے حسن میں خاص قسم کی سرکشی اور بے باکی تھی۔ مصطفیٰ کو نگاہ چرانا مشکل ہو گیا۔ بہت جلد ساجدہ نے اجنبیت کی دیواریں گرا دیں۔ جب حوریہ چائے کی ٹرالی سمیت اندر داخل ہوئی تو وہ دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔

ساجدہ کی ہنسی کو تو بریک لگ گیا پھر مصطفیٰ نے باری باری حوریہ اور پھر ساجدہ کو غور سے دیکھا۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ حیران ہوا کہ آج سے پہلے اسے یہ فرق نظر کیوں نہیں آیا۔

چائے پینے کے بعد وہ واپس چلا گیا۔ ساجدہ بھی بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔

''حوریہ! اب تم ہمارے گھر آنا، تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں تو ایسے ہی آئی تھی کہ پڑوسیوں سے کبھی کبھار مل لینا چاہیے۔ اب پچھتا رہی ہوں کہ اتنی دیر کیوں کر دی۔'' وہ خلوص سے کہہ رہی تھی، بے چاری حوریہ شرمندہ سی ہو گئی۔

حامد آج بہت جلدی سو گیا تھا۔

ساجدہ نے بڑی نفرت سے سوئے ہوئے شوہر کو دیکھا۔ باون سالہ حامد کی عمر جس کے چہرے اور بالوں سے جھانک رہی تھی۔ شکست خوردگی جس کے سراپے سے عیاں تھی۔ جبکہ ساجدہ چڑھتی ندی، پرشور دریا کی مانند تھی۔ اکیس سال کی تھی بمشکل۔ بھرے بھرے رخسار، گلابی آمیزش لیے سرخ ہونٹ، نشیلی آنکھوں سمیت وہ بہت سوں کے ہوش اڑا سکتی تھی۔

اشرف علی کا گھرانا برسوں سے اس کالونی میں آباد تھا۔ ان کا کراکری کا چھوٹا سا کاروبار تھا۔ انہوں نے بڑی محنت کی اور لاکھوں میں کھیلنے لگے۔ جب وہ فوت ہوئے، اس وقت

حامد کاروبار کو بڑی کامیابی سے چلا رہا تھا۔

اشرف علی کو بیٹی کی طرف سے بڑی پریشانی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ میں پیدائشی نقص تھا۔ عطیہ بیگم ان کی شریکِ حیات اس غم کو سینے سے لگائے اگلے جہان سدھار گئیں۔ یہی غم ان کے دل کا بھی ناسور بن گیا تھا۔ اسی چکر میں بے چارہ حامد بیالیس سال کا ہونے کو آیا تھا۔ پر ابھی تک اس کے سہرے کے پھول نہیں کھلے تھے۔ کسی کو بھی اس کا خیال نہیں تھا۔ اگر تھا تو صرف سلمٰی کا، اس کی معذوری کا، اس کی گزرتی عمر کا۔

کبھی کسی نے اس سے نہیں پوچھا تھا کہ تمہیں کس بات کی سزا مل رہی ہے؟ اب تو اس کے دوست بھی مذاق کرنے لگے تھے کہ کب سہرا باندھو گے۔ ان کے لنگوٹیے دوست کا بیٹا چودہ برس کا تھا۔ مراد چھیڑتا۔ ''عدنان کے ساتھ ہی گھوڑے پہ بیٹھنا۔''

ماؤں کو بہو لانے کے بڑے ارمان ہوتے ہیں پھر اس کی اماں نے تو کبھی ایسے ارمان کا بھولے سے بھی ذکر نہیں کیا۔ ہمیشہ سلمٰی کے بارے میں ہی نصیحت کی۔ کسی کو بھولے سے بھی اس کا خیال نہیں آیا۔

سلمٰی، حامد سے پورے بارہ برس چھوٹی تھی، تب ہی اتنی لاڈلی تھی کہ اشرف کو بیٹے کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ انہوں نے حامد سے زیادہ بیٹی کو محبت دی جس کا احساس سلمٰی کو بھی تھا۔

ساجدہ، والدین کے انتقال کے بعد اس ڈھلتی عمر میں اس کی زندگی میں خوشگوار جھونکے کی مانند آئی تھی۔ ساجدہ کے ساتھ اس کی شادی دور پرے کی ایک رشتہ دار نے کرائی تھی۔

ساجدہ کا نمبر نو بہن بھائیوں میں تیسرا تھا۔ گھر میں غربت کا بسیرا تھا، ایسے میں حامد کا رشتہ کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ جہیز کے نام پہ اس نے ایک پائی تک نہ لی بلکہ الٹا شادی کے اخراجات کے نام پہ ٹھیک ٹھاک موٹی رقم ساجدہ کے بابا کو دی۔

ساجدہ دل سے اس رشتے پر راضی نہ تھی۔ مارے باندھے اس نے حامد کا ساتھ قبول کیا تھا۔ وہ سرکش ندی تھی اور حامد ڈھلتی چھاؤں تھی۔

بیاہ کے شہر میں آتے ہی اس نے بڑی تیزی سے خود کو یہاں کے ماحول میں ڈھالا تھا۔ اسے اپنے حسن کی طاقت کا پورا طرح احساس تھا۔ سو نمائش کرنے میں وہ ہرج نہیں سمجھتی تھی۔

سوئے ہوئے حامد کی طرف سے اس نے کروٹ لے لی اور قدرے دور کھسک آئی۔ حامد کا منہ دوسری طرف تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے خیالوں میں بڑی دور نکل آئی۔

”مجھے بارش اچھی لگتی ہے مگر صرف تمہارے ساتھ۔ برستی بارش میں ہماری شادی ہو۔ تم میرے پاس ہو، میں تمہیں دیکھتا رہوں۔“ ایاز کی آواز اس کے پاس ہی تو گونج رہی تھی۔ ایاز اس کے بچپن کا ساتھی پھر جوانی کا اولین خواب جو پورا نہ ہو سکا اور اس کے لالچی ماں باپ نے اسے اس بوڑھے کے حوالے کر دیا۔

غصے سے اس کے لہو میں آگ سی دہکنے لگی۔ اس نے پاس پڑے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا اور پینے لگی پھر آگ سرد ہونے کے بجائے اور بھی تیزی سے پھیلنے لگی...... حامد سے نفرت میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ نفرت تو آگ سے بھی زیادہ تیزی سے پھیلتی ہے پھر کسی کا خیال اسے سرشار کر گیا۔

مصطفیٰ کی ستائشی نگاہ اس کے لیے کسی نشے سے کم نہ تھیں پھر آفاق عالم کی حالت، اسے غرور سا ہونے لگا۔

بھرے لبوں پہ خواب ناک مسکراہٹ رینگنے لگی۔

❁

سلیمان نے یونیفارم پہن کر دوبارہ ریوالور کا چیمبر چیک کیا۔ اندرونی خلفشار سے اس کا خوبرو چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ محمود بابا ناشتے کا کہہ رہے تھے، اس نے اشارے سے انہیں منع کر دیا۔

حمید جوکھیو کے ٹھکانے تک پہنچنے میں اس کا ذہن مسلسل سوچوں میں غلطاں و پیچاں رہا۔ وعدے کے مطابق وہ اکیلا ہی آیا تھا۔ اپنی حفاظت کے خیال سے صرف ایک سروس ریوالور اس کے پاس تھا۔ ایک پولیس آفیسر ہونے کے ناطے اس کا اپنے ماتحتوں سے کہنا تھا کہ بڑے فائدے کے لیے چھوٹے موٹے نقصان کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے پھر جرائم پیشہ لوگوں کی فطرت اس پہ آشکار تھی۔ انہیں زبان اور وعدے کا پاس ہوتا ہے، اسی یقین کے سہارے وہ یہاں بے خوفی سے چلا آیا تھا۔

حمید جوکھیو بڑے تپاک سے ملا جیسے وہ گہرے دوست ہوں۔

”اس وردی کے وقار کا تم نے خیال رکھا ہے، اس لیے مجھے پسند بھی ہو۔ ہماری اور قانون کی کبھی نہیں بنی ہے مگر میں تم جیسے آفیسر کی عزت کرتا ہوں......“

سلیمان پہلو بدل کر رہ گیا۔

”اب اصل بات کی طرف آتے ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ حمید جوکھیو خود کو قانون کے

حوالے کر کے اپنے جرائم کا اعتراف کرے تو اس کے لیے تمہیں مجھ سے ایک ڈیل کرنی پڑے گی پھر یہ ڈیل صرف ہم دونوں کے درمیان ہوگی، کوئی تیسرا نہیں۔“ وہ اپنی بات کہہ کر اس کا ردعمل اس کے چہرے پہ تلاش کر رہا تھا۔

”کون سی ڈیل؟“ سلیمان حیران ہوا۔

”وہ ڈیل یہ ہے۔“ اس نے سلیمان کے عین سر پر دھماکا کیا اور پھر دھیرے دھیرے بتانے لگا۔

”میں سوچوں گا۔“ اس جیسے مضبوط اعصاب کا مالک بھی لحہ بھر کو گڑبڑا گیا۔ حمید جوکھیو نے بات ہی ایسی کی تھی۔

”سوچنے پہ پابندی نہیں، یاد رکھنا تمہاری پوری فورس بھی مل کر میرے خلاف کچھ نہیں کر سکتی، اور میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ نواز اس دوران بڑی خاموشی سے دونوں کے چہروں کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتا رہا۔ وہ بڑے چوکنا انداز میں مستعد کھڑا تھا۔

اتنے میں ادھیڑ عمر ملازم کھانے سے لدی پھندی ٹرالی لے آیا پھر سلیمان نے لاکھ اصرار کے باوجود کسی چیز کو نہیں چکھا سوائے چائے کے۔ حمید جوکھیو اس کے ساتھ گاڑی تک آیا۔

”میری بات دھیان میں رکھنا۔“ وہ سلیمان سے نرمی سے بولا جو ہرگز اس کا انداز نہ تھا۔

اسے قسمت کی ستم ظریفی پہ ہنسی آگئی۔ جرائم کی دنیا کا بے تاج بادشاہ جس کے ایک اشارے پر بے گناہ لوگوں کو خون میں نہلا دیا جاتا تھا، وہ اس سے درخواست کر رہا تھا جو لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا تو ان کی روحیں فنا ہو جاتیں۔ آج اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

تو کیا وہ اس کی بات مان لے یا پھر اپنی طاقت پہ بھروسہ کرے۔ یہ بھی تو حقیقت تھی کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے اب تک اس کا کچھ نہ بگاڑ پائے تھے۔ اس کا ہر جرم قانون کی بے بسی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ وہ ہاتھ آئی چکنی مچھلی کی طرح پھسل پھسل جاتا۔ کئی بار حمید جوکھیو سے سامنا ہوتا، وہ کسی فاتح کی شان سے سر اٹھائے گزر جاتا۔ یہ بات طے شدہ تھی، اگر وہ بذاتِ خود کو قانون کے حوالے نہ کرتا تو اس کی گرد کو بھی پانا مشکل تھا۔ سلیمان کو بطورِ خاص اس کیس کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔

چار ماہ سے وہ اس معاملے میں ہر ممکن حربہ آزما چکا تھا۔ اس کے خاص بندوں کو توڑنے کی کوشش کی۔ سب کوششیں رائیگاں گئیں۔ اسے اب صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اس مشن میں ناکام

ہوگا۔ سکھر میں اس کا یہ آخری کیس تھا کیونکہ پوسٹنگ آرڈرز آچکے تھے۔ وقت نکال کے وہ اسلام آباد بھی گیا، مصطفیٰ سے ذکر کیا کہ شاید مشکل کا کوئی حل نکل آئے پر سب بے سود، ہر تدبیر ناکام۔

رات کو اس نے مصطفیٰ کو فون کیا، وہ خود آج کل ایک بڑے کیس پہ کام کر رہا تھا۔ اسی میں پھنسا ہوا تھا۔ سلیمان کافی دیر حمید جوکھیو کی کیس فائل کو از سر نو دیکھتا رہا۔ ایک ایک پوائنٹ کو نوٹ کیا مگر کوئی قابلِ ذکر بات سامنے نہیں آئی۔

''حمید جوکھیو ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ کاش تم مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتے تو کبھی بھی یہ بات نہ کہتے۔ خیر تمہاری مرضی۔'' سلیمان کے لبوں پر اسراری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

وہ جب سونے کے لیے بیڈ پہ لیٹا تو فیصلہ کر چکا تھا۔ بے رحم فیصلہ کیونکہ حمید جوکھیو اور اس سے وابستہ کسی بھی شخص کے لیے اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ جو لوگ دوسروں کے جگر کے ٹکڑوں کو اہمیت نہیں دیتے، ان کے دل میں اپنی اولاد کے لیے محبت کیوں آجاتی ہے اور کیونکر آجاتی ہے؟ اولاد تو والدین کے لیے بڑا امتحان ہوتی ہے اور حمید جوکھیو کی یہی اولاد اسے امتحان میں ڈالنے والی تھی۔

سلیمان گیلانی کی گرفت میں آئے بڑے بڑے بے رحم گھبرا جاتے تھے اور حمید جوکھیو جیسا زمانہ ساز اس پہ یہ فیصلہ۔ کبھی کبھی اچھوں سے بھی غلطی ہو جاتی ہے اور حمید جوکھیو نے اپنی زندگی میں ہی ایک بڑی غلطی کر لی تھی۔

''نواز! کہیں بھی کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔'' حمید جوکھیو تمام انتظامات مکمل ہونے کے بعد ابھی تک مطمئن نہیں تھا، اس لیے تھوڑی تھوڑی دیر بعد نواز کے پاس آکر جائزہ لینے لگ جاتا۔

جونہی سلیمان کی گاڑی دھول اڑاتی حویلی کے داخلی گیٹ کی طرف بڑھی، فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ مقامی رواج کے مطابق یہ بھی خوشی منانے کا انداز تھا۔ سلیمان نیچے اترا حمید جوکھیو خود اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس کی ہم راہی میں وہ اندر آیا، جہاں شاندار مہمان خانے میں کچھ اجنبی صورتیں بھی موجود تھیں۔

وہ وہیں صوفے پر بیٹھ گیا، اس کے ساتھ دائیں سائیڈ پہ حمید جوکھیو تھا جو بہت خوش لگ رہا تھا۔

سلیمان نے اپنی اندرونی حالت پہ قابو پایا، جہاں تلاطم سا برپا تھا۔

ابھی کچھ ہی دیر میں وہ حمید جوکھیو جیسے خونی دہشت گرد کا داماد بننے والا تھا۔ ان کے درمیان یہی طے پایا تھا۔ اگر سلیمان اس کی بیٹی سے شادی کر کے تحفظ دے دیتا ہے تو وہ بخوشی خود کو قانون کے حوالے کر دے گا۔ اپنے تمام جرائم کا اعتراف کرے گا۔ بس اسے اپنی بیٹی کا تحفظ درکار تھا۔

حمید جوکھیو کا اس دنیا میں پروا کے سوا کوئی نہیں تھا، سب مر کھپ گئے تھے۔ جرائم کی راہ پر خار میں قدم رکھنے کے بعد اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے بعد پروا بے سائبان ہو جائے گی۔ وہ شاید یہ فیصلہ نہ کرتا، اگر اس پہ یہ ہولناک انکشاف نہ ہوتا۔ ڈاکٹرز کی رپورٹس بھی ایک بات کہہ رہی تھیں اسے تھروٹ کینسر ہے۔

حمید جوکھیو کے پاس وقت کم تھا۔ اب تو اس کی حالت بھی اس کی بیماری کا اعلان کرنے لگی تھی۔ اس کے پاس صرف تین چار ماہ تھے۔

واپس آکر اس نے سلیمان کو آفر کی، وہ سوچ میں پڑ گیا۔ حمید جوکھیو نے اس کے خاندان کے بارے میں تحقیق کی۔ اسے وہ ہر لحاظ سے پروا کے قابل نظر آیا۔ اسے پتہ تھا، اگر اس کے مخالفوں کو اس کی بیماری کے بارے میں پتہ چل جائے تو وہ خوشی کے شادیانے بجائیں گے اور اس کے سارے حمایتیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیں گے۔

پروا اس کی واحد اولاد ہونے کے ناطے اس کے مخالفوں کے عتاب کا نشانہ بھی بنتی۔ اس کے بعد جانے اس کا کیا حشر ہوتا۔ اسی بات نے اسے سلیمان کے سامنے جھکنے پر مجبور کیا۔ اس کی بے خوفی، سچائی اور خاندانی شرافت حمید جوکھیو کو بھائی تھی۔ یہ ڈیل کر کے اس نے جوا کھیلا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سلیمان گیلانی دھوکا نہیں کرے گا، نہ اپنے قول سے پھرے گا۔

پروا اس کے پاس محفوظ رہے گی۔

پروا نے ساری زندگی ہوسٹلز میں گزاری تھی۔ اس کی رضامندی کے بعد ہی وہ حویلی آتی اور کڑے پہرے میں لوٹ جاتی۔ اس کے نزدیک اس کے بابا سائیں مصروف ترین کاروباری شخصیت تھے۔

سلیمان گیلانی، حمید جوکھیو کے کیس پر کام کر رہا تھا۔ اسے سلیمان کے بارے میں سب پتہ تھا۔ اس کے گھر والے اسلام آباد میں مقیم تھے۔ وہ سلجھے ہوئے مزاج کا مخلص اور فرض شناس نوجوان تھا۔ اتفاقاً ان دونوں کا آمنا سامنا ہوا، تب ہی نہ جانے کیوں حمید جوکھیو کے دل

نے آرزو کی کہ یہ اس کی پروا کا مقدر بن جائے۔

تب وہ خود اس سے ملا۔ بے خوفی اور دلیری سلیمان کے مزاج کا طرہ امتیاز تھا۔ وہ اس سے بالکل بھی مرعوب نہیں ہوا پھر حمید جوکھیو کے ذہن نے نئی کروٹ لی۔ اس نے نواز سے مشورہ کیا پھر اس کے بعد سلیمان سے بات کی۔ اس نے سوچنے کی مہلت مانگی پھر کچھ شرائط کے بعد راضی ہو گیا۔ اب اسی کے نتیجے میں وہ حویلی میں بیٹھا سخت اندرونی خلفشار کا شکار لگ رہا تھا۔

گھر میں کسی کو کچھ پتہ نہ تھا اور وہ یہاں حمید جوکھیو کی بیٹی سے نکاح کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اس نے صاف کھلے لفظوں میں واضح کر دیا تھا کہ فی الحال کسی کے علم میں لائے بغیر وہ نکاح کر رہا ہے، وہ آہستہ آہستہ گھر والوں کو ہموار کرے گا۔ اس کے بعد اپنی سہولت اور آسانی کے مطابق اپنی منکوحہ کو رخصت کروا کر لے جائے گا۔

ہو سکتا ہے کہ اس کے گھر والے مخالفت کریں۔ وہ اعتراض کر سکتے تھے۔ ایک مجرم کی بیٹی کو بطور بہو قبول کرنے سے انکار کر سکتے تھے، کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ حمید جوکھیو سن کر چپ رہا تھا۔ فی الوقت اس کے سامنے یہی مقصد تھا کہ کسی طرح جلد از جلد پروا سلیمان گیلانی کی بیوی بن جائے۔ اس کے بعد وہ سکون سے مر تو سکے گا۔

وہ سلیمان کے تحفظ میں ہوگی، وہ اپنی عزت کی حفاظت تو ضرور کرے گا۔ پروا محفوظ ہاتھوں میں ہوگی، اس لیے سب کچھ جلدی جلدی طے پایا۔

حمید جوکھیو کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ ان دنوں وہ بے پناہ تکلیف سے گزر رہا تھا مگر آج وہ ساری تکلیفوں کو بھولا ہوا تھا۔

''اماں کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' حیرت کی زیادتی سے وہ انہیں تکنے لگ گئی تھی۔

''بیٹا! تم یہ کپڑے پہن لو، وقت کم ہے۔ تمہاری تیاری کا انتظار ہے۔ بس مالک تمہیں دولہن بنا دیکھنا چاہتے ہیں۔'' اماں بھاگ بھری رسان سے اس کے ہاتھ تھام کر پچکارتے ہوئے بولی تو اس نے دوسرا سوال نہیں کیا اور کپڑے ان کے ہاتھ سے لے لیے۔

اتنے میں بابا سائیں بھی آ گئے۔ پروا کی آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے لبریز ہو گئے۔ حمید جوکھیو نے اس کا سر سینے سے لگا لیا۔

''تمہاری ماں زندہ ہوتی تو ساری حسرتیں پوری کرتی، تمام ارمان نکالتی۔ خیر رخصتی پر

ساری کسر نکل جائے گی۔ حمید جوکھیو کی بیٹی کی شادی دھوم دھام سے ہوگی۔ سارا گاؤں دیکھے گا۔'' وہ خود کو یقین دلا رہا تھا۔

''مالک تمہیں بہت سی خوشیاں دے گا۔'' وہ ان کے سینے سے لگی رو رہی تھی۔

ٹھنک تو وہ اسی روز گئی تھی جب نواز اچانک حویلی آیا اور بابا سائیں کی آمد کا بتایا تھا۔

ماحول کچھ روز سے ویسے بھی پراسرار تھا۔ اب صبح یہ عقدہ کھلا جب اماں بھاگ بھری نے یہ اطلاع دی کہ اس کا نکاح ہو رہا ہے۔

زندگی کے اس موڑ کے بارے میں اس نے سوچا تک نہ تھا کہ اتنی جلدی آئے گا۔ ایک اجنبی کو اس کے تمام تر اختیارات سونپے جا رہے تھے جس کی شکل اور نام تک سے وہ ناواقف تھی۔

بے دلی سے اس نے بیش قیمت عروسی سوٹ زیب تن کیا۔ سکھاں، اماں بھاگ بھری کے ساتھ اس کے خاندانی زیورات کا نقشین باکس کھولے بیٹھی تھی۔ ایک ایک کر کے تمام زیورات اسے پہنائے گئے۔ شہر سے بطور خاص لائی گئی بیوٹیشن اسے مہندی لگا چکی تھی۔ وہ مہندی سوکھنے کے انتظار میں بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

سکھاں نامحسوس انداز میں اس کا جائزہ لے رہی تھی، نہ جانے کیوں اسے وڈیری پر ترس آ رہا تھا۔ زینو نے ڈیک لگایا ہوا تھا جو اونچے سروں میں خوشی کے نغمے بجا رہا تھا۔ پروا کے دل میں خوف اور اندیشے تھے۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا، جہاں ناامیدی کالے ناگ کی طرح پھن کاڑھے بیٹھی تھی۔ سکھاں، زینو سے سرگوشی میں کہہ رہی تھی۔

''میں بی بی سائیں کے شوہر کو دیکھ کر آئی ہوں، بڑا گھبرو جوان ہے۔ کافی مغرور لگ رہا ہے پر ہماری بی بی بھی کم نہیں ہے۔'' زینو اس کے جواب میں بولی تو سکھاں نے بھی تائید کی۔

''مبارک ہو مبارک ہو۔'' جوں ہی سلیمان نے سائن کیے مبارک باد کی آوازیں آنے لگیں۔ حمید جوکھیو نے اٹھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

''میری بیٹی بہت معصوم ہے، اسے کوئی دکھ نہ دینا۔'' (حمید! تم کتنے گھروں کے چراغ گل کر کے یہ بات کہہ رہے ہو۔ میری بیٹی کو دکھ نہ دینا۔ دوسروں کو بیکراں دکھوں کے سمندر کے سپرد کر کے یہ بات تمہاری زبان سے بہت تمسخرانہ لگتی ہے) وہ صرف سوچ سکا۔

کمرے میں جو لوگ بیٹھے تھے، ایک ایک کر کے اٹھ گئے۔ تب اماں بھاگ بھری،

سلیمان کے پاس آئیں۔ ''آپ اپنی دولہن سے مل لیں اور دیکھ لیں۔'' اس وقت یہاں ان دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ حمید جوکھیو پہلے ہی اٹھ چکا تھا۔ سلیمان نے اماں بھاگ بھری کا بے تاثر چہرہ دیکھا اور پھر اس کے ساتھ ہولیا۔

رواج کے مطابق پروا کا چہرہ گھونگھٹ کی آڑ میں تھا۔ اماں بھاگ بھری اسے یہاں چھوڑ کر الٹے قدموں لوٹ گئی۔ سلیمان نے ایک اچٹتی سی نظر حمید جوکھیو کی بیٹی پہ ڈالی۔ نکاح نامے میں حمید جوکھیو کی خواہش پہ معمولی سا حق مہر لکھوایا گیا تھا۔ سلیمان کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں رینگ گیا۔

ہزار کی نوٹوں کے گڈی اس نے پروا کے قریب کچھ کہے بغیر رکھ دی۔ اسے اپنی منکوحہ کا چہرہ دیکھنے کی نہ خواہش تھی، نہ آرزو اور نہ ہی وہ کوئی دلی تعلق اس سے بنانا چاہتا تھا۔ سو اس نے اس رشتے کو بھی ڈیل کے طور پر قبول کیا تھا جس خاموشی سے وہ آیا تھا، اسی خاموشی سے لوٹ گیا۔

پروا نے بھی سلیمان کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو گھٹنوں میں منہ دیے اس وقت سے مسلسل رو رہی تھی۔ سلیمان کے قدموں کی آہٹ اسے صاف محسوس ہوئی تھی۔

اماں بھاگ بھری نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ آرہا ہے۔ جاتے قدموں کی آہٹ اس کی سماعتوں سے دور ہوئی تو اس نے سر اٹھایا۔

نوٹوں کی گڈی سامنے پڑے دیکھ کر جانے کیوں اسے تاسف سا ہوا۔ یہ اس کا نکاح نامے میں لکھوایا حق مہر تھا۔ اس کے ہم سفر نے ادا کرنے میں بڑی جلدی کی تھی۔

''دیکھا مالک نے کتنا سوہنا گھبرو دولہا ڈھونڈا ہے میری بیٹی کے لیے۔'' اماں بھاگ بھری نے اپنے تئیں اس کے ساتھ شرارت کی تھی پھر پروا کا چہرہ بے تاثر ہی رہا۔

وہ کچھ سوچ رہی تھی، اس کی سوچوں کی تہہ تک اترنا کم از کم اماں بھاگ بھری کے بس کی بات نہ تھی۔

❁

''یار و معاف کر دو نا اب۔'' پروا نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے پر زارا کا موڈ ٹھیک نہ ہوا۔ پروا کل واپس آئی تھی اور آتے کے ساتھ ہی سب سے پہلے زارا کو فون کیا۔ آج وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔

''یہ مہندی کب لگائی تم نے۔'' زارا ناراضی اور غصہ بھول بھال کر اس کے مہندی لگے

ہاتھوں کو مشکوک نگاہوں سے گھورنے لگ گئی تو فوری طور پر پروا سے کوئی جواب ہی نہ بن پڑا۔

''کہیں تمہاری منگنی تو نہیں ہوگئی ہے۔''

''ارے نہیں، نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے زور وشور سے تردید کی۔

زارا کے اچانک سوال سے گھبرا تو وہ بھی گئی تھی پھر اپنے ہم سفر کے بارے میں وہ کیا بتاتی۔ کون ہے، کیسا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ نہ تو بابا سائیں اور بھاگ بھری نے اسے بتایا تھا، نہ خود سے اس نے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ اسے کچھ معلوم کرنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔

عین نکاح سے دو گھنٹے پہلے اسے بتایا گیا تھا کہ آج اس کی شادی ہے پھر اس کا شوہر اس کے پاس آیا اور اس کو دیکھے بنا واپس چلا گیا۔ حق مہر کی رقم واپس رکھ کر۔ کیا ستم ظریفی تھی۔ پروا نے اسے دیکھا تک نہ تھا۔

چوروں کی طرح اس کا نکاح ہوا، نہ کوئی دھوم دھام، نہ کوئی شور شرابا۔ عجیب گورکھ دھندا تھا۔

اب زارا کے سوال اسے گھبراہٹ میں مبتلا کر رہے تھے۔ ''وہ تو گاؤں میں ایک شادی تھی، اس لیے وہیں مہندی لگائی میں نے۔'' اس کو جواب سوجھ ہی گیا۔

''واہ بہت زبردست ڈیزائن ہے۔ مجھے ذرا فائل پر اتارنے دو۔ مصطفیٰ بھائی کی شادی پر کام آئے گا۔''

''کب ہے مصطفیٰ بھائی کی شادی؟''

''حوریہ بھابھی کے اگلے مہینے ایگزام ہیں، اس کے بعد ہی ہوگی۔ ارے ہاں، یاد آیا۔ ہماری بھی ڈیٹ شیٹ آج کل میں آنے والی ہے۔''

''واقعی۔''

''ہاں، سب کہہ رہے ہیں۔'' وقتی طور پر گفتگو کا رخ مڑ گیا تو پروا بھی سب کچھ بھول بھال کر امتحانات کی پریشانی میں کھوگئی۔

❁

وعدے کے مطابق حمید جوکھیو نے بیٹی کے نکاح کے ٹھیک سولہویں دن خود کو قانون

کے سپرد کر دیا۔ یہ سولہ دن اس نے بہت ضروری کام نمٹانے میں گزارے تھے۔ تمام رقم اور اثاثے پروا کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرائے، اس کے لیے اسلام آباد میں گھر خریدا۔ نواز کے ذریعے انٹیریئر ڈیکوریٹر سے ڈیکوریٹ کرایا۔ اس کام کے لیے اس نے پیسہ پانی کی طرح بہایا۔

اپنی وصیت لکھی۔ پروا کے نام خط لکھ کر اپنے تمام جرائم کے بارے میں بتایا۔ سلیمان سے ڈیل کا ذکر کیا۔ ان تمام کاغذات کو اس نے لاکر میں رکھوایا اور چابی نواز کو دے دی۔ ان کاغذات میں پروا کا نکاح نامہ بھی تھا۔ ''میری موت کے بعد سب پروا کو دے دینا۔'' اس نے نواز کو ہدایت کی۔

اس نے بڑے سکون سے اپنے ایک ایک جرم کا اعتراف کیا۔ اسے اب کوئی خوف نہ تھا کیونکہ ڈاکٹرز کے کہنے کے مطابق اس کی زندگی بہت تھوڑی تھی۔ حمید جوکھیو کو کڑی نگرانی میں رکھا گیا تھا۔

سلیمان نے اس کی گرفتاری کے بعد پریس کانفرنس بلائی۔ اس کی پروموشن ہو چکی تھی۔ سکھر میں یہ اس کا آخری دن تھا۔ اپنے یہاں قیام کے دوران اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی تھی جو اس کے نصیب میں لکھی تھی۔ حمید جوکھیو کی گرفتاری آسان تو نہ تھی۔

اب اسے اسلام آباد جا کر اختیارات سنبھالنے تھے۔ اپنی اس کامیابی سے وہ بہت خوش تھا۔ نائلہ تو اس کے پیچھے پڑ ہی گئی۔

''بھائی جان! اب تو بہت ہی زبردست سی ٹریٹ دینی پڑے گی۔ آخر کو ایس پی بن گئے ہیں۔''

''اچھا لالچی لڑکی! دے دوں گا ٹریٹ۔'' اس نے جان چھڑائی۔ ثمینہ نے اپنے کڑیل جوان بیٹے کو بڑے پیار سے دیکھا اور نظر بد سے بچنے کی دعا کی۔

حمید جوکھیو کو پولیس کسٹڈی میں ایک ماہ سے زائد ہو چکا تھا۔ اخبارات میں اس خبر کو آنے سے روک دیا گیا تھا اور پوری راز داری برتی جا رہی تھی۔ اس کے گلے کی تکلیف دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔

نواز نے پروا کو حمید جوکھیو کے کہنے کے مطابق ہی بتایا تھا کہ وہ کاروباری مصروفیت کی وجہ سے لندن میں طویل عرصے تک قیام کرے گا۔ اس ایک مہینے کے دوران پروا کی بابا سائیں

سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ہاں نواز کے ذریعے ان کی خیریت کی اطلاع ملتی رہتی۔

پروا کے ایگزام ختم ہو چکے تھے، اس کے ساتھ ہی اس کے ہوسٹل میں رہنے کا جواز بھی۔ اس بار نواز اسے خود لینے آیا۔ گاڑی جانے پہچانے سکھر کے راستوں کے بجائے اسلام آباد کی سڑکوں پر گھومتی رہی اور بالآخر خوبصورت سے مکان کے کالے گیٹ کے آگے رک گئی۔

''نواز کیا ہے یہ سب؟'' وہ یہ معمہ جلد از جلد حل کر لینا چاہتی تھی۔

''بی بی سائیں! یہیں کھڑے کھڑے سب پوچھیں گی۔'' اس نے وقت کی نزاکت کا احساس دلایا تو پروا شرمندہ سی اس کی ہمراہی میں اندر آ گئی۔ جہاں بجری روش کے دائیں بائیں بڑے خوبصورت پودے ایک قطار میں لگے تھے۔

اماں بھاگ بھری کی شفقت بھری بانہوں نے اس کا استقبال کیا۔ حیرت کے اس جھٹکے سے وہ بمشکل سنبھلی۔ ''بی بی سائیں! یہ گھر آپ کے نام پہ وڈیرا سائیں نے خریدا ہے تا کہ آنے جانے کی زحمت سے بچیں۔ رزلٹ کے بعد آپ نے یونیورسٹی میں داخلہ لینا ہی ہے، اس لیے انہوں نے آپ کو یہ سرپرائز دیا ہے۔'' نواز نے مختصراً بتایا۔

''کتنا خوبصورت گھر ہے یہ زارا خوشبو، ارم اور ثانیہ کتنا خوش ہوں گی۔'' پروا بہت مسرور نظر آ رہی تھی۔ اماں بھاگ بھری نے سکون کا سانس لیا کہ یہ مشکل مرحلہ بھی سر ہوا۔

پروا نے دوسرے دن زارا اور باقی دوستوں کو یہ خبر سنائی تو سب نے اس سے ٹریٹ مانگی۔

بدھ کی شام سب اس کے یہاں جمع تھیں۔

''پروا! تمہارا گھر کتنا خوبصورت ہے۔ انٹیریئر ڈیکوریشن تو غضب کی ہے۔'' ثانیہ نے تعریف کی تو وہ خوشی سے نہال ہو گئی۔

''یہ سب میرے بابا کی چوائس ہے۔'' اس نے فخر سے بتایا۔

''یار! تمہارے بابا سائیں سے مجھے ملنے کا بہت شوق ہے۔ کبھی ملواؤ نا۔'' زارا نے اشتیاق دکھایا تو وہ یکدم ہی اداس نظر آنے لگی۔

''وہ زیادہ تر کاروباری دورے پہ باہر ہی رہتے ہیں۔ اب بھی انگلینڈ میں ہیں۔ جب یہاں آئے تو ضرور ملواؤں گی۔''

''پروا! اتنے بڑے گھر میں تم اکیلی رہتی ہو۔'' ارم نے احمقانہ سا سوال کیا۔

''میرے بابا سائیں کا کوئی بہن بھائی تھا ہی نہیں۔ اماں کے ایک بھائی تھے، وہ بھی

حیات نہیں ہیں اور میں تھی ہی اکلوتی، سدا سے اکیلی اور تنہا۔" اس کی آواز بھیگ گئی تو زارا نے اسے ساتھ لگا لیا۔

"کیوں تم اکیلی ہو، ہم ہیں نا۔ میری مما تمہیں بیٹیوں کی طرح نہیں چاہتیں، مصطفیٰ بھائی تمہیں مجھ سے کم سمجھتے ہیں۔ ثناء آپی کا رویہ تمہارے ساتھ بڑی بہن والا نہیں ہے۔" زارا کی ڈانٹ پہ وہ مسکرا دی تو ماحول کا بوجھل پن دور ہو گیا۔

"اب کل تم سب کو آنا ہے، سارا دن اکٹھے گزاریں گے بلکہ مجھے شاپنگ بھی کرنی ہے۔ مل کے جائیں گے تو مزا آئے گا۔ کیوں ثانیہ، ارم!" اس نے باقیوں سے بھی تائید چاہی تو ان تینوں نے معذرت کر لی۔

پر زارا ہی کیا جو آسانی سے مان جاتی۔ راضی کر کے ہی دم لیا۔

دوسرے روز دس بجے کے قریب زارا، ثانیہ کے ساتھ آدھمکی۔ وہ ایک کتاب میں کھوئی ہوئی تھی۔

مجھ سا جہان میں کوئی نادان بھی نہ ہو
کر کے جو عشق کہتا ہے نقصان بھی نہ ہو
خوابوں سے دلنواز حقیقت نہیں کوئی
یہ نہ ہو تو درد کا درماں بھی نہ ہو
محرومیوں کا آج تک ہم نے گلہ نہیں کیا
لیکن یہ کیا کہ دل میں ارماں بھی نہ ہو

"کیا پڑھا جا رہا ہے۔" ثانیہ نے اس کے ہاتھ سے سعد اللہ شاہ کا مجموعہ کلام "مجھے بادل اٹھا لائے" تقریباً جھپٹا۔

"تم لوگ کب آئے۔" وہ بیڈ سے اتر آئی۔

"ابھی ابھی جب آپ شعر و شاعری میں کھوئی ہوئی تھیں۔ ویسے کوئی اور چکر تو نہیں ہے۔ جب سے گاؤں سے آئی ہو، بدل گئی ہو۔ اداس اداس رہنا، الیہ شاعری پڑھنا۔"

رونا یہی تو ہے اسے چاہتے ہیں ہم
اے سعد جس کے ملنے کا امکان بھی نہ ہو

ثانیہ نے اسی جگہ سے کتاب کھولی، جہاں سے پروا پڑھ رہی تھی۔ اس نے بڑے

اسٹائل سے شعر پڑھ کر شرارتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ پزل سی ہو گئی۔

"تم بہت فضول ہو۔" خفت چھپانے کے لیے اس نے رخ موڑ لیا اور الماری سے کپڑے نکالنے لگی۔

"یار! صدر چلتے ہیں، سنا ہے "اسٹائلو" پر بڑے خوبصورت جوتے آئے ہیں۔" ثانیہ کا آئیڈیا تھا یہ۔

"ٹھیک ہے، تمہارا کیا ارادہ ہے پروا!" زارا نے تائید کر کے اس کی طرف دیکھا تو وہ غائب دماغی سے سر ہلا کر رہ گئی۔

گاڑی زارا ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ حالانکہ پپا اور مصطفیٰ بھائی کی طرف سے سخت پابندی تھی۔ پر پروا کے پورچ میں کھڑی کریم کلر کی بیلیو دیکھ کر اس کا دل مچل گیا۔

پروا نے چابی مانگنے پر کوئی سوال جواب نہیں کیا۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ وہ خوشی خوشی ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھی۔ راول روڈ تک تو چھوٹی موٹی بے قاعدگیوں کے ساتھ اس نے ڈرائیونگ کر ہی لی پھر اسے آگے جانے کیا ہوا کہ اسٹیئرنگ اس کے قابو میں ہی نہیں رہا۔

گاڑی بدمست ہاتھی کی طرح جھومتی آگے جانے والی ٹیکسی سے ٹکرائی پھر دائیں سائیڈ پہ ایک مارگلہ کو ٹکر ماری۔ زارا نے چیخیں مارتے ہوئے آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔ یہی حال ان باقیوں کا تھا۔ اس وقت انہیں ہوش آیا جب ایک پولیس اہلکار نے دروازہ کھول کر انہیں باہر آنے کی ہدایت کی۔

اچھا خاصا مجمع لگ گیا تھا۔ ٹیکسی کو اچھا خاصا نقصان پہنچا تھا۔ پر صد شکر کہ ڈرائیور اور سواری محفوظ تھے۔ مارگلہ کو معمولی سا نقصان ہوا تھا مگر دونوں گاڑیوں کے ڈرائیور غصے اور کینہ توز نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"بگڑے گھروں کی لڑکیاں ہیں، یہ پیسے والے تو کسی کو کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ غریب لوگ تو ان کے نزدیک مکھی کی طرح ہیں۔ قانون صرف غریبوں کے لیے ہیں۔ جب ڈرائیونگ کرنی نہیں آتی تو کیا ضرورت ہے لوگوں کی زندگیوں کے ساتھ کھیلنے کی۔" جتنے لوگ کھڑے تھے، طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔

زارا ڈرتے ڈرتے نیچے اتری۔ عین اسی وقت سلیمان وہاں سے گزرا تو رش دیکھ کر رک گیا۔ گاڑی کی حالت خود بتا رہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ گاڑی سائیڈ پہ روک کر وہ

صورتِ حال جاننے کے لیے آگے بڑھا تو زارا کو روتے پایا، قدرے حیران ہوا۔

ٹریفک سارجنٹ اسے پہچانتا تھا، مختصراً اس سارے واقعہ کا خلاصہ بتایا۔ سلیمان نے ٹیکسی والے کا نقصان بھرا۔ مارگلہ والے کو فارغ کیا اور پھر ان کی طرف متوجہ ہوا۔ زارا اسے سامنے پا کر مطمئن ہو چکی تھی۔ اس نے سخت نگاہوں سے چاروں لڑکیوں کو دیکھا۔

''گاڑی کس کی ہے۔'' اس نے زارا سے سوال کیا۔ جواب ثانیہ کی طرف سے آیا۔

''اس کی۔'' اس نے ہاتھ سے پروا کی طرف اشارہ کیا۔ ''ڈرائیونگ لائسنس ہے آپ کے پاس۔'' وہ براہِ راست پروا سے مخاطب ہوا تو اس کی روح فنا ہو گئی۔

''یہ...... یہ زارا چلا ہی تھی، میں نہیں۔'' اس نے اپنی جان چھڑائی۔

''اگر ٹیکسی کے ساتھ کسی انسانی جان کو نقصان پہنچتا تو میں آپ لوگوں کو کبھی معاف نہ کرتا مگر آئندہ اس طرح کی لاپرواہی میں برداشت نہیں کروں گا۔ شام کو مصطفیٰ کی طرف آؤں گا۔''

''نہیں، نہیں سلیمان بھائی! ایسا مت کیجئے گا۔ وہ تو مجھے بہت ڈانٹیں گے۔ آئی سوئیر، آئندہ ایسے نہیں کروں گی۔'' وہ منتوں پہ اتر آئی تو سلیمان کچھ ڈھیلا پڑا۔

''آپ گاڑی میں بیٹھیں میں فون کرتا ہوں تاکہ یہ گاڑی گیراج بھجوائی جا سکے۔'' اس نے چاروں کو اپنی گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ چاروناچار وہ آ بیٹھیں۔

زارا اب بھی ڈر رہی تھی۔ اس نے ثانیہ کے گھر کا ایڈریس بتایا اور ارم، پروا کے ساتھ وہیں اتر گئی۔

وہ واپس چلا گیا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ پروا کی گاڑی کا ٹھیک ٹھاک نقصان ہوا تھا۔ زارا اس پہ بھی شرمندہ تھی، مگر پروا نے نرمی سے اسے ٹوک دیا۔

''تم میری دوست ہو، یہ چھوٹے موٹے نقصان خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ آئندہ ایسی بات کر کے میری توہین نہ کرنا۔'' زارا اس کے گلے لگ گئی تو پروا کی ساری خفگی ہوا ہو گئی۔

◉

زمان علی اچھے خاصے عشاء کی نماز پڑھ کر لوٹے حوریہ سے دودھ گرم کرنے کو کہا۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت حکم کی تعمیل میں باورچی خانے کی طرف بڑھی۔ دودھ لا کر ٹیبل پہ رکھا۔ زمان صوفے کی بیک سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے، نیم دراز پڑے تھے۔ اس نے آواز دی۔

''ابو ابو...... ! دودھ گرم کر دیا ہے میں نے۔'' اس نے پاس جا کر بلایا۔

جواب نہ پا کر عجیب سا احساس ہونے پہ اس نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

''ابو...... ابو......'' اب کہ وہ اونچی آواز میں بولی تو ان کا سر بیک سے نیچے ڈھلک گیا۔ حوریہ کے لبوں سے نکلنے والی چیخ بے ساختہ تھی جس نے سارے گھر کو دہلا دیا۔

ولید اور تیمور اپنے اپنے کمروں سے نکل آئے، ان کے پیچھے پیچھے حواس باختہ صفورا بیگم تھی۔ ولید اسی وقت ڈاکٹر طارق کو لینے چلا گیا۔ اس نے زمان صاحب کو چیک کیا۔ اس کے چہرے پر فکر کی پرچھائیاں صاف دیکھی جا سکتی تھیں۔ اس نے باری باری ان چاروں کے چہروں کو دیکھا اور بے تاثر لہجے میں بولا۔

''یہ اب نہیں رہے۔'' حوریہ کو خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب وہ ہوش سے بیگانہ ہوئی۔ ولید نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا تھا۔

تعزیت کرنے والوں کی روز اچھی خاصی تعداد ہوتی۔ مصطفیٰ کے گھر والے روز ہی آتے۔ پڑوس سے حامد اور اس کی بیوی بھی چلے آتے۔ ساجدہ تو ان سب کو حوصلہ دیتی۔ اس کے نرم لہجے میں جادو سا تھا۔ صفورا بیگم اسے پسند کرنے لگی تھیں۔ زمان صاحب کی موت کے شروع دن وہ حد سے زیادہ نڈھال تھی، تو یہ ساجدہ ہی تھی جس نے کہہ سن کے انہیں کھانا کھلایا، دوا دی، ان کا سر دبایا۔

ایک دن وہ نہیں آئی تو انہوں نے اس کی غیر موجودگی کو بری طرح محسوس کیا۔ دوسرے روز وہ آئی تو انہوں نے اس کے نہ آنے کا گلہ کیا۔

زارا اور ثناء کو بھی اس کی پھرتی پسند آئی تھی، وہ بالکل گھر کے فرد کی طرح ہر کام میں حصہ لے رہی تھی۔ زندہ دل شوخ اور ہنسوڑ ساجدہ ان سب کو ہی پسند آئی۔ اس کی یہ خوبیاں اب کھلی تھیں۔

مصطفیٰ بھی بیچ بیچ میں آتا رہا، وہ بڑے سلیقے سے چائے پانی کا پوچھتی۔ اب وہ بھی اس کا نوٹس لینے پر مجبور ہو گیا۔ ساجدہ اس سے ٹھیک ٹھاک بے تکلف ہو چکی تھی۔

◉

پولیس کسٹڈی میں حمید جوکھیو کی حالت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ اب تو کھانا کھانے، پانی پینے میں شدید دقت ہونے لگی تھی۔ اس کی حالت کے پیشِ نظر ڈاکٹر کو دکھانے کا

فیصلہ کیا گیا تو اس نے سختی سے منع کر دیا۔ اسے موت کے فرشتے کے قدموں کی آہٹ دن بہ دن قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔

اس کی دلی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح سلیمان، پروا کو رخصت کروا کر لے جائے۔

اس روز اپنی نازک حالت کی بدولت اسے نواز سے بات کرنے کی اجازت مل گئی اور یہ ان دونوں کے درمیان آخری گفتگو تھی۔

''نواز! میری ڈیڈ باڈی انتہائی رازداری سے میرے آبائی گاؤں لے جا کے دفنا دینا۔ پروا کو پتہ نہیں چلنا چاہیے اس کا جذباتی پن اس کی زندگی کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ بعد میں اسے پتہ چل جائے گا، تب تک شاید اسے صبر آ جائے۔ میرے بعد اس کا حد سے زیادہ خیال رکھنا۔ تم میرے وفادار ہو اور مرتے دم تک وفاداری نبھانا۔ میں تم سے یہی توقع رکھوں گا۔''

آج حمید جوکھیو حد سے زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔

''میری موت کے بعد جتنا جلدی ہو سکے، سلیمان کو رخصتی پر آمادہ کر کے پروا کو اس کے گھر بھجوا دینا، وہ وہاں ہو گی تو میری روح بھی سکون میں ہو گی۔ ایک باعزت شخص کی بیوی بن کر وہ محفوظ ہو جائے گی۔ جتنا جلدی ہو سکے، یہ کام کرنا۔ میرے پاس وقت کم ہے۔'' بولتے بولتے اس کا سانس اکھڑنے لگا، تو اس نے نواز سے رابطہ منقطع کر دیا۔

۞

سلیمان کو حمید جوکھیو کی موت کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ اپنے جرائم کی سزا بھگتے بغیر وہ اس دنیا سے چلا گیا۔ اس بات کا سلیمان کو بے پناہ صدمہ تھا۔ کتنی مشکل اور پاپڑ بیلنے کے بعد وہ اسے قانون کے شکنجے میں لانے میں کامیابی ہوئی۔ یہاں تک کہ اپنے والدین اور خاندان کے علم میں لائے بغیر ایک قاتل..... خونی دہشت کی علامت حمید جوکھیو کی بیٹی سے شادی کر لی۔

وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس راز کے انکشاف کے بعد کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ معاشرے میں اس کی حیثیت تھی۔ ماں باپ کی خاندانی نجابت میں کلام ہی نہ تھا۔ وہ خود اعلیٰ تعلیم یافتہ، اسمارٹ، خوبرو اور ایک اچھی پوسٹ پر کام کر رہا تھا اور حمید جوکھیو کی بیٹی جس کی اس نے شکل تک نہ دیکھی تھی جانے کیسی تھی؟ کیا اس کے گھر والے بطور بہو اسے قبول کر لیں گے؟

ابھی تک اس نے اس بارے میں ایک لفظ تک لبوں سے نہ نکالا تھا۔ وہ خود کون سا

اس کے فراق میں مرا جا رہا تھا۔ نکاح کے بعد حق مہر کی رقم اس کے پاس رکھ کر نکل آیا۔ اس کا چہرہ تک نہ دیکھا۔ بارہا اس نے اپنے دل کو ٹٹولا، جہاں محبت و الفت کا تصور تک نہ تھا۔ ہاں حمید جوکھیو سے اس نے جو وعدہ کیا تھا، اس کی وجہ سے وہ پھنس چکا تھا۔

جانے حالات کس کروٹ بیٹھنے والے تھے۔ فی الحال تو حمید جوکھیو کی اچانک موت نے اسے شدید غم و غصے سے دوچار کر دیا تھا۔

ضروری کارروائی کے بعد لاش نواز کے حوالے کر دی گئی اور وہ اپنے آقا کی وصیت کے مطابق اس کے آبائی گاؤں لے جا کر دفنا بھی آیا۔ حمید جوکھیو کی قبر پر کوئی کتبہ تک نہ تھا۔ پہچان کے لیے سرہانے کی طرف نواز نے چار اینٹیں جوڑ کر رکھ دیں۔

یہ بھی حمید جوکھیو کا حکم تھا کہ اس کی قبر پر کوئی کتبہ نہ لگایا جائے۔ اس پورے کام کے دوران نواز چوکنا رہا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ لاش قبر کے سپرد کرنے کے بعد وہ مطمئن تھا کہ اس نے بہت بڑی ذمہ داری پوری کر دی ہے۔

۞

صفورا بیگم جلد از جلد حوریہ کے فرض سے سبک دوش ہونا چاہتی تھی پھر مصطفیٰ کے گھر والے زمان صاحب کی موت سے بھی پہلے شادی کا تقاضا کر رہے تھے۔ اب تو انہیں سپرد خاک ہوئے ڈھائی ماہ سے زائد ہو چکے تھے۔ رضیہ بیگم نے فون پر سرسری سی بات چھیڑی تو صفورا نے انہیں گھر آنے کی دعوت دی۔ ولید اور تیمور سے مشورہ کیا۔ ان کا ارادہ ولید اور حوریہ دونوں کی شادی کرنے کا تھا کیونکہ گھر میں گونجتے سناٹے سے انہیں خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

ولید اور تیمور بھی تو جیسے ہنسنا بھول گئے تھے۔ رہی حوریہ تو وہ پہلے کم گو تھی۔ اب کوئی بولتا تو جواب دیتی، ورنہ چپ چاپ کاموں میں مصروف نظر آتی۔ وقت نے جو زخم لگایا، وہ آہستہ آہستہ ہی بھرنا تھا۔

۞

نواز سر جھکائے یوں پروا کے سامنے بیٹھا تھا جیسے اصل مجرم وہی ہو۔ پروا کے آگے جھوٹ بولتے بولتے وہ تھک چکا تھا جیسے اب کچھ دیر پہلے اس نے کہا تھا کہ مالک کا انگلینڈ میں ایک حادثے میں انتقال ہو چکا ہے۔ لاش مسخ ہونے کے بعد وہیں دفنا دی گئی ہے۔ تب سے پروا روئے جا رہی تھی۔

اماں بھاگ بھری کی حالت تو اور بھی ناگفتہ بہ تھی۔ وہ آئے روز بیمار رہنے لگی تھی۔ مالک کی موت کی خبر سے اور بھی ڈھے گئی تھی۔ نواز اصل بات اسے بتا چکا تھا۔ بھاگ بھری کے دل پہ پہلے ہی بے انتہا بوجھ تھا۔ اس صدمے کو سہارنا کم از کم اس کے بس کی بات نہ تھی، تب ہی حمید جوکھیو کے بعد اس نے بھی پروا کا ساتھ چھوڑ دیا۔ حمید جوکھیو اور اماں بھاگ بھری کی موت کے درمیان صرف چند دن کا وقفہ تھا۔

اب نواز کو اپنی جان کی فکر ستانے لگی تھی کیونکہ وہ حمید جوکھیو کا خاص بندہ تھا۔ اب پروا کا مخدوش مستقبل منہ پھاڑے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اماں بھاگ بھری کے دم سے وہ پروا کی طرف سے کچھ حد تک بے فکر تھا۔ پر اب یہ سہارا بھی چھن چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ حمید جوکھیو کے مخالفوں کو کسی بھی قسم کی آسانی میسر آتی، پروا کا سلیمان کے گھر پہنچنا ناگزیر تھا۔

◉

سلیمان رات ایک بجے کے بعد واپس آیا، اس لیے ابھی تک سو رہا تھا۔ ثمینہ نے ہی اسے اٹھایا۔

''سلیمان! فریش ہو کر فوراً نیچے آؤ، کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔''

''کون ہے مما!'' اس نے خمار آلود آنکھیں کھول کر بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

''کوئی نواز ڈنو ہے۔ کہہ رہا ہے، تم سے ضروری بات کرنی ہے۔''

(وہ میرے گھر تک کیوں آیا ہے) مما یہ کہہ کر جا چکی تھیں پھر سلیمان بے حد غصے میں تھا۔

''نواز ڈنو کو میرے گھر تک آنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ ابھی پوچھتا ہوں، اس سے'' دس منٹ بعد وہ اس کے سامنے تھا۔ سلام دعا کیے بغیر سلیمان نے اس کی آمد کا مقصد پوچھا۔ اس سے پہلے وہ ڈرائنگ روم کا دروازہ بند کرنا بھولا نہیں تھا۔

''تم میرے گھر کیوں آئے ہو؟ جب میں نے کہا تھا کہ فون پر مجھ سے رابطہ کرنا۔''

نواز نے اس کے سرخ چہرے کو غور سے دیکھا اور غصہ پی گیا۔ کچھ بھی ہو، وہ حمید جوکھیو کا داماد تھا۔

''بات ہی ایسی تھی کہ آپ کے گھر آنا پڑا۔'' مصلحت کے تحت وہ آواز دبا کے بول رہا تھا۔ ''بی بی سائیں اسلام آباد میں ہیں۔ بڑے سائیں نے تین ماہ پہلے ان کے لیے یہ گھر خریدا تھا۔ ان کے ساتھ خاندانی ملازمہ بھی تھی جس کا کچھ دن قبل انتقال ہو چکا ہے۔ اب بی بی سائیں اکیلی ہیں۔ حالات کی نزاکت کے پیش نظر میں اور ملازم بھی نہیں رہ سکتے کیونکہ مجھے کسی پہ اعتبار

نہیں ہے۔ گھر میں کسی عورت کا ساتھ نہیں، وہ اکیلی ہیں آپ کی عزت ہیں۔ حمید جوکھیو کے مخالفین کا آپ کو پتہ ہے، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ رہ گیا میں تو ہر وقت ایسا لگتا ہے کہ موت تعاقب میں ہے۔ ان حالات میں مجھے نہیں لگتا کہ میں بی بی سائیں کی موزوں حفاظت کر سکتا ہوں۔ ان کے پاس ایک عورت کی یا کسی اپنے کی موجودگی ضروری ہے۔'' سلیمان کی فراخ پیشانی پہ شکنوں کا جال سا بن گیا تھا۔

''شکر ہے تم نے اپنی بے بسی کو تسلیم تو کیا۔ دوسروں کے گھر ویران کرنے والے کی بیٹی خود کتنی غیر محفوظ ہے۔'' سلیمان کے چبھتے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ جسے نواز نظر انداز کر گیا۔

''وہ آپ کی عزت ہیں اور میں مالک کی موت کے بعد خود پولیس سے چھپتا پھر رہا ہوں گیا ایک ہی گھر میں ان کے ساتھ میری موجودگی مناسب ہے۔'' اس نے گویا سلیمان کی غیرت کو للکارا تھا۔ حالانکہ پروا کو اس نے ہمیشہ ایک بیٹی کی نظر سے دیکھا تھا۔

''ایڈریس بتاؤ مجھے۔'' سلیمان اس سے پوچھنے لگا۔ نواز ہلکا پھلکا سا ہو گیا۔

''اب تم جاؤ، میں آ رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے سائیں! اللہ آپ کا بھلا کرے۔'' اسے دعا دیتے ہوئے وہ بہت مطمئن تھا۔ اس کے جانے کے بعد ثمینہ بیٹے کے پاس آئی جو چہرے سے قدرے پریشان لگ رہا تھا۔

''سلیمان کون تھا یہ؟''

''مما! میرا مخبر ہے یہ۔'' فوری طور پر یہی جواب اس کے ذہن میں آیا۔

''بہت مشکوک اور خوفناک صورت تھی۔ سرِ عام اسلحے کی نمائش کر رہا تھا۔'' ثمینہ کے لہجے میں ناپسندیدگی سی تھی۔

''ہاں مما! یہ بھی اس کی مجبوری تھی۔''

''میں تو ڈر ہی گئی تھی بیٹا!''

''کیوں، ایک پولیس آفیسر کی ماں ہو کے بھی ڈرتی ہیں۔'' اس نے قصداً ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا تو وہ بھی سب بھول بھال گئیں۔

◉

زارا یونیورسٹی سے پروا کے لیے بھی داخلہ فارم لے آئی تھی۔ اس نے ساری ذمہ داری اس کے سر ڈال دی تھی۔ خود وہ بہت پژمردہ اور اداس سی تھی۔ کسی کام میں بھی دل نہ لگتا۔ نواز

سارا سارا دن غائب رہتا، وہ ڈرتی ہی رہتی۔ اماں بھاگ بھری کے دم سے تنہائی کا مداوا تو تھا، اس اکیلے گھر سے تو ہوسٹل ہی اچھا تھا۔ کم از کم وہاں زندگی کا احساس تو تھا۔

نواز نے کہا تھا، وہ دو ایماندار قسم کے ملازم ڈھونڈ رہا ہے تاکہ پروا کا مسئلہ حل ہو جائے۔ اسے نہیں پتہ تھا کہ نواز صرف اسے بہلا رہا ہے۔ رات کو بھی وہ بہت دیر سے واپس آتا۔ پڑوسیوں سے میل جول رکھنے سے بھی نواز نے منع کر دیا تھا پھر پوش علاقے کے ان مکینوں کو پڑوسیوں سے ایسا سروکار تھا بھی نہیں۔ سب اپنے اپنے حال میں مست تھے۔

زارا سمیت اس نے کسی دوست پہ جن حالات سے وہ آج کل گزر رہی تھی، اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ ہاں پروا کے بابا سائیں کی موت کا اس نے ساری فرینڈز کو بتا دیا تھا۔

نواز اس کے پاس چلا آیا۔ پروا کو سلیمان کی آمد کی اطلاع دیتے ہوئے نواز اپنے آپ میں عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔

''بی بی! سائیں مالک سے کیا ہوا وعدہ آج میں پورا کر رہا ہوں۔ آپ کے شوہر آپ کو لینے آ رہے ہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو تم۔'' ایک دم ہی اس کی دھڑکنوں نے انداز بدلا۔

''میں نے انہیں یہاں کا ایڈریس دے دیا ہے، وہ ابھی آنے والے ہیں۔ اس گھر کے تمام تر اختیارات آپ کے پاس ہیں، آپ جو چاہیں کریں۔ ان سے مل کر بات کر لیں۔'' نواز مشورہ دے کر منظر سے ہٹ گیا۔

پروا کی اجنبی سی کیفیت خود اپنے لیے عجیب سی تھی۔ جب وہ نہیں تھا تو اس کے ہونے کا احساس تک نہ تھا اور آج بس نام لینے کی دیر تھی۔ وہ اسے کیا نام دیتی محبت، پیار، عشق یا پھر کچھ اور۔ نہیں، نہیں۔ محبت، پیار اور عشق کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس نے تو سلیمان کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ کبھی اکیلے میں وہ اس کی تصویر میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتی مگر ناکام ہو جاتی۔

آج وہ آ رہا تھا، اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے؟ ہاں اپنے نکاح کے بارے میں اس کے دل میں بہت سے سوال تھے۔ بعد کے حالات کے بارے میں بھی وہ جاننا چاہتی تھی۔ اس کے آنے پہ نواز نے ہی گیٹ کھولا۔

پروا قصداً خود کو مصروف ظاہر کر رہی تھی، جانے کیوں وہ پزل ہو رہی تھی۔ شاید سلیمان کا اس کے پاس آ کر کچھ کہے بنا چلے جانا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ اب تو وہ اس کے گھر آیا بیٹھا تھا۔ جانے

آئندہ وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ انہی سوچوں کے درمیان الجھتے ہوئے وہ کچن میں آئی۔

''بی بی سائیں! آپ جلدی سے اپنا ضروری سامان رکھ لیں، وہ آپ کو لینے آئے ہیں۔'' نواز اسے ڈھونڈتا ہوا کچن میں چلا آیا۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔

ایسی ہوتی ہے رخصتی، بہت سی شادیاں اس نے ہوتے دیکھی تھیں مگر ایسی رخصتی اچانک بغیر کسی شادی کے کم از کم اس کے لیے ناقابلِ فہم تھی۔

پھر ڈھیر سارے سوالات جو اس کے ذہن میں کلبلا رہے تھے، انہوں نے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ نواز نے ''جلدی کریں، جلدی کریں'' کی رٹ لگائی ہوئی تھی۔ اس کے تو ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔

بڑی مشکل سے ہزاروں خدشات لیے وہ ڈرائنگ روم تک پہنچی۔ سلیمان کی پروا کی طرف پشت تھی۔ اس نے اندر داخل ہو کر دھیرے سے سلام کیا، تب وہ اس کی طرف مڑا۔ چھم سے تصور کے پردے پر وہ سارا واقعہ فلم بن کر چلنے لگا۔ جب وہ زارا، ثانیہ اور ارم کے ساتھ شاپنگ کے لیے صدر جا رہی تھی۔ اس شخص کی ڈانٹ اسے بھولی نہیں تھی جو شاید زارا کا رشتہ دار یا پھر جانے کون تھا؟

سلیمان بھی پہلی نگاہ میں اسے پہچان چکا تھا۔ اسے بھی یاد آ گیا کہ اس لڑکی کو اس نے زارا کے ساتھ دیکھا تھا۔ آج کا دن حیرانیوں پہ حیرانی لا رہا تھا۔

''وعلیکم السلام۔'' سلیمان نے اس کے سلام کا جواب ٹھہرے ہوئے لہجے میں دیا۔ ادھر وہ کنفیوژ سی تھی۔ جھکی جھکی آنکھوں میں اضطراب کی تحریر صاف پڑھی جا سکتی تھی۔

''آپ تیار ہیں۔'' اس کا سر اثبات میں ہل گیا۔

''چلیے۔'' وہ گاڑی تک پہنچا۔ وہ جھجکتے ہوئے پیچھے بیٹھ گئی۔ بڑی زور سے بریک چرچرائے، اگلے ہی لمحے وہ یہاں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

''زارا آپ کی فرینڈ ہے۔'' وہ بیک مرر اس پر فوکس کر چکا تھا۔

''جی ہاں۔''

''کب سے ہے دوستی آپ دونوں کی۔''

''ہم کالج لائف سے دوست ہیں۔ اب یونیورسٹی میں بھی اکٹھے ایڈمیشن لیا ہے۔ زارا بہت اچھی دوست ہے میری۔ اس کی مما اور سسٹر بھی بہت چاہتی ہیں مجھے۔''

''ہونہہ۔'' سلیمان نے ہنکارا بھرا۔

"گویا اس کی فیملی بہت اچھی طرح واقف ہے آپ سے۔" وہ ساتھ ساتھ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بھی نوٹ کر رہا تھا۔

"جی ہاں۔" اندر ہی اندر وہ جز بز سی ہوگئی۔ سلیمان کی گہری نگاہیں اسے ڈسٹرب کر رہی تھیں۔

"تو بات سنیں آپ میں آپ کو اپنے دوست کی رشتہ دار شو کروں گا جو مصائب کا شکار ہو کر میرے سپرد کی گئی ہے۔ باقی زارا اور اس کی فیملی کو میں خود فیس کرلوں گا۔ آپ کو کچھ نہیں کہنا ہے۔ اگر کہنے کے سوا چارہ نہ رہے تو پھر کہہ دیجئے گا کہ آپ میرے دور کے عزیزوں میں سے ہیں۔ ہماری آپس میں دشمنی ہے۔ چونکہ اپنے والد کی وفات کے بعد آپ بے سہارا ہوگئی ہیں، اس لیے ترس کھا کر ہم آپ کو اپنے گھر لے آئے ہیں۔ اگر زارا پوچھے کہ آپ پہلے سے مجھے پہچانتی تھیں تو کہنا کہ نہیں۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہنا ہے۔ میں فی الحال اس شادی کو اس سارے قصے کو ڈسکس نہیں کرسکتا۔ مناسب موقع دیکھ کر میں خود بات کرلوں گا۔ آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں، میں ہینڈل کرلوں گا۔"

سلیمان کا سرد لہجہ کسی بھی قسم کے جذبے سے عاری تھا۔ یعنی وہ اس کے گھر میں بیوی اور بہو بن کر نہیں بلکہ مصائب و آلام کا شکار ایک لڑکی بن کر جا رہی تھی۔ بابا سائیں نے تو کہا تھا کہ وہ اس کی شادی ایک بہت اچھے آدمی سے کر رہے ہیں اور اس اچھے آدمی نے پہلے مرحلے پہ ہی شاید کچھ غلط کر دیا تھا۔ یہ خود اتنا سرد مزاج سا لگ رہا ہے۔ جانے اس کے گھر والے کیسے ہوں گے؟ اسی کی طرح سرد اور بے حس یا پھر......

اس سے آگے اس سے کچھ سوچا ہی نہیں گیا۔ ذہن کے پردے پہ بابا سائیں کی تصویر ابھر آئی تھی اور اس کے دل میں ٹیس سی اٹھنے لگی تھی۔

مما اور نائلہ ٹی وی لاؤنج میں تھیں۔ سلیمان کے ہمراہ گھبرائی گھبرائی سی صورت والی نوجوان لڑکی کو دیکھ کر ان دونوں کا چونکنا لازمی امر تھا۔

"نائلہ! انہیں کمرے تک لے جاؤ۔" صاف لگ رہا تھا کہ وہ پروا کی موجودگی میں بات نہیں کرنا چاہتا۔ نائلہ کے ساتھ وہ اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ وہ نکلی تو سلیمان، مما کی سوالیہ نظروں کی طرف متوجہ ہوا۔

"کون ہے یہ لڑکی سلیمان!" وہ گہری نگاہ سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"اصل میں مما......!" وہ بات کا آغاز کرنے کے لیے مناسب لفظ ڈھونڈ رہا تھا پھر اس نے رٹی رٹائی کہانی مما کو سنا دی جو پروا کے حوالے سے اس کے ذہن میں آئی تھی۔

"مما! بے چاری حالات کی ماری ہے، اس کے باپ نے انسانیت کے نام پر مجھ سے التجا کی تھی مجھ سے رہا نہیں گیا۔"

"پھر سلیمان! لوگ کہیں گے کہ ہم نے ایک جوان لڑکی کو کیوں گھر میں رکھا ہوا ہے۔"

"مما! میں سب کو جواب دے لوں گا۔"

"کوئی اور معاملہ تو نہیں ہے۔" ثمینہ کا لہجہ ایسا تھا کہ وہ نظر چرانے پہ مجبور ہوگیا۔

"بات بس اتنی ہے کہ یہ بے سہارا ہے اور میں انسانیت کے ناطے اس کو اپنے گھر لے آیا ہوں۔ لوگ جو کہتے ہیں، کہتے رہیں۔"

"سلیمان! تمہیں شاید پتہ ہے کہ میں ثناء کو بہو بنانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ اس تناظر میں انہیں اس لڑکی کی موجودگی اچھی نہ لگے۔" وہ صاف گوئی سے بولیں۔

یعنی سلیمان ان کی زبان سے جو کچھ کہلوانا چاہتا تھا، انہوں نے کہہ دیا تھا۔

"مما! پھر اس کا حل یہی ہے کہ ہم کہہ دیں، یہ ہمارے دور پار کے عزیز کی بیٹی ہے۔ ہماری آپس میں دشمنی تھی جواب ختم ہوگئی ہے، اس لیے اسے ہم اپنے یہاں لے آئے ہیں۔" وہ بڑے آرام سے ان کی برین واشنگ کر رہا تھا۔

"چلو اپنے پپا کو آنے دو، ان سے بات کرتے ہیں۔" وہ کچھ کچھ متفق ہو چلی تھیں۔ فی الحال سلیمان کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس کی پریشانی کچھ کم ہوگئی تھی۔

"کمرہ پسند آیا ہے آپ کو۔" نائلہ بڑے غور سے اس کے تیکھے نقوش اور گلابی رنگت کو دیکھ رہی تھی۔

"میرا نام پروا ہے، پروا حمید جو کھیو اور آپ......" اس کے شنگرفی لب ہوا ہوئے۔

"میں نائلہ ہوں، تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ، ہم دو بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔"

"میں اکلوتی ہوں۔"

"آپ کے پیرنٹس......؟"

میرے بابا سائیں کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔" یہ کہتے ہی اس کی آنکھوں کے کٹورے

لبالب آنسوؤں سے بھر گئے۔

"پلیز چپ ہو جائیں، میں نے آپ کو دکھی کر دیا ہے نا۔" وہ بے چاری تاسف سے انگلیاں مروڑنے لگی۔ درحقیقت یہ لڑکی اسے بہت اچھی لگی تھی۔ کچھ کھوئی کھوئی اداس سی۔ نائلہ اسے تسلی دے کر دوبارہ ٹی وی لاؤنج میں آ گئی، جہاں مما متفکر سی بیٹھی تھیں۔

رات کو اصغر صاحب اور خولہ کو بھی پروا کے بارے میں معلوم ہو گیا۔ نائلہ اور خولہ کو پروا اچھی لگی تھی۔ پر ثمینہ بیگم اس سے خائف سی تھیں، جانے کیوں؟ انہیں سلیمان کا انداز شک میں ڈال رہا تھا۔

رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے، پروا بے چینی سے کبھی دائیں کروٹ لیٹتی اور کبھی بائیں جانب نیند تھی کہ آ کے نہیں دے رہی تھی۔ اس نے اصرار کے باوجود کھانے کے چند نوالے لیے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اجنبی لوگوں کے درمیان آ گئی ہو، کوئی اپنا نہ ہو۔ اس کا ہم سفر جس کے سہارے وہ یہاں تک آئی تھی، جانے کن مصلحتوں کا شکار تھا کہ اپنے اور اس کے رشتے کی حقیقت کو بھی چھپا گیا تھا۔

وہ یہاں کس حیثیت سے رہے گی؟ اور کب تک رہے گی۔ بات کھلنے پہ ان سب کا رویہ کیا ہوگا؟ کیا یہ لوگ اسے بحیثیت بہو قبول کر لیں گے۔ بابا سائیں نے اسے کچھ بھی تو نہیں بتایا تھا۔ نہ نکاح میں سلیمان کے گھر والے شریک ہوئے تھے۔ وہ بھی تو یہی کہہ رہا تھا کہ اس تعلق کے بارے میں اس کی فیملی کو بالکل بھی پتہ نہیں ہے۔ حالانکہ وہ ایک امیر کبیر معزز شخص کی بیٹی ہے۔ لوگ جسے جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ کیا کمی تھی اس میں جو یہ شخص حقیقت کو چھپا رہا ہے۔

کیا میرے بابا سائیں کی کوئی کمزوری اس کے ہاتھ میں آ گئی تھی جو وہ مجھے یوں چوروں کی طرح رازدارانہ انداز میں اس کے ساتھ نتھی کرنے پر مجبور ہوئے یا پھر کوئی اور بات تھی جو یوں افراتفری میں اس کے ساتھ نکاح ہوا۔ اس کا ذہن ہر پہلو سے سوچ رہا تھا۔ اسی الجھن اور پریشانی کی وجہ سے اسے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔

"تو پروا صاحبہ! یہ ہے آپ کی نئی زندگی۔" وہ طنزیہ اپنے آپ سے بولی۔ گلاس ونڈو سے باہر گہری تاریک رات چھائی ہوئی تھی۔ اسے ڈر سا محسوس ہوا تو اس نے پردہ آگے کر دیا۔

اپنی منفی مثبت سوچوں کے درمیان ڈوبتے ابھرتے اسے بھی نیند آ ہی گئی۔

"کہاں غائب ہو تم دو روز سے، میں گھر گئی تھی، پر گیٹ لاک تھا۔ میں اور ثانیہ بیل بجا بجا کر واپس آ گئے۔" زارا فون پہ اس کی کلاس لے رہی تھی۔

"میں نے وہ گھر خالی کر دیا ہے۔" اس نے نیا انکشاف کیا۔

"کیوں۔"

"اکیلی جو تھی۔"

"تو اب کہاں ہو؟"

"اپنے انکل اصغر کے گھر۔" جھوٹ بولتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"کہاں پائے جاتے ہیں تمہارے انکل؟" زارا کو تجسس سا ہوا۔

"تم انہیں جانتی ہو۔"

"میں اور تمہارے انکل کو جانتی ہوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"ایسا ہو چکا ہے ڈیئر انکل اصغر کو نہیں جانتیں۔ سلیمان گیلانی جن کا بیٹا ہے۔"

"اوہ تو، تم نے پہلے نہیں بتایا؟" زارا کو بہت حیرت ہوئی۔

"پہلے اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اصل میں ہمارے گھرانوں میں دشمنی تھی۔ اس وجہ سے ملنا جلنا بھی نہیں تھا۔ بابا سائیں کی موت کے بعد گلے، شکوے دور ہوئے تو دشمنی نے بھی دم توڑ دیا۔ میں اکیلی تھی، اس لیے انکل مجھے اپنے گھر لے آئے۔" اس نے فراٹے سے جھوٹ بولا۔

زارا غور سے سن رہی تھی۔

"بہت بڑی ایکٹر ہو تم، جب گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا مجھ سے اور سلیمان بھائی وہاں آئے تو تم نے کتنی اچھی اداکاری کی۔ ذرا بھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ تمہارے کچھ لگتے ہیں۔ انہوں نے بھی کمال کر دیا۔ واہ واہ ایوارڈ ملنا چاہیے آپ کو۔ میں سب کو بتاؤں گی کہ پروا، سلیمان بھائی کی رشتہ دار ہے۔ کتنے حیران ہوں گے سارے۔ کوائٹ امیزنگ یار! میں ابھی شاہ آپی، مصطفیٰ بھائی اور مما کو بتاتی ہوں پھر شام کو آؤں گی تمہارے پاس، تیار رہنا۔ اچھی طرح کلاس لوں گی جنابہ کی۔ مجھ سے بھی چھپایا اس بات کو۔" اسے ابھی تک قلق تھا کہ پروا نے اس سے یہ سب کچھ چھپایا ہے۔

ایک لگی بندھی روٹین کے مطابق پروا کی زندگی نے ایک نئی کروٹ لی تھی۔ ثمینہ نے بادل نخواستہ اس کے وجود کو قبول کر لیا تھا۔ باقی سب خوش تھے۔ انہیں پروا کے ہونے یا نہ ہونے

سے فرق نہیں پڑا تھا۔ ہاں شروع شروع میں اصغر گیلانی نے بھی بیوی کے کہنے میں آ کر سلیمان پہ زور دیا کہ اس لڑکی کو کسی لیڈیز ہوسٹل میں چھوڑ آؤ اور وقتاً فوقتاً خبر گیری کرتے رہو، پر وہ نہ مانا اور انہیں قائل کر کے چھوڑا۔

پروا کسی پہ بوجھ نہیں تھی۔ ہوسٹل میں رہتے رہتے اپنے کام بھی اسے خود کرنے کی دعات پڑ چکی تھی۔ لہٰذا یہاں بھی اسے خاص پریشانی نہیں ہوئی۔ اسے اصغر انکل اور نائلہ سب سے زیادہ اچھے لگے تھے۔ نائلہ منہ پھٹ ہر بات بے دھڑک کہہ دینے والی۔ مخلص اور قدرے باغ و بہار طبیعت کے مالک اِصغر اکثر پاس بٹھا کر اس کے خاندان کے بارے میں پوچھتے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے، تب وہ اسے پچکارتے، دلاسہ دیتے، اپنائیت کا احساس دلاتے تو وہ روتے روتے ہنس پڑتی۔

اس دھوپ چھاؤں کا منظر انہیں انوکھے احساس سے دوچار کر دیتا۔ رہ گئی نائلہ تو اس کی تنہائی پرا کے آنے سے دم توڑ چکی تھی جس کا وہ برملا اظہار کرتی۔

۞

صفورا بیگم، ولید اور حوریہ کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ ان کے پاس بشکل ایک مہینہ تھا۔ اس میں ہی سب کچھ نمٹانا تھا۔ روز بازاروں کے چکر لگتے۔ ایسے میں ساجدہ ان کے بڑے کام آئی۔ خریداری کے سلسلے میں انہیں مشورے دیتی اور حتیٰ الامکان مدد کرتی جس کی وجہ سے وہ اس پہ ازحد انحصار کرنے لگی تھیں۔

اس روز امینہ بیگم، حوریہ کے لیے سلوائے گئے کچھ کپڑے لے کر چیک کروانے آئیں۔ ساجدہ بھی وہیں بیٹھی تھی۔

حوریہ عصر کی نماز پڑھ رہی تھی، امینہ کے ساتھ مصطفیٰ بھی آیا تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں ولید اور تیمور کے ساتھ تھا۔ حوریہ نے نماز سے فارغ ہو کر چائے بنائی اور پھر ڈرائنگ روم میں بھجوائی۔ صفورا، مصطفیٰ کو بھی ادھر بلا کر لے آئیں۔ حوریہ تو بالکل نکل گئی۔ شادی میں کچھ روز باقی تھے۔ اسے مصطفیٰ کا سامنا کرنے سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

ساجدہ نے ہی سب کو چائے سرو کی۔ اکثر و بیشتر وہ اب ادھر ہی پائی جاتی تھی، کیونکہ شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں سو بکھیڑے تھے۔ صفورا بیگم کا دل اس نے پہلے ہی جیت لیا تھا۔ اب تو تیمور بھی اس کی آمد سے کھل کھل جاتا ہے۔

''آنٹی! بہت خوبصورت سوٹ ہیں، ان کی فٹنگ تو غضب کی ہے۔

''کس کے ہیں یہ؟'' اس نے لاعلمی کا مظاہرہ کیا۔

''تمہیں پسند آئے۔'' امینہ کا دل اس کی تعریف سے کھل گیا۔

''بہت زیادہ بلکہ آپ نے جہاں سے سلوائے ہیں، مجھے بھی بتا دیں میں بھی وہیں سے سلواؤں گی۔'' وہ اپنے پہنے گئے کپڑوں پہ ناقدانہ نگاہ دوڑا رہی تھی۔

''کپڑے تو تم بھی اچھے پہنتی ہو۔'' مما کے سراہے جانے پہ مصطفیٰ کی نگاہ اٹھ ہی گئی۔

کالے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس اس کی اجلی رنگت اور بھی کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ حسب روایت فیشن کے مطابق اگلا اور پچھلا گلا کافی گہرا تھا۔ وہ مصطفیٰ کو چائے دینے کے لیے جھکی تو مما کی موجودگی کے باوجود مصطفیٰ کی دھڑکن تہہ و بالا ہو گئی تھی۔ وہ جیتی جاگتی قیامت تھی۔

''یہ حوریہ کے ہیں، چیک کروانے کے لیے لائی ہوں۔'' انہوں نے چاروں سوٹ اس کے آگے رکھ دیے۔ ٹراؤزر اور چھوٹی شرٹس تھی۔ فیشن کے مطابق سلی ہوئی۔

''یہ حوریہ پہنے گی، توبہ توبہ۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ صفورا اور تیمور وہاں سے اٹھ گئے تھے، اس لیے اسے اب فکر نہیں تھی۔

''وہ تو پرانے زمانے کی لڑکی ہے۔ کبھی دیکھا ہے اس طرح کے کپڑے پہنے ہوئے۔ میں نے بھی کئی بار ٹوکا۔ وقت کے ساتھ چلنا سیکھو۔ تم بڑے گھر کی بہو بن کے جا رہی ہو، وہاں کے رنگ ڈھنگ اپناؤ۔ پر وہ تو سنتی ہی نہیں۔ آپ کو بھی اس طرح کی لڑکی پسند نہیں ہو گی۔ آخر کو مصطفیٰ اتنے اچھے ہیں۔ کوئی ان جیسی ہی ہونی چاہیے۔'' وہ بڑی چالاکی سے سوچ کے در وا کر گئی۔

امینہ اور مصطفیٰ دونوں اپنی اپنی جگہ کچھ سوچ رہے تھے۔ مصطفیٰ کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے کوئی غلط فیصلہ کیا ہے۔ یہی حال امینہ بیگم کا تھا۔ ان کے سرکل میں ایک سے ایک ماڈرن اور طرح دار لڑکی تھی جس کی طرف مصطفیٰ اشارہ کرتا، وہی اس کی بن جاتی۔ خود امینہ کے دل میں بھی اَپ ٹو ڈیٹ قسم کی بہو کا تصور تھا۔ پر مصطفیٰ کو تو ولید کی بہن بھائی تھی۔ اس نے شور مچا دیا کہ فوراً ان کے گھر جائیں۔ اس کی جلدی جلدی کی رٹ نے انہیں کچھ سوچنے سمجھنے کا وقت ہی نہ دیا اور وہ رشتہ لے کر چلی گئیں۔

آج انہیں اپنے فیصلے پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ شاید ایسے ہی جذبات اس وقت مصطفیٰ کے بھی تھے۔ ساجدہ جیسی فتنہ ساماں لڑکی کے ناز و انداز دیکھ کر اس کی نیت بھی ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔

اسے عاطف محمود کی طرح داری بیٹی اریبہ یاد آگئی جو اس سے محبت کا دم بھرتی تھی۔
اس کی ڈریسنگ کتنے غضب کی ہوتی تھی، اس کے بالوں کا اسٹائل چلنے پھرنے کا انداز اور نزاکت انداز گفتگو سب کچھ کتنا اٹریکٹو تھا۔

ساجدہ ہی کپڑے اٹھا کر حوریہ کے پاس گئی۔ اس نے دیکھتے ہی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

''میں کہاں عادی ہوں ایسے کپڑے پہننے کی۔ ان سے کہو، سمپل سی قمیص شلوار سلوائیں۔ میں اس میں زیادہ ایزی رہتی ہوں۔ ٹراؤزر مجھے پسند نہیں۔'' ساجدہ دل میں مسکراتی رہی اور کپڑے لے کر ڈرائنگ روم میں واپس آگئی۔

''اس نے تو دیکھتے ہی اٹھا کر پھینک دیے کہ کتنے واہیات بے ہودہ کپڑے سلوا کر لائی ہیں۔ کہتی ہے، میں ایسے کپڑے نہیں پہنتی۔ یہ شریفوں کے لائق نہیں۔'' اس نے ایک کی چار لگا کر بتائیں اور توقع کے مطابق امینہ غصے میں آگئیں۔ مصطفیٰ کا حال بھی مختلف نہ تھا۔

''میں ابھی جا کر پوچھتی ہوں۔ کیا ہم شریفانہ کپڑے نہیں پہنتے۔''

''آنٹی! یہ غضب نہ کیجئے گا، سب کہیں گے یہ میرا کیا دھرا ہے۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچیے۔'' وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی کیونکہ کسی بھی وقت گھر کا کوئی فرد ادھر آسکتا تھا۔ آخر کو وہ حوریہ کی سسرال والے تھے۔ امینہ بیگم مصطفیٰ کو ساتھ لیے اٹھ گئیں۔ مغورا روکتی رہ گئیں۔

''ارے انہیں کیا ہوا ساجدہ! اچھا بھلا چھوڑ کر گئی تھی۔''

''بس آنٹی! کہہ رہی تھیں کہ حوریہ بہت پرانے زمانے کی لڑکی ہے۔ ہمارا بیٹا افسر ہے۔ یہ ہے وہ ہے۔'' وہ بڑے اطمینان سے کہہ رہی تھی۔

مغورا بیگم پریشان سی ہوگئیں۔ آج سے پہلے تو ایسی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ کرید کرید کر ساجدہ سے اس بارے میں پوچھتی رہی۔ کسی طرح تسلی ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔

''آپ پریشان نہ ہوں جو ہوگا، اچھا ہوگا۔''

''کتنی اچھی ہو تم، سدا خوش رہو۔ اگر ولید کا رشتہ طے نہ ہو چکا ہوتا تو.....'' وہ بولتے بولتے رُک گئی۔

درحقیقت ساجدہ کو دل جیتنے کا گُر آتا تھا، اس وقت وہ یہی گُر آزما رہی تھی۔

زارا یونیورسٹی میں بھی کپڑے ڈسکس کر رہی تھی۔ مصطفیٰ بھائی کی شادی جوں جوں

قریب آتی جارہی تھی، اس کے اشتیاق میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

''تم سب نے ہفتہ پہلے آجانا ہے۔'' اس نے چاروں دوستوں کو پھر سے یاد دہانی کرائی۔ ''مہندی اور مایوں پہ ایک جیسے کپڑے پہنیں گے۔ ہوسکتا ہے مصطفیٰ بھائی کے ولیمہ کے دن ثناء آپی کی بھی منگنی ہو جائے۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''کس کے ساتھ ہوگی ثناء آپ کی منگنی۔'' پروا نے پوچھا۔

ثناء اس سے ڈیڑھ سال بڑی تھی۔ زارا کی دیکھا دیکھی وہ بھی آپی کہتی۔

''تمہیں نہیں پتہ۔'' زارا نے اسے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو، تمہیں واقعی نہیں پتہ۔

''یار! مجھے کیسے پتہ ہوسکتا ہے۔ اگر ہوتا تو تم سے کہتی۔'' وہ چڑ سی گئی۔

''سلیمان بھائی کے ساتھ ثناء آپی کی منگنی ہوگی۔'' پروا کے چہرے پہ ایک رنگ سا آگیا۔ زارا اس کی حالت سے بے خبر تفصیل بتا رہی تھی۔

''اصل میں ثناء آپی کو شروع سے ہی ثمینہ آنٹی پسند کرتی ہیں۔ مذاق مذاق میں انہوں نے پانچ چھ سال پہلے ذکر کیا تھا۔ سلیمان بھائی کی وجہ سے باقاعدہ رشتہ نہیں ڈالا کیونکہ وہ اور مصطفیٰ بھائی فنانشلی اسٹرونگ ہوئے بغیر شادی جیسے بکھیڑوں میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اب میں نے سنا ہے کہ ثمینہ آنٹی باقاعدہ رسم کرنا چاہتی ہیں۔''

پروا کے دل کو کچھ ہوا۔ اس پہلو پہ تو اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ زارا اور بھی بہت کچھ کہتی رہی وہ ہوں ہاں کرتی رہی۔

چھٹی کا دن تھا نو بجے کے قریب سب سے پہلے پروا اٹھی۔ اس نے اپنے لیے چائے بنائی پھر اصغر انکل کے لیے بھی ایک کپ میں ڈال کر لے گئی جو لان میں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی ابھی ابھی اٹھے تھے۔

''تھینک یو سویٹ۔ اس وقت گرما گرم چائے پینے کو بڑا دل کر رہا تھا۔''

''اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔'' وہ شرمندہ سی ہوگئی۔

''تمہیں زحمت تو ہوگی۔ ایک کپ سلیمان کے لیے بھی بنا دو، وہ اپنے کمرے میں ہوگا۔ اسے میرا پیغام بھی دینا کہ تیار ہو کر نیچے آئے۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ باورچی خانے میں آکر چائے بنانے لگی۔ سلیمان کے کمرے میں

وہ کبھی نہیں گئی تھی، اس لیے دروازہ ناک کرتے ہوئے قدرے گھبرائی۔

''کم آن۔'' اندر سے سلیمان کی خمار آلود آواز ابھری۔ وہ جہازی سائز بیڈ پہ دائیں کروٹ لیٹا ہوا تھا۔

''یہ چائے ہے اور اصغر انکل آپ کو بلا رہے ہیں۔ لان میں بیٹھے ہیں۔'' وہ تیز تیز بول کر یوں بھاگی جیسے کچھ دیر اور رکی رہی تو انہونی ہو جائے گی۔

دوپہر کو خولہ بھی اپنے بچوں کے ہمراہ چلی آئی۔ سب ٹی وی لاؤنج میں تھے۔ ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ قدرے سائیڈ پہ پروا بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ سلیمان کی موجودگی کی وجہ سے وہ کانشس سی ہو رہی تھی۔

''مصطفیٰ بھائی کی شادی میں کچھ دن ہی رہ گئے ہیں۔'' نائلہ نے بچوں کے سے اشتیاق سے خولہ کو بتایا۔

''مما! آپ بھی بھائی کی شادی کریں نا، مصطفیٰ بھائی کی بھی ہو رہی ہے۔'' نائلہ لاڈ سے بولی۔

''کروں گی، بہت جلد کروں گی سلیمان کی شادی بھی۔ میرا خیال ہے، منگنی کی رسم تو کر ہی لینی چاہیے۔'' وہ سلیمان کو دیکھنے لگی۔

''میں ابھی شادی جیسے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔'' سلیمان نے جان بچانی چاہی۔

''بیٹا! منگنی کا فنکشن کر لیتے ہیں۔''

''نہیں مما! ابھی کچھ نہیں۔''

''ثناء اچھی لڑکی ہے، امینہ بتا رہی تھی اس کے اور رشتے بھی آ رہے ہیں۔ اچھی لڑکیوں کے رشتے جلدی ہو جاتے ہیں۔ انہیں کمی تو نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں بات تو ان کے کان میں ڈال دوں۔ چھوٹی موٹی رسم ہی کر دوں باقاعدہ طور پہ۔'' انہوں نے اسے گھیرنا چاہا۔

''میرا موڈ نہیں ہے۔''

''موڈ ہوتا نہیں، بنایا جاتا ہے۔ مصطفیٰ تمہارے ساتھ کا ہے۔ اس کی بھی شادی ہو رہی ہے۔ ہمارے دل میں بھی ارمان ہے اس گھر میں بہو آئے، تمہارے بچے ہوں، انہیں گود میں کھلاؤں، ناز اٹھاؤں۔'' انہوں نے ماؤں والا روایتی حربہ آزمایا۔

ادھر پروا کا سارا وجود گویا کان بن گیا تھا۔ ''میری بلا سے اس کی منگنی شادی جس کے

ساتھ بھی ہو، میں یہاں اجنبی کی طرح رہ رہی ہوں۔ نواز بھی نہیں ہے، اسی کے ساتھ مشورہ کرتی۔ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اور اس کرپٹ شخص کو دیکھو، مجھ سے نکاح کرنے کے بعد منگنی بھی کر رہا ہے۔ آخر یہ اپنے گھر والوں کو کچھ بتاتا کیوں نہیں۔ ایسی کیا بات ہے، کون سا راز ہے؟'' وہ سر گود میں گرائے بیٹھی تھی۔ سب سے پہلے خولہ کی نظر اس پہ پڑی۔

''اسے کیا ہوا ہے؟'' وہ نائلہ سے پوچھ رہی تھی۔

''مجھے کیا پتہ۔'' وہ لاعلم تھی۔ خولہ نے اس کا کندھا ہلایا۔

''پروا...... پروا! کیا بات ہے؟'' اس نے سر اوپر کیا تو آنکھیں سرخ سرخ ہو رہی تھیں۔

''میرے سر میں بہت شدید درد ہو رہا ہے۔'' وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

ثمینہ اور خولہ کے دل میں کئی سوال سر اٹھا رہے تھے۔

''ویسے کسی اچھے گھر کی لڑکی لگتی ہے یہ، کیوں سلیمان......!'' خولہ، بھائی کو دیکھ رہی تھی جو ریموٹ کنٹرول اٹھائے چینل سرچنگ میں مصروف تھا۔

''ہوں۔'' وہ مختصراً بولا۔

''اگر آپ ثناء کو پسند نہ کر چکی ہوتیں تو یہ بھی بری نہیں تھی۔''

''ارے بس کرو، ایسی بے نام و نشان لڑکی کو میں کبھی بہو نہ بناؤں۔'' ثمینہ کو تاؤ آ گیا۔

''مما! بھائی اسے لائے ہیں، انہیں سب پتہ ہوگا۔ یہ بے نام و نشان کیوں ہے؟ شکل و صورت، رکھ رکھاؤ سے بہت سلجھی ہوئی لگتی ہے۔ کسی اچھے ماں باپ کی اولاد ہوگی۔'' خولہ کے یوں کہنے پہ سلیمان دل ہی دل میں طنزاً مسکرایا۔

(اچھے ماں باپ کی اولاد، حمید جوکھیو کی اولاد جس کا نام سنتے ہی شریف لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔)

''تم سن لو، میں منگنی کی رسم کر کے رہوں گی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔'' ثمینہ پوری طرح اپنی مرضی کرنے کے لیے آمادہ نظر آ رہی تھیں۔

''خولہ منگنی کا جوڑا اور انگوٹھی خرید لیتے ہیں۔ چند رشتہ داروں کو بھی بلا لیں گے، باقی کسر شادی پہ پوری کر لیں گے۔ خوب دھوم دھام سے کروں گی میں شادی اپنے بیٹے کی۔ مصطفیٰ کے ولیمہ کے روز منگنی کا فنکشن کر لیں گے۔ کیوں، کیسا ہے؟'' انہوں نے خولہ اور نائلہ سے تائید چاہی۔

"ٹھیک ہے مما! جیسے آپ کی مرضی۔" یہ خولہ تھی جس نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

❁

آج ولید اور حوریہ کی مہندی کا فنکشن تھا۔

گلاں گوریاں دے وچ ٹوئے
اسی مر گئے نی اوئے اوئے
ہائے ہائے دہائی پے گئی
کڑی کڈ کہ کالجہ لے گئی

ہیجان خیز میوزک کی دھن پہ ساجدہ بڑی مہارت سے ناچ رہی تھی۔ وہ آج جانِ محفل بنی ہوئی تھی۔ ماحول خوب بنا ہوا تھا۔ اگلا گانا شروع ہوا تو مصطفیٰ کا ایک کزن بھی ساجدہ کا ساتھ دینے کے لیے آ گیا۔

دے سانوں سوہنی لگدی تو ساری نی ساری

سارے لڑکے بڑی دلچسپی سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ مصطفیٰ کا خاندان روشن خیال تھا۔ لڑکے لڑکیاں اکٹھے ہی ہوتے جبکہ حوریہ کے خاندان میں ایسا نہیں تھا۔ عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ انتظام کیا جاتا، پر یہاں ایسا کوئی فرق نہیں روا رکھا گیا تھا۔

"کتنی خوبصورت اور بولڈ لڑکی ہے۔" مصطفیٰ کا چچازاد بولا۔

اسٹیج پہ مصطفیٰ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، وہ اس کے سامنے ہی تو تھی۔ پارے کی طرح متحرک اور بے چین۔ سرخ ساڑھی میں شعلہ جوالہ بنی دہک رہی تھی۔

"مصطفیٰ بھائی کی بیگم تو ایکدم بیک ورڈ سی لگتی ہیں۔ شرمیلی اور جھینپو سی۔" مصطفیٰ کے دائیں جانب سے آواز ابھری۔ یہ اس کی پھوپھوزاد عافیہ تھی۔

"چل نہیں پائے گی اس کے ساتھ۔" کوئی اور بولا تھا وہ سب صوفے کے پیچھے کھڑی تھیں، اس لیے وہ ان کے تبصرے سن رہا تھا۔

"یہ لڑکی جانے کون ہے، اس کا بائیو ڈیٹا تو معلوم کرو۔ مجھے بہت اچھی لگی ہے۔" عافیہ کی اس بات پر مصطفیٰ کو جانے کیوں بے حد جلن ہوئی۔

"اتنی زبردست ڈریسنگ کرتی ہے یہ جبکہ حوریہ تو چھ گز کا تھان ہر وقت سر پہ لپیٹے رہتی ہے۔ مجھے تو مصطفیٰ بھائی پہ ترس آ رہا ہے۔ وہ اریبہ کتنی پیاری تھی، مرتی تھی مصطفیٰ پہ، پر اس نے تو

گھاس ہی نہیں ڈالی۔" وہ سب یوں بول رہی تھیں جیسے باقی سب بہرے ہوں۔

ساجدہ تھک ہار کر بیٹھی تو مصطفیٰ کی کزنز نے ڈھولک سنبھال لی۔ زارا نے اپنے پاس پروا کی بھی جگہ بنائی۔

مہندی کی یہ رات
آئی مہندی کی یہ رات
رہے ہاتھوں میں ایسے ہاتھ
دولہنیا ساجن کے ہے ساتھ
اوہو مہندی کی یہ رات

تالیاں بجاتے بجاتے پروا کو احساس ہوا کہ وہ کس کی نگاہوں کے گھیرے میں ہے۔ وہ پھر سر جھٹک کر باقیوں کا ساتھ دینے لگی۔

ذرا ڈھولکی بجاؤ گوریو
میرے سنگ سنگ گاؤ گوریو

زارا پوری قوت سے گلا پھاڑ رہی تھی۔ پروا بے سکون سی تھی۔ جانے کون تھا جو اسے نگاہوں کی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ وہ سب کے پاس سے اٹھ آئی اور دور جا کے بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے اسٹیج پہ سلیمان اور لڑکوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔

پرسوں مصطفیٰ کے ولیمہ کے فنکشن اس کی منگنی کی رسم ہونی تھی۔ یہ بات کنفرم ہو چکی تھی کیونکہ ثمینہ منگنی کا جوڑا اور انگوٹھی لے آئی تھیں۔ یکا یک ہی اس سارے ہنگامے سے اس کا دل اچاٹ ہونے لگا۔ شاہ کچھ شرمائی شرمائی سی لگ رہی تھی۔

سلیمان کو وہ شروع سے ہی پسند کرتی تھی۔ دل کی خواہش یوں پوری ہو جائے گی، اس نے سوچا تک نہ تھا۔ اب آنٹی نے بات کی تو اس کا دل کھل گیا۔ سلیمان کو چوری چوری وہ کئی بار دیکھ چکی تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے اس کا ہونے جا رہا تھا۔ اب تو وہ اسے دیکھنے کا حق رکھتی تھی۔

تیمور بڑی ڈھٹائی سے ابھی تک پروا کو گھورے جا رہا تھا۔ ولید نے اس کی حرکت دیکھ لی تھی۔

"شرم نہیں آتی برادر! پرائی لڑکی کو دیکھتے ہوئے۔" وہ ذرا بھی نہ گھبرایا۔

"بھائی جی ٹی روڈ پہ بریکیں لگ گئی ہیں۔" وہ بڑی بے چارگی سے بولا تو ولید کی ہنسی

چھوٹ گئی۔

"گویا تمہارا دل نہ ہوا! جی ٹی روڈ بن گیا ہے۔"

"فی الحال تو بڑی ہلچل مچی ہوئی ہے۔" وہ پروا کو نگاہوں میں بساتے ہوئے بولا تو ولید کو اس کی حالت پر رحم آ گیا۔

"ٹھہرو، میں ابھی دردِ دل کا علاج کرتا ہوں۔ زارا سے پوچھتا ہوں۔" اس نے تیمور کو تسلی دی اور زارا کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی مگر پھر خیال آنے پہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"یہ فلرٹ والا معاملہ تو نہیں ہے۔" وہ اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"ارے نہیں، نہیں، سو فیصد سیریس ہوں۔ میری حالت دیکھ کے لگ نہیں رہا ہے کیا۔"

"کیا ہوا ہے تمہاری حالت کو۔"

"رنگ زرد ہو رہا ہے، ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں، دل تیز تیز دھڑک رہا ہے، چہرے پہ پسینہ آ رہا ہے، آنکھیں جھکی ہوئی ہیں اور......اور......"

"واقعی تمہاری حالت سیریس لگ رہی ہے۔ میرے بچے، میرے جگر گوشے۔" ولید نے اسے گلے لگا لیا تو وہ مصنوعی آنسو صاف کرنے لگا۔

زارا، شناء کے بلاوے پہ ہجوم سے نکل کے باہر آئی تو اچانک ولید اس کے راستے میں آ گیا۔

"زارا! وہ گرین چوڑی دار پائجامے والی لڑکی کون ہے؟" اس نے نگاہوں کے اشارے سے پوچھا تو وہ تیکھی چتون سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیوں، خیریت تو ہے نا! کہیں عین شادی کے دن گھر سے بھاگنے کا ارادہ تو نہیں ہے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ الٹا ہی سوچنا۔ میرے معصوم سے بھائی کے جگر کے پار عشق کا تیر لگا ہے۔"

"اوہ، آپ کا بھائی اور معصوم۔ آج کی تازہ ترین خبر۔" وہ اسے پوری طرح ستانے پہ تلی ہوئی تھی۔

"ویسے یہ میری بیسٹ فرینڈ پروا ہے، بہت امیر شخص کی بیٹی اور جائیداد کی اکلوتی وارث ہے۔ سلیمان بھائی کی رشتہ دار ہے۔ میں آپ سے بعد میں پوچھوں گی۔" وہ بتا کر شناء کو ڈھونڈنے لگی جو اسے بلا کر خود جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔

تیمور دور بیٹھا بڑی بے تابی سے ولید کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے من و عن زارا سے جو سنا تھا، دہرا دیا۔ اب ولید کا دل کچھ سکون میں تھا۔

"بھائی! کیوں نہ کل زارا کی فرینڈ کو بھی انوائٹ کر لیں۔"

"وہ کس خوشی میں؟" وہ منہ بنا کر بولا۔

"آخر کو میرے بھائی اور بہن کی مشترکہ مہندی کا فنکشن ہے۔ میرا بھائی کوئی عام سا تو نہیں ہے نا!" وہ خوب مکھن لگا رہا تھا۔

"نہیں نہیں، آپ کا بھائی کوئی عام سا تھوڑا ہے۔ اگلے امریکی صدارتی الیکشن میں صدارت کا امیدوار ہے۔" ولید نے اسے زوردار دھپ لگائی تو وہ برا مان کر اس سے دور کھڑا ہو گیا۔

وہ حسینہ خاصی اداس سی لگ رہی تھی۔ تیمور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے پاس چلا گیا۔

"بات سنیے، زارا کہاں پہ ہیں؟ میں حوریہ کا بھائی ہوں۔" لگے ہاتھوں اس نے تعارف بھی کروا دیا تو پروا نے اسے قدرے بے توجہی سے دیکھا۔ وہ قطعی لفٹ دینے کے موڈ میں نہیں لگ رہی تھی۔

"مجھے نہیں پتہ، شاید اندر ہو۔" وہ دوبارہ خود میں غرق ہو گئی۔

"کیا آپ شروع سے ہی ایسی ہیں؟"

"جی، کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ اس کی بے سروپا بات پہ غصے میں آ گئی تو وہ احمقانہ جملے کا اثر زائل کرنے کے لیے جلدی سے بولا۔

"میرا مطلب ہے، آپ شروع سے ہی اتنی سنجیدہ رہتی ہیں۔"

"آپ کو کیسے پتہ کہ میں شروع سے ہی سنجیدہ رہتی ہوں؟"

"میں آپ کو کافی دیر سے دیکھ رہا تھا۔"

"اچھا، وہ آپ تھے جو مجھے گھور رہے تھے، کس خوشی میں؟" اس کے پے در پے جملوں سے بے چارا ولید گھبرا گیا۔

"اصل میں......اصل میں آپ اچھی بہت لگ رہی تھیں نا!" اس کی گھبراہٹ پر پروا کو ہنسی آ گئی۔

اسمارٹ سا یہ لڑکا اسے خاصا بے وقوف اور بے ضرر لگا تھا۔

"آپ ہنستے ہوئے اور بھی اچھی لگتی ہیں۔" اس کا لہجہ بہت عام اور سادہ تھا۔ سامنے بیٹھے سلیمان کی نگاہ قطعی غیر ارادی طور پر اس طرف اٹھی تھی۔

پروا ہنس رہی تھی۔ مصطفیٰ کے سالے کے ساتھ اور ہنستے ہوئے اس کے گال پہ پڑنے والے ڈمپل اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ مصطفیٰ کے پاس اٹھ آیا۔

''نائلہ کہاں ہے؟'' وہ اچانک اسے سامنے پا کے گڑبڑائی۔ تیمور ابھی ابھی یہاں سے ہٹا تھا۔

''مجھے نہیں پتہ۔'' وہ سلیمان کے لہجے اور آنکھوں میں پائے جانے والے غصے کی لپک جاننے سے قاصر تھی، سو بڑے آرام سے بولی۔ اس کا یہ بے پرواہ انداز سلیمان کو تپا گیا۔

''گھر جانا ہے یا ساری رات یہیں گزارنے کا ارادہ ہے۔'' پروا نے نگاہ چرائی۔ عین اس وقت زارا کی نظر ان دونوں پہ پڑی۔ وہ لپک کے آئی۔

''پلیز پروا! رُک جاؤ نا۔'' وہ منت سے اس کے ہاتھ تھام کے بولی۔

''میں نہیں رُک سکتی کیونکہ آنٹی سے پوچھا نہیں ہے۔ پھر مجھے کسی اجنبی جگہ، اجنبی بستر پر نیند بھی نہیں آتی ہے۔''

''نیند کی بچی، شادی کے بعد سسرال بھی تو جاؤ گی نا آنٹی کا گھر چھوڑ کر، وہاں کیسے سوؤ گی؟'' سلیمان کے سامنے شادی کے ذکر پہ وہ بلش سی ہو گئی۔

''سلیمان بھائی! آپ ہی سمجھائیں نا اسے، دو روز بعد شاہ آپی کی منگنی ہے۔ تمہارے رُکے بغیر خاک مزا آئے گا۔'' زارا نے اسے مشکل میں ڈال دیا۔

''پلیز زارا! میری طبیعت بھی آج ٹھیک نہیں ہے۔ پر اس کل رُک جاؤں گی۔ آج کی رات نائلہ کو روک لو۔'' اس نے بمشکل تمام اپنی جان چھڑائی۔

زارا کا منہ بنا ہوا تھا۔ آتے ہوئے پروا، سلیمان کے ساتھ اکیلی تھی۔ نائلہ وہیں پہ تھی اور ثمینہ، اصغر صاحب کے ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے ہی جا چکی تھیں۔

''آپ زارا کے کہنے کے باوجود رُکی نہیں۔'' وہ آہستہ آہستہ ڈرائیونگ کر رہا تھا جیسے اسے جلدی نہ ہو۔ حالانکہ ڈھائی بج چکے تھے۔

''میرا جی نہیں چاہ رہا تھا۔'' پروا کا دل گداز سا ہو چلا تھا۔

''اچھا وہ لڑکا کون تھا جس کے ساتھ آپ بات کر رہی تھی؟'' اب سچ مچ وہ حیران ہوئی کیونکہ آج سے پہلے تک سلیمان نے اس سے اتنی زیادہ باتیں نہیں کی تھیں۔ وہ خود پہ قابو پا چکی تھی۔

''کہہ رہا تھا حوریہ کا بھائی ہوں۔ زارا کا پوچھ رہا تھا۔ عجیب ہونق اور بے وقوف سا

لڑکا تھا۔ کہتا ہے آپ ہمیشہ سے اسی طرح اداس رہتی ہیں۔'' اس کا منہ بن گیا تھا۔

سلیمان کے دل کو ہولے سے کسی نرم و نازک احساس نے چھوا جس کی شدت سے وہ خود بھی فی الحال ناواقف تھا۔ ایسا ہونا نہیں چاہیے کیونکہ وہ حمید جوکھیو کی بیٹی تھی۔ اس حمید جوکھیو کی جس نے اسے کیریئر کے حوالے سے جذباتی بلیک میل کیا تھا اور سزا بھگتے بغیر اس دنیا سے چلا گیا تھا۔

گھر پہنچنے تک وہ خاموش رہا۔ رات تو خاموشی سے گزر گئی۔ پر صبح پرسکون نہ تھی۔ ثمینہ بیگم کو جب سے پتہ چلا کہ وہ رات گئے سلیمان کے ساتھ اکیلی واپس آئی ہے، تب سے ان کا منہ بن گیا تھا۔

پروا سے جانے کیوں انہیں خطرہ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ حالانکہ سلیمان نے شاید ہی اسے کبھی مخاطب کیا ہو۔ وہ گھر میں ہوتا بھی تو پروا اس کے سامنے آنے سے گریز کرتی پھر بھی خطرے کی تلوار ہر وقت سر پر لٹکتی ہی رہتی۔

مجھے چشم ناز سے مت گرا
مجھے چشم ناز سے مت اٹھا
میرے ہم نفس میرے ساتھیا
تیرے سارے عذر قبول ہیں
یہ محبتوں کے اصول ہیں
رہوں کب تلک تیری راہوں میں
مجھے رکھ کے دیکھ اپنی راہوں میں
مجھے رکھ کے دیکھ اپنی نگاہ میں
میری خواہشیں تری چاہ میں
کسی گزرے وقت کی دھول ہیں
یہ محبتوں کے اصول ہیں
میری زندگانی دھواں دھواں
تیرے ساتھ جاؤں کہاں کہاں
میری آرزوئیں خزاں خزاں
تیرے پاس پھول ہی پھول ہیں

یہ محبتوں کے اصول ہیں
مجھے میری ذات پہ قدرتیں
کہاں میں کہاں میری حسرتیں
میری جان جاں تیری نفرتیں
میری زندگی کا حصول ہیں
یہ محبتوں کے اصول ہیں

دو روز بعد سلیمان کی منگنی تھی۔ منگنی کا جوڑا اور دیگر لوازمات ثمینہ، خولہ کو دکھا رہی تھیں جو کل رات آئی تھی۔ پروا اس کے چھوٹے بیٹے کے ساتھ کھیل رہی تھی جو اس سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔

''پروا! ذرا ادھر تو آنا۔'' خولہ نے سونو میں مگن پروا کو پکارا تو وہ اسے اٹھائے چلی آئی۔

''جی آپی!''

''ذرا یہ شرٹ تو ساتھ رکھ کے دکھاؤ، کلر سوٹ کرے گا کہ نہیں کیونکہ شاہ کے چہرے کی رنگت بھی صاف ہے تمہاری طرح۔'' انہوں نے پاس بلانے کا سبب بتا کر میرون اسٹائلش سی کامدار شرٹ اس کی طرف بڑھائی تو وہ انکار نہ کر سکی۔

سونو نیچے اتارے جانے پہ مچل گیا اور اس کی ٹانگوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ پروا نے فوراً شرٹ خولہ کی طرف پھینکی جیسے کپڑا نہ ہو، عفریت ہو کیونکہ اس نے دروازے میں کھڑے سلیمان کو دیکھ لیا تھا۔

''آؤ بھئی سلیمان! دیکھو تو شاہ کے لیے کتنے خوبصورت کپڑے لائے ہیں ہم۔''

''سوری! یہ آپ خواتین کا شعبہ ہے، مجھے تو معاف ہی رکھو۔'' اس نے جان چھڑائی۔

سونو، ماموں کو دیکھ کر اس کی طرف دوڑ گیا۔ پروا اس کے پاس سے گزر کر باہر جانے لگی تو سلیمان نے اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی کی جھلک صاف طور پر محسوس کی۔

نہ وہ کچھ کہتی تھی، نہ بولتی تھی، نہ احساس دلاتی تھی پھر یہ نمی کیا معنی رکھتی تھی؟

❁

زمان صاحب کے گھر میں خوشیوں کی بارات اتری ہوئی تھی جیسے۔ ولید اور حوریہ کی مہندی کا فنکشن اکٹھے ہو رہا تھا۔ لڑکیاں بالیاں تیار ہو کر ڈھول پیٹ رہی تھیں۔ تیمور کو بڑی شدت

سے اس دشمن جاں کا انتظار تھا جو پہلی نگاہ میں ہی صبر و سکون لوٹ کر لے گئی تھی۔

پہلے ولید کے سسرال والے مہندی لے کر آئے۔ دھما چوکڑی سی مچی ہوئی تھی۔ اوپر سے ساجدہ نے خوب رونق لگائی تھی۔ کالونی کے اکثر لڑکوں کی سانسیں اسے دیکھ کے بے قابو ہو گئی تھیں۔ کالے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس آج وہ...... باقی دنوں سے بڑھ کر حسین لگ رہی تھی۔

سب حامد کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ تمام تر تعریفیں جو نگاہوں اور اشاروں میں کی گئی تھیں، اس نے اپنا حق سمجھ کر وصول کی تھیں۔ حامد کے ساتھ اپنی شادی کو اس نے تقدیر کی ناانصافی قرار دیا تھا۔ سو اپنی دانست میں وہ اسی تقدیر کا مذاق اڑا رہی تھی۔

شادی کے بعد شہر آ کر کافی ہوشیار ہو گئی تھی اور مردوں کی فطرت کو سمجھنے لگی تھی۔ سو اس گر کو وہ بڑی کامیابی سے استعمال کر رہی تھی اور اپنی ویلیو کو بڑھا رہی تھی، ورنہ آفاق عالم اس کی ایک نگاہ ناز کی خاطر ترس نہ رہا ہوتا۔

وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی، پر مجبوریوں اور تلخی نے بہت سے سبق پڑھا دیے تھے۔ اپنی دانست میں وہ حامد سے اس بے جوڑ شادی کا انتقام لے رہی تھی۔

❁

حوریہ کی سسرال والے گیارہ بجنے کے باوجود ابھی تک نہیں آئے تھے۔ گیارہ سے ساڑھے گیارہ بھی بج گئے۔ اب تو صفورا بیگم کے دل میں برے برے خدشات جنم لینے لگے۔ انہوں نے ولید سے حوریہ کے سسرال فون کرنے کے لیے کہا۔ نیچے شور بہت زیادہ تھا، وہ سیل فون لے کر چھت پر چلا گیا۔

آدھے گھنٹے سے اوپر وقت گزر چکا تھا، جانے تیمور کہاں تھا؟ صفورا بیگم نے اس کی تلاش میں ساجدہ کو بھیجا۔ وہ کہیں نہیں تھا، ڈھونڈ ڈھانڈ کو ساجدہ دوبارہ ان کے پاس آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد تیمور خود ہی چلا آیا اور صفورا بیگم اور ولید کو ایک طرف لے گیا۔ ولید اسکی سرخ ہوتی آنکھیں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''مصطفیٰ بھائی نے شادی سے انکار کر دیا ہے اور صبح سے گھر سے غائب ہیں۔ اینہ آنٹی نے مجھے بتایا ہے۔'' وہ اس وقت صبر و ضبط کی کڑی منزلوں سے گزر رہا تھا۔

''ہائے...... نہیں...... میرے مولا......!'' صفورا بیگم سینہ پکڑ کر دہیں دہری ہو گئیں۔

وہ دونوں ماں کو سنبھالنے لگے۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایسے میں یہ افتاد

آپڑی۔ ولید، ماں کو اسپتال لے گیا اور تیمور، چچا کے پاس آ گیا۔ بات چھپانا بیکار تھا۔ کب تک اس پر پردہ ڈالا جا سکتا تھا۔ بڑی نازک صورت حال تھی۔ ولید کے سسرال والے واپس چلے گئے۔ صرف اس کی ساس سسر اور دو کزن یہاں تھے۔

ولید کی بیوی کا نام صدف تھا۔ اس کے گھر والے بڑے معقول اور سلجھے ہوئے لوگ تھے۔ اس وقت صدف کے والدین نے ہی تیمور کو تسلی دی اور باقی رشتہ داروں کو مناسب الفاظ میں اس سانحے کے بارے میں بتایا۔ حوریہ اندر تھی، اسے اب تک پتہ نہیں چل سکا تھا کہ باہر کیا قیامت گزر چکی ہے۔ جب دبی زبان میں سرگوشیاں اس تک پہنچیں تو وہ بے چین ہو گئی۔

”کوئی تیمور بھائی یا ولید بھائی کو بلا کر لے آئے اور امی کہاں ہیں؟“ اس وقت وہ روایتی شرم وحیا بھول گئی تھی اور پھولوں کے گجرے بالوں سے نوچتی وہ بیڈ سے اتر آئی۔

ولید کی ساس، طاہرہ بیگم نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر دوبارہ اسے بیڈ پہ بٹھا دیا۔ اتنے میں تیمور آ گیا۔

”حوری میری بہن! امی ہاسپٹل میں ہیں۔ مصطفیٰ بھائی نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔“ وہ اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر رونے لگا تو حوریہ کے آنسو اندر ہی اندر دم توڑ گئے۔

”مصطفیٰ نے اگر شادی سے انکار کر دیا ہے تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ امی کی فکر کرو، انہیں کچھ نہیں ہونا چاہیے۔“ نازک سی کمزور دل کی مالک حوریہ اس وقت بے پناہ حوصلے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ طاہرہ بیگم نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔

پھر ولید صبح چار بجے صفورا بیگم کو لے کر واپس آیا۔ ڈاکٹر نے ضروری ٹریٹ منٹ کے بعد انہیں فارغ کر دیا تھا۔ حوریہ پر نظر پڑتے ہی ان کو نئے سرے سے سب کچھ یاد آنے لگا۔ وہ ان کے سینے سے لگ گئی۔

”امی! آپ ٹینشن نہ لیں۔ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ شکر ہے، میں ابھی سے بچ گئی ہوں، ورنہ آئندہ جانے کیا ہوتا۔“ حوریہ کو پتہ تھا، اس وقت صرف وہی انہیں احساسِ زیاں سے نکال سکتی ہے۔

”حوری! مجھے معاف کر دو۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ یہ لوگ ایسے نکلیں گے۔“

”کس بات کی معافی امی! مجھے شرمندہ نہ کریں۔ جا کر آرام کریں۔ ولید بھائی کی بارات جانے میں چند گھنٹے رہ گئے ہیں۔ آپ دولہا کی ماں ہیں۔ آپ کو بالکل فٹ فاٹ لگنا چاہیے۔“

وہ ہر ممکن طریقے سے انہیں اس صدمے سے نکالنا چاہتی تھی۔ انہوں نے اپنی باہمت اور مضبوط سی بیٹی کی پیشانی چوم لی۔

ولید کی شادی کے لیے کیا کیا پروگرام بنائے گئے تھے۔ کتنے ارمان تھے انہیں۔ پر حوریہ والے معاملے کی وجہ سے بارات سادگی سے گئی اور صدف رخصت ہو کر چلی آئی۔

صدف کو سسرال آئے ڈیڑھ دو گھنٹے ہی گزرے تھے کہ اس کے پپا، مما، بڑے تایا اور تائی چلے آئے۔ حوریہ، بھابھی کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ سب اور صفورا بیگم، ولید کے ساتھ دوسرے کمرے میں تھے۔ جانے کیا بات تھی۔ حوریہ کا دل نئے سرے سے گھبرانے لگا۔ ان سب لوگوں کو کمرہ بند کیے اندر بیٹھے کافی دیر ہو گئی تھی۔

تیمور بھی شاید اندر تھا۔ کافی دیر سے اس کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر آئی کہ شاید کسی سے اس کمرہ بند اجلاس کے بارے میں معلومات مل سکے۔

خاصی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک ایک کر کے سب باہر نکلے۔ صدف بھابھی کے تایا اور تائی پریشان کھڑی حوریہ کے پاس آئے۔ پیچھے پیچھے صفورا بیگم، ولید اور تیمور بھی تھے۔

”مبارک ہو بہن آپ کو، میری کوشش ہو گی کہ ساری زندگی آپ کا مان سلامت رہے۔ میری مالک سے بھی یہی دعا ہو گی۔ اب حوریہ آپ کی نہیں، ہماری بیٹی ہے۔“ صدف بھابھی کی تائی نگینہ نے حوریہ کو گلے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

ریاست صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہزار ہزار کے کئی نوٹ حوریہ کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ وہ بے چاری حیران نگاہوں سے بھائیوں اور ماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”میری بہنا! شرما لو، کیا اکیسویں صدی کی لڑکیوں کی طرح آنکھیں پھاڑ رہی ہو۔“ تیمور سب سے آگے ہونے پہ اس کے کان میں بولا۔

وہ دونوں بھائی اسے شریر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ صفورا بیگم بھی بے پناہ خوش تھیں۔

”کل تمہاری شادی ہے۔ پروگرام کے مطابق آج اسی خوشی میں رت جگا ہو گا۔ کیوں ولید صاحب!“ تیمور نے اس سے تائید چاہی۔

”ہاں، کیوں نہیں مگر کام بھی بہت سارے ہیں۔ دعا کرو سب کچھ عزت کے ساتھ ہو جائے۔“

”ضرور کیوں نہیں۔“ تیمور صدق دل سے بولا۔

حوریہ کی کزنز اسے اندر لے گئیں۔ پھر سارے سوالوں کے جواب صفورا بیگم کے ذریعے مل گئے۔ اس کی شادی صدف بھابھی کے کزن عثمان سے ہو رہی تھی۔ عثمان کے نام پہ اسے سب کچھ یاد آ گیا۔

ولید کے لیے صفورا بیگم لڑکی ڈھونڈ رہی تھیں۔ جب اس نے خود ہی اپنے دوست فراز کی بہن صدف کا ذکر کر دیا۔ زمان صاحب لڑکی والوں سے ملے۔ بہت اچھا، معزز اور سلجھا ہوا گھرانہ تھا۔

ولید اور صدف کی منگنی کے بجائے براہ راست نکاح کا فیصلہ کیا گیا۔ دونوں گھرانوں میں میل جول بڑھا تو آنے جانے کے راستے بھی ہموار ہو گئے۔ ولید کے نکاح کا فنکشن اچھا خاصا پر رونق بن گیا تھا۔ حوریہ، دلہن بنی صدف کے پاس چلی گئی جو اندر کمرے میں تھی۔ وہ دروازے پر ہی رُک گئی۔ صدف نے آواز دے کر اسے بلایا۔

''آؤ نا رُک کیوں گئیں۔ یہ میرا کزن عثمان ہے۔'' لگے ہاتھوں اس نے تعارف کا فریضہ بھی انجام دے ڈالا۔

کزن موصوف نے بڑی گہری نگاہ سے اس کا جائزہ لیا جس پہ اسے الجھن سی ہونے لگی۔ اس نے شکر کیا جب صدف کو نکاح کے بعد ہال میں لے جایا گیا، تب اس ڈھیٹ شخص کی نگاہیں مسلسل اس کا پیچھا کرتی رہی تھیں۔ اس کی کزنز بھی بھانپ گئیں کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ آخر ایک اچھا بھلا اسمارٹ برسر روزگار نوجوان اس میں دلچسپی لے رہا تھا اور اس نے بالکل بھی اس دلچسپی کو چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ گھر آ کر بھی روحینہ اسے چھیڑتی رہی۔

تین چار دن بعد صدف بھابھی کا فون آ گیا۔ رسمی دعا سلام کے بعد وہ اصل گفتگو کی طرف آئی۔

''اے محترمہ! میرے اچھے بھلے کزن کو کیا کر دیا ہے۔ کہیں چین ہی نہیں ہے اسے۔''

''جی کیا مطلب۔'' وہ ابھی پر تصور کے پردے پہ دو شریر آنکھیں ابھر آئیں جن کا شوخ سا پیغام بڑا واضح تھا۔

''مطلب اس وقت سمجھ آئے گا جب تایا اور تائی جان تمہیں ہمیشہ کے لیے مانگنے آئیں گے۔'' صدف شرارت کے موڈ میں تھی۔

عثمان کے مما پپا دونوں بڑے بیٹے اور بہو کے پاس کینیڈا گئے ہوئے تھے۔ ان کی واپسی ڈیڑھ دو ماہ بعد متوقع تھی۔ عثمان کو ایک ایک روز گزارنا محال لگ رہا تھا۔ گھنی پلکوں اور نشیلی

آنکھوں والی وہ لڑکی اسے اپنے آپ سے بھی چرائے گئی تھی۔ صرف چند لمحوں کا کھیل تھا اور اس کا دل اپنے اختیار میں نہ رہا تھا۔ مما، پپا کی واپسی تک انتظار تو کرنا تھا۔

ادھر حوریہ کے لیے چند روز بعد ہی مصطفیٰ کا رشتہ آ گیا۔ انہوں نے اتنی بے تابی اور وارفتگی دکھائی کہ زمان صاحب کو ہاں کرتے ہی بنی۔ عثمان کے والدین کے لوٹنے سے پہلے ہی حوریہ، مصطفیٰ کے نام کی انگوٹھی پہن چکی تھی۔ عثمان کے خوابوں کا تاج محل زمین بوس ہو گیا۔ گھر والوں نے کئی اور لڑکیوں کے نام لیے، پر اس کا ایک ہی جواب تھا۔

''فی الحال میں ذہنی طور پہ اس کے لیے تیار نہیں۔'' صرف صدف اس کے دلی کرب سے آگاہ تھی پر وہ بھی کچھ نہ کر سکتی تھی۔

یہ قسمت کی کرنی تھی حوریہ کا نصیب تھا کہ عثمان کی خوش قسمتی کہ عین وقت پر مصطفیٰ غائب ہو گیا۔ تب ہی ریاست صاحب اور نگینہ خاتون نے خاندان والوں کے باہمی مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ حوریہ کے لیے عثمان کا رشتہ ڈالا جائے اور ولید کے ولیمہ کے روز اس کی آرزو پوری کر دی جائے۔

جب انہوں نے اس ارادے کا اظہار صفورا بیگم اور حوریہ کے بھائیوں سے کیا تو مارے تشکر اور خوشی کے کتنی دیر ان سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ کیسے فرشتہ صفت تھے یہ لوگ کہ عین وقت پہ ان کی عزت کا بھرم رکھ لیا تھا۔ انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اسی وقت مٹھائی کھلا کر بات پکی کی گئی۔

لڑکے والوں کے پاس وقت کم تھا، ہال کی بکنگ کروائی تھی۔ حوریہ کے لیے شادی اور ولیمہ کا سوٹ لینا تھا۔ رشتہ داروں کو خود جا کر دعوت دینی تھی۔ ویسے بھی صدف اور ولید کے ولیمہ پہ وہ سب آ ہی تو رہے تھے۔

صبح سے عثمان کے گھر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ بارہ بجے کے قریب ایک بوتیک سے حوریہ کے لیے شادی کا جوڑا آیا۔ چونکہ ناپ دے کر تو نہیں سلوایا تھا، اس لیے ازسرنو اس میں حوریہ کے لحاظ سے تبدیلیاں کی گئیں اور یہ کام چھوٹی پھوپھو کے سپرد کیا گیا۔

ظاہر ہے عثمان کے پاس شادی کی شاپنگ کا وقت ہی کہاں تھا، سو اس نے وارڈروب سے ٹو پیس نکالا جو نیا ہی تھا۔ فی الوقت اسی سے کام چلایا گیا۔

چار بجے کے قریب عثمان کی بارات شادی ہال میں پہنچی۔ حوریہ ابھی تک پارلر سے

نہیں آئی تھی کیونکہ اس کا سوٹ کافی دیر سے بھجوایا گیا تھا۔ مہندی تو رات ہی میں اس کی کزن نے لگا دی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اس کی تو کمر ہی اکڑ گئی تھی۔ صبح جھنجوڑ جھنجوڑ کر جب اسے جگایا گیا تو اس کا بالکل بھی اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن صدف بھابھی اور ولید بھائی کے ساتھ ناشتہ کرنا بھی لازمی تھا۔ یہاں الٹا حساب ہو گیا تھا۔

صدف اور ولید کافی دیر سے بیدار ہو کر حوریہ کے انتظار میں تھے۔ مہندی اتارنے کے بعد اس نے منہ ہاتھ دھویا تو یکدم باتھ روم کا دروازہ تواتر سے بجنے لگا۔

''اب نکل بھی آؤ، صدف بھابھی نے پارلر بھی جانا ہے۔'' یہ اس کی خالہ زاد مومنہ تھی۔

صدف کے گھر والوں نے کافی پرتکلف ناشتہ بھجوایا تھا۔ پہلا نوالہ ولید نے توڑا اور حوریہ کے منہ میں ڈالا تو آنسوؤں کی نمی اس کے گلے تک اتر گئی۔

''روئی تو میں ماروں گا۔'' اس کا سرخ ہوتا چہرا بتا رہا تھا کہ اب رونے کا ایک بڑا طویل پروگرام شروع ہونے والا ہے۔ ولید کی وارننگ پر وہ روتے روتے مسکرا دی۔

باقی لوگ ناشتے کے بعد اٹھ گئے۔ وہ بھابھی کے پاس بیٹھی رہی۔

''بہت خوبصورت رنگ آیا ہے مہندی کا۔'' صدف اس کے ہاتھ کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کے انداز میں اجنبیت کا شائبہ تک نہ تھا۔ یوں لگ رہا تھا، وہ شروع سے اس گھر میں رہتی آ رہی ہے۔ ان کے دکھ درد میں شریک رہی ہے۔

''یہ دیکھو، ولید نے رونمائی کا گفٹ دیا ہے۔'' صدف نے اسے گردن میں چمکتا ننھے سے دل کی شکل کا لاکٹ دکھایا۔

''بہت خوبصورت ہے۔'' اس نے دل سے تعریف کی۔ اتنے میں باقی لڑکیوں کا ریلا سا اندر گھس آیا۔ صدف کی ڈھیر ساری کزنز بھی ان میں شامل تھیں۔

''دونوں دولہنیں کیا راز و نیاز کر رہی ہیں؟'' یہ صدف کی منہ پھٹ سی پھوپھو زاد مہرین تھی۔

''ارے میں نے کیا راز و نیاز کرنے ہیں۔ وہ تو عثمان کرے گا اور خوب اچھی طرح کرے گا۔ بڑا ہجر کا عذاب سہا ہے بیچارے نے۔ ایک ایک پل تڑپ کر گن گن کر گزار رہا ہوگا کل سے۔'' صدف بھی ان کے ساتھ مل کے اسے چھیڑنے لگی تو حوریہ بری طرح بلش ہو گئی۔

اس دوران کسی نے بھی ساجدہ کی چبھتی ہوئی نگاہوں کو محسوس نہیں کیا۔

ولید اور صدف کے چہرے پر بکھری آسودگی اور مسرت اسے اندر ہی اندر کوڑیالے ناگ کی طرح ڈنک مار رہی تھی۔ حالانکہ دو روز پہلے تک وہ کتنی خوش تھی۔ حوریہ کے گھر میں ماتم کا سماں تھا۔ اس نے خوب جشن منایا، اور بظاہر صغرا بیگم کو تسلی دیتی رہی۔ ان کے ساتھ روئی اور مصطفیٰ کے گھر والوں کو کوسنے بھی دیے۔

اب حوریہ شرماتے ہوئے وہاں سے اٹھی تو اس کی آنکھیں کسی زہریلی ناگن کی طرح دہکنے لگیں۔ صدف پارلر جا چکی تھی۔ حوریہ، عثمان کی طرف سے عروسی جوڑا آنے پر پارلر چلی گئی۔ صغرا بیگم نے ساجدہ کو اس کے ساتھ بھیجا۔

عثمان کی ایک کزن بھی ہمراہ تھی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد حوریہ تیار ہو کر آئی تو اس پہ نظریں ٹھہرنا مشکل تھا۔ ساجدہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سادہ سے حلیے والی حوریہ ہی ہے جو ہمیشہ دوپٹہ ماتھے تک اوڑھے رہتی جس کی آنکھیں کاجل سے محروم رہتیں جو کسی بھی قسم کی چینک مٹک سے یکسر خالی تھیں جو ناز و انداز سے کوسوں دور تھی۔ آج دولہن بن کر غضب ڈھا رہی تھی۔ اس کی شرمیلی مسکان نے پورے چہرے کو منور کر دیا تھا۔

ہال کے ساتھ بنے چھوٹے سے کمرے میں حوریہ اس وقت شریر لڑکیوں کے گھیرے میں تھی۔

''عثمان کافی ضدی بھی ہے۔ اگر ضد میں آیا تو تمہاری خیریت نیک مطلوب نہیں ہے کیونکہ اس پہ مرنے والی سب لڑکیوں کی مشترکہ رائے ہے کہ موصوف کسی ریسلر سے کم نہیں ہیں۔'' مہرین نے اسے ڈرایا۔

ساجدہ بھی وہیں تھی۔ غم و غصے سے اس کے اندر بھونچال سا آ گیا۔

''بارات آ گئی...... بارات آ گئی......'' باہر ہال سے شور کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پل بھر میں سب لڑکیاں سوائے ساجدہ کے حوریہ کے پاس سے غائب ہو گئیں۔

اچانک اس نے حوریہ کے پاس بیٹھ کر رونا شروع کر دیا۔

''کیا ہوا ہے بھابھی!'' حوریہ احتراماً! اسے ہمیشہ بھابھی کہہ کر پکارتی۔

اس وقت بھی پریشان ہو گئی اور اس کے پوچھنے کی دیر تھی۔ ساجدہ کے رونے میں اور بھی شدت آ گئی۔ حوریہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو ساجدہ نے اسے خود سے لپٹا لیا۔

''کیا قسمت ہے تمہاری حوریہ!'' اسکی آنسو بھری آنکھوں میں ریا کا ذرہ برابر بھی

نشان نہ تھا۔

"کیا بات ہے بھابھی! خدا کے لیے مجھے بتادیں، ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔" بے حد پریشان ہوگئی۔

"میں تمہیں بتانا تو نہیں چاہتی، پر کیا کروں، رہا بھی نہیں جاتا۔"

"بتایئے نا بھابھی کیا بات ہے؟" اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

"اصل میں حوریہ بات یہ ہے کہ عثمان اپنے خاندان کی عزت اور باپ کے کہنے پہ تم سے شادی کر رہا ہے، ورنہ یہ جو سب کہہ رہے ہیں نا کہ اس نے تمہاری محبت میں یہ سب کچھ کیا ہے، بالکل جھوٹ اور فریب ہے۔ مجھے خود حامد نے بتایا ہے کیونکہ کسی دوست کے تھرو وہ عثمان کو پہلے سے جانتے ہیں اور اس کی زندگی سے بھی واقف ہیں جیسی وہ گزارتا آیا ہے۔ پرلے درجے کا عیاش اور لڑکیوں کا شوقین ہے۔" حوریہ کا سر نڈھال سے انداز میں جھک گیا۔

اس نے تو سوچا تھا کہ اندھیرے چھٹ گئے ہیں، پر کیا خبر تھی کہ...... ساجدہ اس دوران باہر کا جائزہ بھی لیتی رہی تھی۔

"اب آگے کی سوچو جو ہوا سو ہوا۔"

"بھابھی! میں کیا کروں، میری تو عقل ہی سلب ہوگئی ہے۔ دل چاہ رہا ہے، ابھی اپنی زندگی کا خاتمہ کرلوں۔"

"نہ نہ، ایسا سوچنا بھی مت۔ آنٹی کا تو ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ وہ پہلے ہی بیمار ہیں۔ خدا خدا کر کے ان کی حالت سنبھلی ہے۔"

"میں کہاں جاؤں میرے اللہ!" شفاف موتی ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے لڑھک آئے۔

"اپنے آپ کو اس عیاش اور بدکردار شوہر سے بچا کر رکھو جس طرح بھی ہو سکے۔ عورت کی ویلیو اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہ اَن چھوئی ہو۔ میری بات سمجھ رہی ہونا۔ اب یہ تمہاری سمجھ داری کا امتحان ہوگا کہ تم کس طرح خود کو اس سے بچاتی ہو۔ اوپر والے نے تمہارے نصیب میں اس سے اچھا ہی لکھا ہوگا، اس سے جان چھڑاؤ۔ پر ایک دم نہیں، آہستہ آہستہ پلان بنا کر۔ تمہیں کیا پتہ کہ شاید کوئی اور بھی تمہیں چاہتا ہو۔"

"کون؟" وہ بے ساختہ بولی۔

"مصطفیٰ۔" ساجدہ نے بڑے آرام سے کہا۔

"وہ اس وقت سخت مجبوری کے عالم میں روپوش ہوا ہے۔ کوئی ایسی بات ہے جو وہ تمہیں بتا بھی نہیں سکتا۔ اس لیے تو یہ سب ہوا ہے۔"

"مگر آپ کو کیسے پتہ؟" وہ رونا بھول گئی۔

"آج اس کا فون آیا تھا۔ تمہیں کیا خبر تمہارے دولہن بننے کی خبر سن کر اس کے دل پہ آرے چل گئے ہیں، تڑپ رہا ہے وہ۔ تنہائی اور بے کسی کے عالم میں۔ ادھر تم ایک عیاش مرد کی سیج سجانے جارہی ہو، ادھر وہ پل پل مر رہا ہے۔" انداز کا انداز پرتاثر تھا۔

"مگر وہ مجھے بتا بھی تو سکتا تھا۔"

"کہا نا، اس میں کوئی راز ہے۔ جب اس مشکل سے اس کی جان چھوٹے گی تو وہ تمہیں خود سب بتائے گا۔ فی الحال مجھے بھی نہیں پتہ کہ کیا ہے؟ پر جو بھی ہے، بہت ہولناک ہے جو وہ روپوشی پہ مجبور ہوا ہے۔ پولیس والوں کے سو جن اور سو دشمن ہوتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے، کسی مخالف نے وار کر دیا ہے اس پہ۔" ساجدہ نے اتنے دل دوز انداز میں اس کی حالت کا نقشہ کھینچا کہ حوریہ کا دل ڈانواں ڈول ہونے لگا۔

"میں ذرا باہر سے ہو کے آتی ہوں، تب تک تم اچھی طرح سوچ لو کہ عثمان سے کس طرح اپنے آپ کو بچانا ہے۔" حوریہ نے تھک ہار کر صوفے کی بیک سے ٹیک لگالی۔

ساجدہ وہاں سے اٹھ کر دولہا بنے عثمان کے پاس پہنچ گئی جو شریر لڑکیوں کے گھیرے میں تھا۔ دودھ پلائی کی رسم چل رہی تھی۔ ساتھ ہی ولید تھا۔ وہ بھی سب میں گھل مل گئی۔ رسموں سے فارغ ہونے کے بعد عثمان اسٹیج پر بڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔ جہاں اس کے ساتھ صدف اور ولید بھی تھے۔ لڑکیاں حوریہ کو لینے چلی گئیں۔

"ہائیں یہ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں اتنی ہراساں کیوں ہو رات آنے میں ابھی کچھ گھنٹے باقی ہیں۔" مہرین نے اسکی ٹھوڑی چھو کر سرخ ہوتی آنکھوں میں جھانکا تو وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

"خوفزدہ ہو؟"

"نہیں تو۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"او کے، فی الحال اٹھو۔" مہرین اور ایک دوسری لڑکی نے سہارا دے کر اسے کھڑا کیا۔

سج سج کر چلتی وہ باہر آئی۔ جب وہ بیٹھ گئی تو مہرین نے اس کا دوپٹہ ٹھیک کیا۔ ساجدہ اِدھر ہی دیکھ رہی تھی۔ حوریہ کے بیٹھنے کے بعد عثمان نے بھرپور نظروں سے اس کا جائزہ لیا جس پہ آس پاس سے معنی خیز ہنسی کی آوازیں آنے لگیں مگر وہ عثمان ہی کیا جو پیچھے ہٹ جاتا۔ اس نے کمال جرأت سے اپنا مضبوط ہاتھ ایک لمحے کے لیے حوریہ کے نرم و نازک ہاتھ پہ رکھا تو اوئے اوئے کی گردان شروع ہو گئی۔

"بابا بیوی ہے میری، نکاح ہوا ہے ہمارا ابھی کچھ گھنٹے پہلے۔" وہ شوخ ہو رہا تھا۔ پارلر جانے سے پہلے ہی نکاح ہو چکا تھا۔ عثمان ہنس ہنس کر سب کے شریر فقروں کا جواب دے رہا تھا۔

حوریہ آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت سی ایک جگہ بیٹھی تھی۔

ساجدہ کی نظر اسٹیج پر ہی فوکس تھی، اور سب کی طرف سے وہ مایوس ہوئی تھی۔ پر جانے کیوں اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ حوریہ اسے مایوس نہیں کرے گی۔ عثمان کی وارفتہ نگاہیں بزبانِ خاموشی دل میں چھپے چاہت کے طوفان کا پتہ دے رہی تھی۔ یہ سیلِ رواں رکنے والا نہیں لگ رہا تھا۔

رخصتی سے کچھ دیر پہلے ہی آسمان کالے سیاہ بادلوں سے بھر گیا۔ تقریباً تمام لڑکیوں نے ہی ہاف سلیوز والی شرٹس پہنی تھیں سردی سے بچنا مشکل تھا۔ لہٰذا ایک ایک کر کے سب گاڑیوں میں بیٹھنے لگے۔ صدف اور ولید، صفورا بیگم کے ساتھ گئے جب کہ تیمور رخصتی کے وقت حوریہ کے ساتھ تھا۔

دونوں ایک گاڑی میں تھے۔ اس کا ایک بازو حوریہ کے کاندھے پر تھا جو رو رو کر بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ سالے کی موجودگی کے باعث عثمان خاموش تھا۔ ادھر بادل زوردار آواز سے گرج رہے تھے۔ اوائل نومبر کی ہواؤں میں سرکشی آ گئی تھی۔ بارش کی بوندیں سڑکوں پر جلترنگ بجانے لگی تھیں۔

"حوریہ! اب بس بھی کرو۔ میں اس سیلاب میں بہہ جاؤں گا۔" تیمور کا اشارہ اس کے آنسوؤں کی طرف تھا۔

جانے کون کون سی رسمیں ہوئی تھیں مگر اسے کچھ پتہ نہیں چلا تھا اگر خبر تھی تو یہ کہ اس کے حوصلوں کی دیوار اب گرنے کو ہے۔ ناشتے کے بعد سے لے کر اب تک اس نے کچھ نہیں کھایا تھا سب کے اصرار پر بریانی کے چند نوالے حلق سے زبردستی اتارے۔ ساجدہ نے کن جلتے

شعلوں میں اسے دھکیل دیا تھا۔

وہ کیسے اپنے ساتھ ہونے والے سانحے کے بارے میں سب کو بتائے۔ امی جو اسے بیاہ کر بے پناہ خوش تھیں۔ بھائی جو ذمہ داری نبھا کر مطمئن تھے۔ وہ کیسے ان کے اطمینان کو تہہ و بالا کرتی۔ اگر وہ کوئی خوش کن خواب دیکھ رہے تھے تو کیا وہ انہیں جگا کر حقیقت کی تلخ دنیا میں لے آتی؟ شاید نہیں کیونکہ اس کا خمیر خود غرضی سے نہیں اٹھا تھا۔

پھولوں سے مہکتے کمرے میں وہ اکیلی تھی۔ کچھ دیر قبل سب نے اس کی جان چھوڑ دی تھی۔ گلاس ونڈو سے باہر بارش کی قیامت خیزی صاف نظر آ رہی تھی۔ موتیوں کے شفاف قطرے شیشے سے پھسل رہے تھے پردہ جہاں تک ہٹا ہوا تھا وہاں تک باہر کا منظر نظر آ رہا تھا۔

"کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اپنے پسندیدہ موسم سے جی بھر کر لطف اندوز ہوتی۔ اسے بارش بہت پسند تھی۔ شادی کے پہلے تک وہ بڑی فرصت سے بیٹھ کر بوندوں کی جادوگری دیکھتی ولید تو اس کے اس استغراق اور محویت پر ہنستا جو بارش کو دیکھتے ہی اس پہ طاری ہو جاتی۔

خوبصورتی سے سجا ہوا کمرہ عثمان کی خوش ذوقی کا آئینہ دار تھا اس نے جونہی پاؤں بیڈ سے اتارے دروازے پہ آہٹ سی ہوئی۔ بھاری گلوبند اور جھمکے اتار کر اس نے ابھی ابھی رکھے تھے۔ وہ اس بھاری اور بوجھل سوٹ سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ مہرین بتا گئی تھی کہ اس کے دوسرے کپڑے ڈریسنگ روم میں ہیں وہ اسی طرف جانا چاہتی تھی کہ ہر قدموں کی آہٹ پر بت سی بن گئی۔

"السلام علیکم۔" عثمان کی خوشی سے بھرپور آواز عین اس کے کان کے قریب گونجی تو اس نے سر کو قدرے جھکا لیا۔

"بڑی ایمرجنسی میں دولہا بنا ہوں اوپر سے بارش نے سب کچھ چوپٹ کر دیا۔ میں کپڑے بدل کر فریش ہو کر آتا ہوں پھر آپ سے بات کرتا ہوں۔" اس نے وہیں کھڑے کھڑے کوٹ اتارا اور ایک بھرپور نگاہ حوریہ پر ڈالی۔ اس کے باہر آنے تک وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ ایک دل کش مہک عثمان کے ساتھ ساتھ اس کے پاس آئی۔

"آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ مما اور مہرین بتا رہی تھیں۔ ایسا کریں یہ دودھ کا گلاس پی لیں۔ پہلے ہی اتنی دھان پان سی ہیں۔ میں ابھی سب کے ساتھ کھانا کھا کے آ رہا ہوں۔ خود کو دیکھیں اور میری صحت دیکھیں۔" وہ تکیہ پیچھے رکھ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

حوریہ کی نگاہ بے اختیار اس کی طرف اٹھی۔ اس کا کسرتی جسم سفید ٹی شرٹ میں سے

بھی بخوبی اپنی مضبوطی ظاہر کر رہا تھا۔

"سوری، مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ نظر چرا گئی۔

"مگر مجھے تو ان آنکھوں، ان چہرے اور ایک ایک نقش کی دید کی پیاس تھی۔"

وہ اپنا سر اس کی گود میں رکھ کر لیٹ گیا۔

"کبھی خواہش تھی ان آنکھوں میں اپنے نام کا عکس دیکھوں۔" وہ حوریہ کی پلکوں پہ اپنی انگلی رکھتے ہوئے بولا تو اس کا دل دھڑک اٹھا۔

"جیولری کیوں اتار دی ہے۔" عثمان کا ہاتھ اس کی گردن پہ تھا۔

حوریہ نے جو چولی پہنی تھی اس کا گلا کافی گہرا تھا جب تک گلوبند پہنے رکھا تھا تب تک احساس نہیں ہوا تھا اب جب وہ اسے آنکھوں کے راستے دل میں اتار رہا تھا تو اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں سے اٹھ کے بھاگ جائے۔ "تمہاری گردن بڑی خوبصورت ہے اس کی نذر یہ حقیر سا نذرانہ۔" اسی پوزیشن میں نیم دراز عثمان نے ڈائمنڈ جڑا لاکٹ نکالا اور اب اسے پہنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دوران حوریہ کا چہرہ عثمان کی طرف جھک آیا۔ ایک قیامت کا سامنا تھا اسے۔ لاکٹ بند کرتے کرتے وہ قدرے اس کے نزدیک ہوا اور ایک شوخ سی جسارت کی۔ اپنی جسارت پہ وہ بڑا مطمئن لگ رہا تھا۔ حوریہ تڑپ کر تھوڑا دور ہوئی، مگر وہ اس کے ہاتھ پکڑ چکا تھا۔

"اب تو میرے پاس آگئی ہو خدا گواہ ہے میری خواہش تھی کہ کسی رم جھم برستی رات میں تم میرے ساتھ ہو۔ سب سے دور اور مجھ سے قریب بہت قریب اور دیکھ لو اس پر سحر رات میں تم میرے پاس ہو۔" وہ اس کی ہتھیلی اپنے ہونٹوں پر رکھ چکا تھا۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"اچھا چینج کر لو، تمہارا نائٹ ڈریس باتھ روم میں لٹکا ہوا ہے۔" خلاف توقع اس نے آرام سے حوریہ کے ہاتھ چھوڑ دیئے تو ایک ثانیے کو اسے یقین ہی نہیں آیا۔

صبح سے تھکی ہاری تھی سو گرم پانی سے شاور لینے کے بعد طبیعت قدرے فریش ہوگئی۔ سامنے ہی بے بی پنک کلر کی انتہائی نفیس اور باریک ریشمی نائٹی لٹکی ہوئی تھی۔ یہ نائٹ ڈریس پہن کر وہ عثمان کے پاس یا سامنے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا ایک سادہ سا ہلکا پھلکا کاٹن کا سوٹ پہن لیا۔ جو عثمان کی چھوٹی خالہ نے ایمرجنسی میں سیا تھا۔

اس نے جان بوجھ کر شاور لینے میں دیر لگائی پر باہر تو جانا ہی تھا کب تک باتھ روم میں رہتی۔ باتھ روم کا دروازہ کھلنے پہ روشنی کی لکیر باہر آئی تو عثمان نے آنکھوں پر رکھا بازو ہٹایا۔ نائٹ

بلب جل رہا تھا۔ کمرے میں بڑا خوابناک سا مدھم مدھم اجالا تھا۔

نائٹی کے بجائے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس گیلے بالوں کو دوپٹے سے چھپائے وہ بے حد متفکر اور ہراساں نظر آ رہی تھی۔ عثمان کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی کپڑوں کی الماری کی طرف گئی۔ الماری کھول کے جائے نماز نکال کر بچھائی اور نماز کی نیت باندھ لی کچھ دیر کے لیے اس کا دل پرسکون ہو چکا تھا۔ پورے خلوص اور حسیات کو متوجہ رکھ کر دعا کرتے ہوئے بار بار اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ عثمان اسے یک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔

دعا مانگنے کے بعد بھی وہ کچھ دیر وہیں بیٹھی رہی۔ عثمان بے چین ہونے لگا تھا۔

یکدم بادل بڑی زور سے گرجے۔ وہ ڈر کے مارے اچھل ہی تو پڑی۔ پھر مصلے کو چیئر پر رکھتے ہوئے سیدھی بیڈ کے کنارے پر آکے بیٹھ گئی۔

"حوریہ! لیٹ جاؤ تھکی ہوئی اور ڈسٹرب لگ رہی ہو۔" عثمان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ کھسک کر ذرا دور ہوئی۔ "پلیز سو جاؤ میں خود تھکا ہوا ہوں، سونا چاہتا ہوں۔" پھر سچ مچ وہ جہازی سائز بیڈ کے دوسری طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔ بڑی دیر بعد حوریہ کو اس کے الفاظ کا یقین آیا تو وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔

"ہم کس منہ سے حوریہ کے گھر والوں کا سامنا کریں گے۔" امینہ بہت شرمسار نظر آ رہی تھی۔ یہی حال ان کے شوہر کا تھا۔ مصطفیٰ نے ہمیں کہیں بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ حالانکہ یہ رشتہ اس کی اپنی پسند پہ ہوا تھا تب بھی اس نے کیسی جلدی مچائی تھی اب ہم ان شریف لوگوں سے کیا کہیں گے، میں کس طرح معافی مانگنے جاؤں؟ یہ بات مجھے اور بھی ہرٹ کر رہی ہے کہ ان لوگوں نے ہمیں برا بھلا تک نہیں کہا کچھ کہہ دیتے تو بوجھ ہلکا ہو جاتا۔" یہ مصطفیٰ کے والد تھے۔

"یاد آیا ان کے پڑوس میں جو پیاری سی لڑکی ساجدہ رہتی ہے اس نے فون کیا تو بتایا کہ حوریہ کی تو شادی بھی ہو گئی ہے۔ اسی وجہ سے میرا احساسِ جرم کچھ کم ہوا ہے۔" امینہ بیگم نے یہ نئی بات بتائی تھی۔

ثناء اور زارا کو بھی بھائی کے اس اقدام سے بہت دکھ پہنچا تھا اسی وجہ سے ثناء اور سلیمان کی منگنی کا پروگرام بھی التواء کا شکار ہو گیا تھا۔ مصطفیٰ کسی کو کچھ بتائے بغیر جانے کہاں چلا

گیا تھا۔ سلیمان کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس کا دوست ایسا کر سکتا ہے۔

اور وہ یہاں سب کو پریشانی کے حوالے کر کے خود لاہور میں بیٹھا تھا۔ اسے پتہ تھا اس کے انکار پہ کیسا ہنگامہ ہوگا۔ اس لیے وہ یہاں آ گیا تھا۔

اس کا فون آیا تو امینہ بیگم کی جان میں جان آئی۔

کچھ بھی سہی مصطفیٰ ان کا لاڈلا اکلوتا بیٹا تھا جو کچھ بھی کیا تھا وقتی طور پر برا لگا تھا پھر وہ ایک لڑکی کی خاطر ہمیشہ کے لیے اسے قطع تعلق تو نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے اپنے شوہر کو بھی رام کر ہی لیا۔

❁

حوریہ کے میکے سے اس کی کزنز ناشتہ لے کر آئی تھیں۔ اس کی امی دس پندرہ منٹ کے بعد تیمور کے ساتھ چلی گئیں کیونکہ صدف نے رسم کے مطابق آج میکے آنا تھا۔ پھر حوریہ اور عثمان کا ولیمہ بھی تھا، انہیں اپنے کام بھی نمٹانے تھے۔ حوریہ سے ملنے کے بعد صفورا بیگم مطمئن تھیں۔

ساجدہ بھی حوریہ کی کزنز کے ساتھ آئی تھی۔ ان سب کے دھاوا بولنے سے پہلے ہی عثمان اٹھ چکا تھا۔ حوریہ بعد میں بیدار ہوئی پھر بھی اسکی آنکھیں سرخ سرخ سی تھیں سر میں الگ درد ہو رہا تھا۔ ساجدہ نے بڑی گہری نگاہ سے اسے دیکھا کہ شاید رات کی کوئی تحریر نظر آ جائے مگر اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور وہ ان سب کی فقرہ بازی سے جبراً مسکرا رہی تھی۔

عثمان بہت مسرور سا فریش لگ رہا تھا۔ اسکے وجیہہ چہرے پہ خوشیوں کا عکس جھلملاتا محسوس کیا جا سکتا تھا۔ حسد کی ایک لہر ساجدہ کو شرابور کر گئی۔ اس کا خیال تھا کہ حوریہ نے اسکی باتوں پہ کان نہیں دھرے تھے۔

ناشتے کے بعد برتن اٹھا لیے گئے تو عثمان ان سب کی طرف متوجہ ہوا۔

''حوریہ! آپ آرام کریں، ہم سب باہر جا رہے ہیں۔ آپ پلیز میرے ساتھ آیئے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں انہیں نیند پوری کرنے دیں۔'' وہ لڑکیوں سے بیک وقت مخاطب تھا۔

''اوہو ایک ہی رات میں اتنی فکر۔'' کسی نے شرارت سے کہا تھا۔

''فکر کیوں نہ ہو میری شریکِ حیات ہیں۔'' اس کے اس طرح کہنے پہ ساجدہ نے اسے بڑی عجیب نگاہ سے دیکھا۔

حوریہ کو واقعی نیند آ رہی تھی۔ سردی الگ محسوس ہو رہی تھی کیونکہ آسمان ابھی تک

بادلوں کی لپیٹ میں تھا۔ عثمان کے اس رویے کے بارے میں سوچنے کے لیے فی الحال اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ کمبل سر سے پاؤں تک تان کے وہ دوبارہ لیٹ گئی۔

ولیمہ رات کو تھا۔ صدف نے شام کو آنا تھا۔

عثمان کافی دیر چنچل لڑکیوں کے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔ ساجدہ نے کرید کرید کر اس سے اس کی تعلیم، دوستوں، خاندان، پسند و ناپسند کے بارے میں پوچھا۔ پہلی بار ہی اس لڑکی کی اس قدر بے تکلفی اسے بالکل نہیں بھائی پھر اس کی شخصیت میں جو ایک عجیب سی سرکشی دبی دبی سی تھی اس نے بھی عثمان کو خاصا حیران کیا۔

''حوریہ کا بہت زیادہ خیال رکھیے گا کیونکہ پہلی محبت کو بھلانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔''

واپس جاتے جاتے جب مونا، زنیرا اور ثومیہ گاڑی میں بیٹھ گئیں تو وہ آہستگی سے بولی۔ وہ قصداً سب سے پیچھے تھی۔ اس کا یہ نصیحت آمیز جملہ یا مشورہ صرف عثمان نے ہی سنا تھا۔ ساجدہ نے تاک کر وار کیا تھا۔ عثمان الجھ کر رہ گیا۔

یہ تو اسے پتہ تھا کہ حوریہ کی منگنی لڑکے والوں کی خالصتاً پسند پہ ہوئی تھی اور لڑکے کی طرف سے بہت جلدی کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ صدف نے اسے ایک ایک بات بتائی تھی۔

اب وہ دوسرے رخ سے بھی سوچ رہا تھا۔ حوریہ بھی تو اپنے منگیتر کو چاہتی ہوگی بے شک منگنی کم عرصہ رہی ہے پر لڑکیاں بہت جلدی خوابوں کے محل تعمیر کر لیتی ہیں۔

''شاید رات کو یہ اس لیے رو رہی تھی کہ اس کے منگیتر کی جگہ میں کہاں سے آ گیا ہوں۔ نماز پڑھنے میں بھی اتنی دیر لگی پھر برستی آنکھوں سے دعا مانگی جب میں نے کہا سو جاؤ تو فوراً اطمینان کی سانس لی یہ مزے سے سو گئی اس نے خواب تو اپنے منگیتر کے حوالے سے دیکھے ہوں گے ان کی جگہ مجھے دیکھ کر ٹھیس تو لگنا ہی چاہیے تھی۔

حالانکہ میں نے کتنی دعاؤں کے بعد اسے پایا ہے۔ اسے میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے ان کے خاندان کی عزت رکھ لی ہے، اور شاید اس نے بھی خاندان کے دباؤ میں آ کر بھائیوں کی عزت رکھنے کے لیے مجھ سے شادی کا کڑوا گھونٹ پی لیا ہے۔ کتنی منافق ہوتی ہیں یہ لڑکیاں دل میں کچھ اور ظاہر میں کچھ اور، میں نے حوریہ سے محبت ضرور کی ہے پر اپنی انا اور مردانگی کا سودا نہیں کیا، اگر یہ میرے ساتھ خوش نہیں تو میں بھی زبردستی نہیں کروں گا۔''

وہ خود سے مضبوط عہد کر چکا تھا۔ ساجدہ کے اس ایک جملے نے کیسی قیامت ڈھائی تھی

کہ عثمان کے ارمانوں بھرے دل کو کرچی کرچی کر دیا تھا۔

حوریہ کل سے بڑھ کر آج حسین لگ رہی تھی۔ تیمور نے ہر ہر زاویے سے اس کی ڈھیروں تصویریں بنائیں۔ صدف بھی میکے آنے کے بعد پھر حوریہ کے ساتھ ہال میں اکٹھے آئی تھی۔ کھانے کا اعلان ہوا تو حوریہ کے پاس صرف چند ہی لڑکیاں رہ گئیں۔ صدف اور حوریہ کے لیے کھانا ادھر ہی بھجوا دیا گیا۔

"حوریہ! یہ تمہاری پڑوسن ساجدہ مجھے عجیب سی لگی ہے۔" صدف پلیٹ میں بریانی ڈالتے ہوئے بولی۔

"کیوں بھابھی! ساجدہ بھابھی تو بہت اچھی ہیں۔ ابو کی وفات پہ انہوں نے جس طرح امی کا خیال رکھا اور پورے گھر کو سنبھالا وہ قابلِ تعریف ہے پھر میری اور ولید بھائی کی شادی کے سو بکھیڑے تھے انہوں نے احسن طریقے سے ذمہ داری نبھائی ہے۔" حوریہ اس کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔

"اچھا، ولید بتا رہا تھا کہ اس کا شوہر عمر میں اس سے کافی بڑا ہے۔"

نند کے تیور دیکھ کر صدف بات بدل گئی۔ شروع میں ہی سسرال سے تعلقات میں بگاڑ آنے سے وہ ڈرتی تھی۔ شادی کو گنے چنے دن ہوئے تھے پھر ساجدہ نام کی اس لڑکی کی نگاہیں تیور اور بات کرنے کا انداز بڑا مختلف سا تھا۔ خاص طور پر اس کی نظریں جن سے صدف نے حسد جھلکتا محسوس کیا تھا۔

ایک دن جب وہ اور ولید اکٹھے بیٹھے تھے اور اس کی ساس نے ناشتہ ساجدہ کے ہاتھ بھجوایا تو ولید کا دل شرارت پہ آمادہ تھا۔ وہ دروازہ ناک کیے بغیر اندر آئی تھی، دونوں خاصے قریب تھے صدف کو بہت غصہ آیا۔ اس نے شکوہ کناں ناراض نگاہیں اٹھائیں تو حیرت انگیز منظر دیکھا۔

ساجدہ، ولید کی طرف جن نگاہوں سے دیکھ رہی تھی ان میں شعلوں کی لپک محسوس ہو رہی تھی۔ صدف کو اس کی غصے وحسد سے ابلتی نظریں بھلائے نہیں بھول رہی تھیں۔

آج حوریہ کا دفاعی انداز دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ ساجدہ کا اس کے سسرال میں کافی عمل دخل ہے۔ اس نے بھی مزید بات نہ کی اور خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔

ولیمے کے فنکشن سے واپس آنے کے بعد سب ہی تھک چکے تھے۔ عثمان کا دل کافی پینے کو چاہ رہا تھا۔ سب ٹی وی لاؤنج میں جمع تھے۔ مہرین کچن میں آ گئی، کیونکہ عثمان کے ساتھ ساتھ اور سب بھی کافی مانگ رہے تھے۔

حوریہ بھی انہی کپڑوں میں ملبوس گھر والوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کی ساس نگینہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ عثمان ان کی گود میں سر رکھ کر دراز ہو گیا۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

"مما! بہت تھک گیا ہوں۔"

"بیٹا! شادی کے ہنگاموں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" انہوں نے عثمان کا ماتھا چوما۔ باقی سب اسے لاڈ اٹھواتے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

"مما! مجھے سلا دیں بہت تھک گیا ہوں" اس کے لہجے میں تھکن رچی ہوئی تھی۔ نگینہ کے دل کو کچھ ہوا۔

"اب تمہارے ناز اٹھانے والی آ گئی ہے۔ یہ نخرے اسی کو دکھاؤ۔" ان کا اشارہ حوریہ کی طرف تھا۔ وہ جوان دونوں کو دیکھ رہی تھی...... نظریں چرا گئی۔

کافی پینے کے بعد مہرین اسے کمرے میں چھوڑ گئی۔ کپڑے بدلنے کے بعد ذہن و دل ذرا آرام دہ حالت میں آ گئے تو وہ سوچنے کے قابل ہوئی۔

"آج تیمور، ولید، صدف بھابھی اور امی کتنی خوش لگ رہی تھیں، کیا ہوا اگر عثمان عیاش اور بدکردار ہے۔ قسمت نے اسے میری زندگی کا مالک بنا دیا ہے، پھر مالک جو سلوک بھی روا رکھے غلام کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے میں اس کڑوے گھونٹ کو پی لوں گی۔ ایسا نہ ہو میرے رویے سے بات کھل جائے تب اگر عثمان نے بھی مجھے چھوڑ دیا تو میری ماں تو جیتے جی مر جائے گی۔ بھائی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

میں دوبارہ ان کو سب کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دوں گی۔ ہارنا تو ازل سے عورت کے مقدر میں لکھا ہے، میرا دل تو ویسے بھی مر چکا ہے۔ عثمان اس بے روح وجود پہ ہی قبضہ جما سکے گا۔ دل تک کبھی نہ آ سکے گا اسے کون سا میری پروا ہو گی۔ میں مر جاؤں گی، مٹ جاؤں گی پر بھائیوں کی عزت پہ حرف نہیں آنے دوں گی۔

یہ تو ساجدہ بھابھی کی مہربانی ہے جو انہوں نے مجھے اس راز سے آگاہ کر دیا میں کوشش

کروں گی کہ اس کا دل جیت سکوں تاکہ وہ اب کسی اور عورت کی طرف نہ دیکھے۔" وہ خود سے عہد کر رہی تھی۔

عثمان نے کمرے میں آ کر شاور لینے کے بعد کپڑے بدلے۔

اب بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے حسب عادت تولیہ صوفے پہ پھینک کر حوریہ کی طرف مڑا تو جسم میں دوڑتے لہو کی گردش اور بھی تیز ہو گئی۔

پنک کلر کی اسی نائٹی میں ملبوس حوریہ بیڈ پر نیم دراز اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔

"فکر نہ کرو جب تک تمہارے دل کا حال مجھے سچ سچ پتہ نہیں چل جاتا میں تمہیں چھوؤں گا نہیں۔ کل تم نے یہ ڈریس نہیں پہنا آج غالباً کسی نے سمجھایا ہوگا تو تم نے دل پہ جبر کر کے یہ پہنا ہوگا تاکہ مجھے شک نہ ہو کہ تمہارے دل میں ابھی تک تمہارا منگیتر بسا ہوا ہے۔" اس کا دماغ اپنے انداز میں تجزیہ کر رہا تھا۔

عثمان دوسرا تکیہ اٹھا کر حوریہ سے قدرے فاصلے پر لیٹ گیا تو اس کا دل خدشے سے بھر گیا۔

"آپ کے اپنے پڑوسیوں سے کیسے تعلقات ہیں؟" وہ بڑے ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

اس دوران اس کی پوری کوشش تھی کہ اس کی نظر حوریہ پہ نہ ہی پڑے تو اچھا ہے (کل تک تو یہ بڑا بے چین لگ رہا تھا اب پڑوسیوں کی پڑ گئی ہے)

"جی اچھے ہی تعلقات ہیں۔" وہ بڑے سبھاؤ سے بولی۔

"میرا مطلب ہے آپ کی جو پڑوسن ساجدہ ہیں ان کے ساتھ آپ کے کیسے تعلقات ہیں؟" صبح صدف بھابھی نے اس حوالے سے بات کی تھی اور اب وہ اس حوالے سے پوچھ رہا تھا۔

"کہیں اسے پتہ تو نہیں چل گیا کہ ساجدہ نے اس کے کرتوتوں کے بارے میں مجھے بتا دیا ہے۔" اس نے سوچا تھا۔

"جی اچھے ہی ہیں۔ ساجدہ بھابھی بہت محبت کرنے والی ہیں۔ امی تو انہیں بہت پسند کرتی ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ان کا عمل دخل بھی ہوگا آپ کے گھر میں۔"

"جی ہاں، امی کوئی بات ان سے چھپاتی نہیں ہیں، ہر معاملے میں مشورہ کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ میری شادی کی شاپنگ میں بھی ان کی رائے شامل تھی۔"

"ہوں۔" وہ پُرسوچ نگاہیں غیر مرئی نکتے پر جمائے ہوئے تھا۔

"اچھا شادی کے بارے میں نکاح کے بارے میں، آپ کی کیا رائے ہے؟"

"ظاہر ہے دو انسانوں کے مابین زندگی گزارنے کا ایک معاہدہ ہے۔" وہ اس سوال پر الجھ گئی۔

"اور میرا خیال ہے کہ اس رشتے کی بنیاد ایمانداری اور اعتماد پہ ہونی چاہیے، دل میں کچھ اور ہو تو یہ رشتہ کمزور پڑ جاتا ہے۔"

"اب یہ بھی اپنے کرتوتوں کے بارے میں بتائے گا شاید۔" سوچتے ہوئے وہ اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔

"یوں کریں یہ کپڑے چینج کر کے سو جائیں، فی الحال اس گھر میں آپ کو کسی قسم کی فکر نہیں ہونی چاہیے۔" وہ منہ دوسری طرف گھما چکا تھا۔

اس کے سرد لہجے نے حوریہ کو بے چین کر دیا۔ وہ خود کون سا یہ کپڑے پہن کر سونے کے لیے مری جا رہی تھی بلکہ جتنی ہمت اور حوصلہ جمع کر کے اس نے یہ حشر ساماں لباس پہنا تھا یہ اسے ہی پتا تھا۔ وہ آہستگی سے بیڈ سے اتری۔

عثمان کے سرد رویے پر وہ پریشان سی تھی۔ کل کے مقابلے میں آج کلی طور پہ اس کا انداز بدلا ہوا تھا۔

۞

پروا کو بالکل غیر متوقع طور پر دیکھ کر تیمور کو بے پناہ خوشی ہوئی۔ وہ عرفان کے ساتھ یونیورسٹی آیا تھا۔ عرفان کے بہنوئی یہاں لیکچرار تھے۔ اسے ان سے کام تھا۔ تیمور کے ساتھ یہاں سے گزرتے ہوئے عرفان کو اپنا کام یاد آیا تو وہ اسے لیے سیدھا ادھر آ گیا۔

عرفان تو اپنے بہنوئی کے ساتھ مصروف تھا وہ اسے چھوڑ کر باہر گراؤنڈ میں آ گیا جہاں بے فکرے اسٹوڈنٹ دھوپ کا لطف اٹھا رہے تھے۔ تب ہی ایک گوشے میں بیٹھی پروا پہ اس کی نظر پڑی تو دل و نگاہ اپنے اختیار میں ہی نہ رہے۔ مصطفیٰ کے گھر ملنے والی اس حسینہ نے دل کا سکون ہی لوٹ لیا تھا۔

حوریہ والی ٹریجڈی ہونے سے پہلے اسے بڑی شدت سے اس کا انتظار تھا کیونکہ مصطفیٰ کے گھر سے مہندی لاتے وقت اس نے بھی آنا ہی تھا۔ آخر کو زارا بیسٹ فرینڈ تھی۔ مصطفیٰ کے اس اقدام کی وجہ سے اس کا دل افسردہ تھا۔ سو پروا کے بارے میں کوئی سوچ ذہن میں آئی ہی

نہیں۔ ہاں اب جب حوریہ اپنے گھر کی ہو چکی تھی تو وہ پرسکون تھا۔

رات کی تنہائی میں اکثر وہ پروا کے بارے میں سوچتا تھا۔ ''ہیلو، کیسی ہیں آپ؟'' اپنائیت بھرے انداز میں اس نے اس کی خیریت پوچھی۔

پروا اسے پہچان گئی ساتھ یہ بھی یاد آ گیا کہ وہ حوریہ کا بھائی ہے۔ زارا کی نہ ہونے والی بھابھی کا بھائی۔ اس حوالے سے اسے تجسس سا تھا کہ اس بدقسمت لڑکی پہ کیا گزری ہوگی۔ زارا نے کبھی اس موضوع پر بات کی ہی نہیں۔ قسمت سے آج حوریہ کا بھائی سامنے آ گیا تھا۔

آج زارا بھی نہیں آئی تھی اور ویسے بھی اکیلی بور ہو رہی تھی۔ ''آپ کیسے ہیں میں ٹھیک ہوں۔'' وہ رسمی انداز میں بولی پھر تیمور نے بہت جلد تکلف کی تمام دیواریں گرا دیں۔ اپنے دلچسپ ہنسوڑ انداز کی وجہ سے اس کا دوسرا تاثر پہلے کے مقابلے میں اچھا تھا۔ پروا نے خاص طور پر اس سے اس کی بہن کے بارے میں پوچھا۔

''اس کی شادی ہو گئی ہے بہت اچھے شخص کے ساتھ، میرے بہنوئی آرمی میں ہیں بہت نائس اور نفیس شخصیت کے مالک۔ حوریہ کی طرف سے اب ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ جس ہمدردی کے ساتھ آپ نے میری بہن کے بارے میں پوچھا اس سے آپ کی اچھی فطرت کا اندازہ ہو رہا ہے، ورنہ مصطفیٰ بھائی کی فیملی میں سے تو آج تک کسی نے پلٹ کر نہیں پوچھا۔ ویسے جو بھی ہوا اچھا ہوا، میری بہن کو قدر دان لوگ ملے ہیں۔ وہ اگر کہیں آپ سے ملی تو بہت خوش ہوگی۔ میں آپ کے بارے میں اسے ضرور بتاؤں گا کبھی ملواؤں گا بھی، ملیں گی ناں حوریہ سے۔''

''ہاں کیوں نہیں۔'' وہ بے سوچے سمجھے بولی تو تیمور نہال ہو گیا۔

وہ پندرہ بیس منٹ میں اس سے بہت کچھ پوچھ چکا تھا۔ اس کے ماں باپ کے بارے میں پوچھے گئے سوال پہ جب اچانک پروا کی آنکھ میں نمی تیرنے لگی تو تیمور بے چین ہو گیا۔

''سوری میں نے آپ کو دکھی کر دیا ہے، لیکن میرا وعدہ ہے کہ اب آپ کا یہ دوست آپ کو رونے نہیں دے گا۔ ساری زندگی ہنساتا رہے گا۔ اس دوست کی دوستی آپ کو قبول ہے؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو اپنا سیل نمبر مجھے دے دیں۔'' خلوص سے تیمور کے لہجے میں سچائی تھی۔

جب وہ وہاں سے اٹھا تو تیمور اس سے اس کا نمبر اور گھر کا ایڈریس معلوم کر چکا تھا۔ وہ اسے اپنے گھر آنے کا اور حوریہ سے ملنے کا وعدہ بھی لے چکا تھا۔

آج وہ بہت مسرور تھا۔ پروا نے اسے اپنے نمبر اور گھر کے ایڈریس کے بارے میں بتا

دیا تھا اس کا مطلب تھا کہ اس کے سچے جذبوں نے اپنا آپ منوا لیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دوسری ہی ملاقات میں وہ اس پہ ہرگز اعتبار نہ کرتی۔ سیٹی کی دھن پہ شوخ سا نغمہ گنگناتے ہوئے اس کی خوشی کو عرفان نے بھی محسوس کر لیا۔

''یونیورسٹی میں آ کے تمہاری طبیعت کافی بہل گئی ہے، ورنہ صبح جب میں نے تمہیں فون کیا کہ ایک ضروری کام سے جانا ہے تو تم نے بہانہ کیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ یہاں آ کے تمہاری طبیعت بہل جائے گی تو میں پہلے ہی ادھر لے آتا۔'' عرفان اس پر طنز کر رہا تھا۔

''اچھا یار! ایسے ہی سہی۔ اتنے خوبصورت چہرے تھے، طبیعت ٹھیک کیسے نہ ہوتی۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

''میرا خیال ہے کہ چند دن پہلے کی ہی بات ہے جب آپ رات دن پروا نامی حسینہ کے لیے آہیں بھر رہے تھے۔ اب یہ تبدیلی کیا معنی رکھتی ہے۔'' عرفان نے اسے لتاڑا تو وہ ہنسنے لگا۔

''یار، وہی تو آج یونیورسٹی میں ملی ہے بے مانگی دعا کی طرح۔'' وہ اسے ملاقات کی تفصیل بتانے لگا۔

سلیمان ہاسپٹل میں تھا۔ یہ دو دن پہلے کی بات تھی۔ وہ معمول کے مطابق اپنے آفس گیا۔ ڈی آئی جی نے ہنگامی میٹنگ بلوائی تو دوسرے افسران کے ساتھ سلیمان ان کے آفس چلا گیا۔ میٹنگ کے خاتمے پہ سب سے آخر میں اٹھنے والا وہی تھا۔ وہ گاڑی کا لاک کھول رہا تھا جب اسے اپنے دائیں پہلو میں انگارہ سا اترتا محسوس ہوا یکے بعد دیگرے دو اور انگارے اس کے بازو میں اترے دروازہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ سڑک پر منہ کے بل گر گیا۔ حملہ آور اپنا کام کر کے بجلی کی تیزی سے فرار ہو گئے۔

فائر کی آواز سن کر جو لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے سلیمان کو ہاسپٹل پہنچایا۔ گھر اطلاع پہنچی تو غم و صدمے سے ثمینہ بیگم کی حالت غیر ہو گئی۔

ان کا جوان و خوبرو بیٹا بے بس و لاچار ہاسپٹل میں پڑا تھا، جانے کون شقی القلب تھا جس نے ان کے گھر کا چراغ بجھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

پروا دل ہی دل میں اسکی سلامتی کے لیے دعا گو تھی۔ سب گھر والے ہاسپٹل میں

تھے۔ ثمینہ بیگم نے اسے گھر پہ رہنے کی ہدایت کی تھی، حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی سلیمان کو دیکھنے جائے۔

اس حادثے پر جب ثمینہ بیگم کے ساتھ اس کے بھی بے اختیار آنسو بہہ نکلے تو ثمینہ دل ہی دل میں کچھ سوچنے پہ مجبور ہو گئی تھیں۔ بھلا اسے سلیمان سے کیا لگاؤ ہے جو وہ اس کے لیے یوں رو رہی ہے، وہ یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھیں کہ انسانیت کے رشتے سے بھی پروا، سلیمان کے لیے رو سکتی ہے۔ دعا کر سکتی ہے۔

خولہ اپنے دونوں بچوں کو اس کے پاس چھوڑ کر بھائی کے پاس پہنچ گئی۔ ڈاکٹرز نے آپریشن کر کے گولیاں نکال دی تھیں۔ اب وہ خطرے سے باہر تھا۔

رات کو ثمینہ بیگم ضد کر کے بیٹے کے پاس رکیں حالانکہ سلمان سمیت سب نے ہی سمجھایا تھا مگر وہ نہ مانیں۔

تینوں وقت ناشتہ کھانا گھر سے تیار ہو کر جاتا۔ پروا پہ ذمہ داری بڑھ گئی تھی۔ یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ خولہ آپی کے دونوں بچوں کی دیکھ بھال، مہمانوں کو کمپنی دینے کی اضافی ذمہ داری بھی ان دنوں اس کے سر آ گئی تھی۔

گھر میں ملازم تھے مگر انہیں بھی ایک ایک کام بتانا پڑتا۔ نائلہ لاڈلی تھی پھر طاہرہ اسے کسی کام کو ہاتھ لگانے بھی نہ دیتی تھیں۔ ہاں پروا چونکہ بے گھر بے سہارا لڑکی کے روپ میں سامنے آئی تھی اس لیے اکثر و بیشتر وہ اسے کسی نہ کسی کام کا کہتی رہتیں۔

طاہرہ اور نائلہ آج گھر پر تھیں۔ زارا اور شاہ دونوں نے سلیمان کی عیادت کا پروگرام بنایا تھا۔ طاہرہ بیگم نے عین وقت پر پروا کو روک دیا۔

"تم جا کر کیا کرو گی، گھر میں بھی تو کسی کا موجود ہونا ضروری ہے۔" اپنی طرف سے انہوں نے مضبوط دلیل دی۔ "ویسے بھی سلیمان کے ساتھ تمہارا رشتہ ہی کیا ہے۔ لوگ باتیں بنائیں گے جو میں نہیں چاہتی کیونکہ تمہیں بھی پتہ ہے کہ میں شاہ کو ہی بہو بناؤں گی۔ تم جوان ہو خوب صورت ہو کسی کو بھی غلط فہمی ہو سکتی ہے پھر میرے سلیمان کا عہدہ، شخصیت، خاندان کچھ بھی تو نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ میں کسی اسکینڈل کی متحمل نہیں ہو سکتی خاندانی لوگ ہیں ہم بہت ساری باتوں کو سوچنا پڑتا ہے۔" انہوں نے در پردہ اسے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔

لاکھ ضبط کی کوشش کے باوجود پروا کو رونا آ گیا حالانکہ وہ عہد کر چکی تھی کہ ان سمیت کسی

کی بھی بات کو دل پہ نہیں لے گی، مگر طاہرہ بیگم کو جانے کیوں اس سے خدا واسطے کا بیر ہو چلا تھا۔

پروا چپ چپ سی تھی۔ زارا کافی دیر سے اس کی خاموشی نوٹ کر رہی تھی پھر تنگ آ کر بول ہی پڑی۔

"کیا بات ہے، شکل مبارک پہ بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں۔"

"بس ایسے ہی۔"

"میں نوٹ کر رہی ہوں کچھ دنوں سے بہت پریشان ہو۔ میں نے کل طاہرہ آنٹی کا رویہ تمہارے ساتھ دیکھا ہے۔ سچ بتاؤ پروا! مجھے ان کی باتیں اچھی نہیں لگی ہیں۔ تم امیر ہو، صاحبِ جائیداد ہو تمہارے بابا سائیں کتنے بڑے بزنس مین تھے پھر بھی وہ تمہارے ساتھ اتنا روڈلی بات کر رہی تھیں اچھا وہ تمہارا گھر آئی ایٹ والا اس کا کیا ہوا۔ کرائے پہ دے دیا ہے یا بند پڑا ہے۔" زارا نے ایک ہی سانس میں ڈھیروں سوال کر ڈالے۔ پروا نے اس کے لبوں پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"آئندہ کسی اور کے سامنے یہ مت کہنا کیونکہ سلیمان نے مجھے منع کر دیا تھا اور گھر بند پڑا ہے۔" زارا کے ذہن میں اس کا جملہ اٹک گیا۔

"تمہارا گھر اتنا خوبصورت اور ویل ڈیکوریٹڈ ہے وہاں چلی جاؤ نا۔"

"وہاں سے ہی تو آئی تھی۔" وہ دل گرفتگی سے بولی۔ "کس کے ساتھ وہاں رہوں۔ مجھے اب تنہائیوں سے ڈر لگنے لگا ہے اچھا چھوڑو یہ بات، مصطفیٰ بھائی کا کیا بنا؟" پروا نے موضوع تبدیل کر دیا۔

"بننا کیا ہے۔ ان کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہے ہیں۔" وہ تلخی سے بولی۔

"ویسے مائنڈ نہ کرنا حوریہ بہت اچھی لگی تھی مجھے۔ ارے یاد آیا اس کا بھائی تیمور مجھے ملا تھا یہیں پہ۔"

"ہائیں کب کی بات ہے۔" زارا کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔ پروا اسے تفصیل بتانے لگی۔

"کل سے اس کا فون بھی آ رہا ہے رات کو بات کی تھی میں نے۔"

"ویسے اچھا لڑکا ہے تیمور، زندہ دل اور ہنسوڑ میری مانو تو شادی کر ڈالو۔" لگے ہاتھوں زارا نے مشورہ دیا تو پروا کو غصہ آ گیا۔

"سوچ سمجھ کر بولا کرو۔"

"یار! میرا وہ مطلب نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔ کہنے کا مطلب ہے کوئی اچھا سا بندہ ملے تو شادی کر لو اور اپنے گھر میں رہو مالکوں کی طرح، مجھے تو کل سے سوچ سوچ کر دکھ سا ہو رہا ہے طاہرہ آنٹی کی سوچ پہ۔ حوریہ بھابھی کی ساری فیملی ہی اچھی ہے۔ سنا ہے کہ ان کی شادی ہوگئی ہے۔" زارا ابھی تک اسے سابقہ تعلق کے حوالے سے مخاطب کر رہی تھی۔

"ہاں تیمور بتا رہا تھا کہ اس کی شادی کسی آرمی آفیسر سے ہوگئی ہے اور وہ اپنے گھر میں خوش ہے۔"

"چلو خوش ہی رہیں وہ بھی، ہم نے بھی ایک لڑکی دیکھی ہے نیلم نام ہے اس کا، بہت ماڈرن اور اسمارٹ ہے ہمیں تو پسند آئی ہے، مصطفیٰ بھائی کو دکھانے کا مرحلہ رہتا ہے اما کہہ رہی تھی بھائی اوکے کریں تو شاہ آپی کی شادی بھی ان کے ساتھ ہی کر دیں۔ منگنی بھی بھائی والے معاملے کی وجہ سے ٹل گئی تھی۔" پروا کے دل کو دھکا سا لگا۔

وہ دونوں باتیں کر ہی رہی تھیں کہ پروا کا سیل فون بجنا شروع ہوگیا۔ تیمور کی کال تھی۔

"میرے ساتھ آج کھانا کھانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"خیال تو نیک ہے پر افسوس اس پہ عمل درآمد فی الحال ناممکن ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔

"کیوں جناب؟"

"اس لیے کہ میں بزی ہوں میری برتھ ڈے آ رہی ہے۔ اسی خوشی میں میں کھانا کھلا دوں گی۔"

"رئیلی!"

"ہاں بالکل سچ۔"

"تم کتنی سخی ہو مائی سویٹ فرینڈ۔"

"بس بس مکھن نہ لگاؤ۔ مجھے پتہ ہے میں کتنی سویٹ ہوں تیمور کے بچے۔"

"یہ تیمور کے بچے کہاں سے آ گئے؟ وہ بے چارا خود ابھی بچہ ہے۔" پروا ہنسی تو ہنستی چلی گئی۔

زارا اس دوران اس کے طرز تخاطب اور چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھتی رہی۔ تیمور کے فون نے جیسے اس کی ساری کلفت دھو ڈالی تھی۔ اس کی آواز کھنک رہی تھی۔

"اے اللہ میری دوست کو ہمیشہ اسی طرح خوش رکھنا۔" زارا کے دل سے دعا نکلی تھی۔

تیمور بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اس نے پروا کو فون کر کے ابھی آنے کو کہا تھا۔ پروا، زارا کے ساتھ آئی تھی۔ اس نے زارا کو تیمور کے بلاوے کا نہیں بتایا تھا ورنہ شاید پروا کے ساتھ نہ آتی۔ کیونکہ حوریہ والے واقعے کے بعد اسے ان میں سے کسی کا بھی سامنا کرنا بہت مشکل لگتا تھا۔

ان دونوں کے آنے پہ تیمور نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ زارا نے بڑی دقت سے تیمور سے خیر خیریت پوچھی، جواباً وہ بڑے نارمل انداز میں بولا تو زارا کی ہچکچاہٹ بھی ختم ہوگئی۔ ایک ایک کر کے اس نے پھر سب کے بارے میں دریافت کیا۔

"تیمور! سب کی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں۔ مصطفیٰ بھائی کے اس اقدام کی وجہ سے ہم چاہتے ہوئے بھی تمہارا سامنا نہیں کر سکتے۔" زارا کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"کم آن زارا! کیا بات کرتی ہو ہم سب بھول گئے ہیں پھر حوریہ کا شوہر بہت اچھا ہے۔ مصطفیٰ بھائی سے لاکھ گنا اچھا۔ جانے کس نیکی کا انعام ہیں عثمان بھائی، عین وقت پہ رحمت کا فرشتہ بن کر آئے۔" تیمور کے انداز میں طنز کا شائبہ تک نہ تھا۔

"اچھا تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟" پروا نے موضوع بدلا۔

"چپ ہو کر بیٹھو۔" تیمور نے ڈانٹ دیا۔

یہ راز اس وقت کھلا جب اس نے ایک ہوٹل کے سامنے گاڑی روکی۔ آج پروا کی سالگرہ تھی اور اس نے میریٹ میں بطور خاص ٹیبل ریزرو کروائی تھی۔

"سالگرہ مبارک ہو پروا!" تیمور اور زارا نے بیک وقت کیک اس کے منہ میں ڈالا۔

نہ جانے کیوں اس قدر توجہ اور محبت پر پروا کو رونا آ گیا۔ اس کے ذہن میں گزشتہ سال منائی جانے والی سالگرہ کا منظر لہرا گیا جب وہ حویلی میں تھی۔ عین سالگرہ والے دن بابا سائیں نے آ کر اس کی خوشیوں کو بڑھا دیا تھا۔ زارا کا ارادہ تھا کہ پروا کو سرپرائزنگ برتھ ڈے وش کرے گی پر اس بار تیمور بازی لے گیا تھا۔

"مجھے تم جیسے دوستوں کی دوستی پر فخر رہے گا" اس کی آنکھوں میں نمی جھلملا اٹھی۔

تیمور نے نرمی سے اسے ٹوکا۔ زارا نے اسے گفٹ دیا۔ تیمور نے قیمتی پرفیوم اور شاعری کی کتابوں کا سیٹ اسے دیا۔ زارا کے ساتھ ساتھ تیمور نے اسے بھی گھر ڈراپ کیا۔

وہ معمول سے کچھ لیٹ ہی پہنچی تھی۔ کپڑے بدل کر لاؤنج میں آئی تو طاہرہ اضطراب کے عالم میں چکر کاٹ رہی تھیں۔ تیمور کے ساتھ آتے ہوئے وہ اسے دیکھ چکی تھیں۔

سلیمان جوان جہان لڑکی کو گھر اٹھا کر لے آیا جانے کس خاندان کی اور اس کے چونچلے اٹھا رہا تھا۔ سہارا دینے والے یونیورسٹیوں میں نہیں پڑھاتے اور اب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی کہ ایک اسمارٹ سے لڑکے کی گاڑی سے اتری تھی ان دونوں کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ آپس میں کافی بے تکلفی ہے پھر پروا کے ہاتھ میں دو شاپر تھے جو یونیورسٹی جاتے وقت انہیں نظر نہیں آئے تھے۔

سو وہ پروا کو دیکھتے ہی شروع ہو گئیں۔

"تم آج کس کے ساتھ آئی ہو؟" ان کا لہجہ شک سے بھرا ہوا تھا پروا نے سر جھکا لیا جس سے ان کا شک تقویت پکڑنے لگا۔

"ہو نہ ہو ضرور کوئی بات ہے۔" یہ ان کا قیاس تھا۔

"اصل میں آنٹی!......" پروا نے گلا صاف کرتے ہوئے بات کرنے کی کوشش کی۔

"میری آج برتھ ڈے تھی زارا اور تیمور نے مجھے سرپرائز دینے کے لیے ہوٹل میں ٹیبل ریزرو کروالی۔" اس نے زارا کا نام بھی مصلحتاً لے لیا۔

"یہ تیمور کون ہے؟"

پروا نے جانے کیوں نگاہ چرالی۔

"جس لڑکی سے مصطفیٰ بھائی کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی تیمور اس کا بھائی ہے۔ زارا بھی آج اس سے ملی تھی۔ وہ یونیورسٹی آیا تھا۔" اس کی زبان لڑکھڑا سی گئی۔

"تم کیسے جانتی ہو تیمور کو؟" وہ کڑے تیوروں سے بولیں۔

"اصل میں وہ...... میں، تیمور۔" اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ پھر ان کے تیوروں نے اسے خائف کر دیا تھا۔

"سلیمان ترس کھا کر تمہیں لایا ہے ہماری عزت کا خیال رکھنا۔" پروا کی نگاہیں زمین پہ گڑ گئیں۔

"سلیمان ہاسپٹل میں ہے گھر سارا بکھرا پڑا ہے اور یہ برتھ ڈے منا رہی ہیں حد ہوتی ہے خودغرضی کی۔" ان کے لفظ لفظ میں خنجر کی سی کاٹ تھی۔

"میں سلیمان کے پاس جا رہی ہوں اپنے انکل کو میڈیسن وقت پہ دے دینا اور رات کو اسلم کے ہاتھ چکن سوپ یاد سے بھجوا دینا۔" وہ اپنے گزشتہ الفاظ کا اثر زائل کرنے کے لیے تیز تیز بول رہی تھیں۔ اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ اسے افسوس میں گھرا چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ اصغر کسی دوست کے گھر گئے تھے جبکہ نائلہ پہلے سے ہی ہاسپٹل میں تھی۔ اس نے تنہائی سے دھیان ہٹانے کے لیے نواز کا نمبر ملایا ہمیشہ کی طرح سیل آف ہی ملا۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی نواز نے پلٹ کر پھر اس کی کوئی خیر خبر نہیں لی تھی، جانے وہ کس حال میں تھا۔

پروا تو اکثر اسے یاد کرتی کیونکہ وہ بابا سائیں کا دست راست تھا۔ ان کی یادگار۔ اس نے بھی بہت ساتھ دیا تھا اب نہ جانے کہاں تھا؟ کوئی اتا پتہ ہی نہ تھا۔ پروا کا دل جب طاہری بیگم کے اس سرد رویے سے گھبرانے لگتا تو اس کا جی چاہتا اپنے گھر چلی جائے حویلی میں جہاں بابا سائیں کی یادوں کی خوشبو بکھری پڑی تھی۔

اپنی نگرانی میں اس نے سوپ تیار کروا کے تھرمس میں ڈالا۔ زینت بوا پرہیزی کھانا پہلے ہی تیار کر چکی۔ ابھی وہ اسلم کو ڈھونڈ ہی رہی تھی کہ اصغر صاحب آ گئے۔

"تمہاری آنٹی کہاں ہیں بیٹا؟" انہوں نے طاہرہ بیگم کو نہ پا کر سوال کیا۔

"وہ تو ہاسپٹل گئی ہیں۔"

"میں بھی جا رہا ہوں وہیں پھر، ذرا چینج کر لوں۔" وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگے تو وہ جلدی سے بول اٹھی۔

"آنٹی نے سوپ اور کھانا بھجوانے کو کہا تھا وہ تیار ہے آپ جب چاہیں تو لے جائیں۔"

"ویری گڈ، ارے ہاں یاد آیا۔ سلیمان تمہارا پوچھ رہا تھا کل اگر جانا چاہو تو میرے ساتھ آ جاؤ۔" انہوں نے آفر کی۔

پروا کے دل میں خوشیوں کے ہزاروں ننھے منے دیپ بیک وقت جل اٹھے، صرف یک جملہ ہی تو تھا "سلیمان تمہارا پوچھ رہا تھا۔"

"ٹھیک ہے انکل! چلی جاؤں گی۔" اس نے بہ مشکل اپنی خوشی چھپائی۔

سلیمان پرائیویٹ ہاسپٹل کے وی آئی پی روم میں تھا۔ جب پروا اور اصغر اس کے پاس پہنچے تو وہ اکیلا تھا۔ اصغر صاحب کی سوالیہ نظروں پر وہ بولا۔

''مما اور نائلہ ابھی پندرہ منٹ پہلے گئی ہیں۔'' اصغر اس سے خیر خیریت پوچھ رہے تھے۔ پروا نے وزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا عین اسی وقت سلیمان نے نظر اٹھائی تو وہ گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

''سلیمان کھانا کھالو، بعد میں بات کرنا۔ بیٹی کھانا نکالو۔'' اصغر صاحب بیک وقت دونوں سے بولے۔

پروا نے اٹھ کر برتن نکالے۔ اسی اثناء میں اصغر صاحب کا فون آیا تو وہ اٹھ کر باہر سننے چلے گئے۔ وہ کھانا ٹرے میں اٹھائے بیڈ کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''کھانا کھالیں۔'' وہ اس کی طرف دیکھنے سے احتراز کر رہی تھی۔

''اتنے دن کے بعد آئی ہیں آپ اور ایک بار بھی میری خیریت نہیں پوچھی مجھے انتظار ہی رہا آپ کے آنے کا، نہیں کھانا مجھے کچھ بھی۔'' حیرت در حیرت کا سلسلہ تھا۔ کہاں تو وہ کسی جذبے کو عیاں ہونے ہی نہیں دیتا تھا اور اب بے تابی حد سے سوا تھی۔

اس حادثے کے بعد ہی سلیمان کو اپنے اور پروا کے مابین تعلق کی مضبوطی کا احساس ہوا۔ ماں کی باتوں سے وہ خود کو مجرم سا محسوس کر رہا تھا۔ ایک لڑکی اس کی منکوحہ تھی، اس کی زندگی میں شامل تھی اور وہ انجان بنا دیا تھا۔ اگر طاہرہ بیگم کا رویہ پروا کے لیے محبت بھرا ہوتا تو شاید یہ احساس بھی نہ جاگتا۔ وہ اس کے ساتھ ایک گھر میں رہ رہی تھی۔ طاہرہ بیگم کی کسی زیادتی پہ ایک لفظ تک نہ سنا تھا سلیمان نے اس کی زبان سے۔ بے شک وہ حمید جوکھیو کی بیٹی تھی پر اب تو اس کی عزت تھی۔

ناراضی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی اصغر صاحب فون سن کر دوبارہ اندر چلے آئے تو وہ ٹرے رکھ کر اپنی جگہ پر آ گئی۔

واپسی پہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ طاہرہ بیگم نے اس کے ہاسپٹل جانے پر ناراضی کا واضح اظہار کیا اور اصغر صاحب کو بھی نہیں بخشا۔

''آپ بھی حد کرتے ہیں اسے لے کر ہاسپٹل چلے گئے، میں پہلے ہی اس سے خوفزدہ ہوں، سلیمان پہ مجھے اعتبار ہے پر اس لڑکی پہ نہیں۔'' وہ صاف گوئی سے بولیں تو اصغر نے انہیں افسوس بھری نظروں سے دیکھا۔

''واہ بیگم! تمہارا بھی جواب نہیں، اگر یہ ہاسپٹل چلی گئی تو کون سی قیامت آ گئی۔ سلیمان کل پوچھ رہا تھا اس کا اس لیے لے گیا۔ پروا نے تو مجھے نہیں کہا کہ مجھے ہاسپٹل لے

جائیں۔ میں نے ہی کہا تھا۔'' وہ اور بھی کچھ کہتے رہے پر طاہرہ بیگم کو یہ جان کر بچ مچ کرنٹ سا لگا کہ سلیمان اس کا پوچھ رہا تھا۔

''مجھے تو گڑبڑ لگتی ہے۔''

''آپ کو تو ہر طرف گڑبڑ لگتی ہے خوامخواہ اس معصوم بچی کے پیچھے پڑ گئی ہیں حالات کی ماری ہے بے چاری۔''

''بس کریں آپ۔ حالات کی ماری ہے تو کسی لیڈیز ہاسٹل یا دارالامان کیوں نہیں چلی جاتی۔ یہ ہمارے سلیمان پر قبضہ جمانا چاہتی ہے، اور دیکھ لینا ایک دن ایسا ہو کے رہے گا۔'' اصغر صاحب کا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لیں۔

سلیمان ہاسپٹل سے گھر آ چکا تھا۔ مکمل صحت یابی کے لیے اسے ابھی چند ہفتے درکار تھے۔ گھر میں اس کی عیادت کو روز ہی کوئی نہ کوئی چلا آتا۔ سلیمان اس طرح آرام کا عادی نہیں تھا۔ لہٰذا بہت جلد تنگ آ گیا۔

پروا ٹی وی لاؤنج میں میوزک چینل دیکھ رہی تھی۔ طاہرہ بیگم آج رات دس بجتے ہی سو گئی تھیں۔ نائلہ کی دوست آ گئی تو وہ اسے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی گپیں لگانے، ابھی کچھ دیر بیشتر وہ بھی اس کے ساتھ ٹی وی دیکھتے ہوئے میوزک اور گلوکاروں پہ تبصرے کر رہی تھی۔

اب پروا اکیلی تھی۔ ابرار الحق کا نیا ویڈیو چل رہا تھا۔ وہ مزاحیہ بولوں پہ مسکرا رہی تھی۔ سلیمان کو نیند نہیں آ رہی تھی ویسے بھی وہ دیر سے سونے کا عادی تھا اتنی جلدی نیند آنی بھی نہیں تھی۔ نیچے آ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ طاہرہ بیگم اور نائلہ کے بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔

ٹی وی لاؤنج سے آواز آ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا وہ پروا کے پاس رکا تو اسے تب خبر ہوئی۔

''جاگ رہی ہیں آپ؟'' اس نے بات کا آغاز کیا۔

''جی ہاں' نیند نہیں آ رہی تھی۔''

''مجھے بھی نہیں آ رہی ہے۔ کارڈز کھیلیں گی میرے ساتھ۔'' اس نے دوستانہ آفر کی۔

''مگر مجھے تو...... کھیلنا نہیں آتا۔'' وہ بے چارگی سے بولی۔

''میں سکھا دوں گا۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

اسے تو یہ خوف بھی تھا کہ اگر طاہرہ بیگم اٹھ گئیں تو کیا ہوگا؟ وہ پہلے ہی اس کی طرف سے بدگمان تھیں۔

''آؤ اوپر چلتے ہیں میرے بیڈروم میں، وہیں کھیلیں گے، میں زیادہ دیر یہاں نہیں بیٹھ سکتا۔ درد ہونے لگتا ہے یہاں۔'' اس نے پسلیوں اور سینے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ اس کے کمرے میں جانا نہیں چاہتی تھی پر اس کے لہجے کی کشش کے زیرِ اثر بندھی چلی گئی۔

''کھیل شروع ہونے سے پہلے ایک ایک کپ چائے پینے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''ٹھیک ہے میں بنا کر لاتی ہوں۔'' وہ چائے بنانے کچن میں آ گئی۔

جلدی جلدی چائے بنا کر کپ میں ڈالی۔ اس کا تو چائے پینے کا موڈ ہی نہیں تھا صرف ایک کپ ہی بنایا۔ سلیمان نے ممنون نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''پروا آپ کو تم کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں؟''

''جی۔'' اس نے حیران نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ سلیمان کی آنکھوں میں جذبوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

''ہاں پروا! میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اب بھی نہ کہا تو منیر نیازی کی زبان میں دیر ہو جائے گی۔ پروا! میں بہت جلدی اپنے نکاح کے بارے میں گھر والوں کو بتا دوں گا۔ پتہ نہیں کیسے ہوا یہ سب۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''ہاسپٹل میں مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں اب اور اکیلا نہیں رہ سکتا۔'' پروا نے پلکوں کی جھالر آنکھوں پر گرا لی۔

سلیمان کی ذات سے سارے شکوے جو اسے تھے ابھی ابھی ختم ہو گئے، مگر چند سوال باقی تھے۔

''مگر گھر والوں نے تو ثناء آپی کے ساتھ آپ کی شادی کا پروگرام بنایا ہوا ہے اس کا کیا ہوگا پھر آنٹی کو بھی وہ پسند ہیں۔''

''بابا میرا دو شادیاں کرنے کا پروگرام نہیں ہے۔ بہرحال اب خوش رہنا، الٹی سیدھی سوچوں کو ذہن میں جگہ نہ دینا۔ میں بہت دنوں سے یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ......'' وہ رک گیا۔

''کیا؟'' وہ بے تابی سے بولی۔

''تم مجھے اچھی لگنے لگی ہو اتنی کہ آج تک کوئی اتنا اچھا نہیں لگا۔'' پروا کو اپنا دل حلق

میں دھڑکتا محسوس ہوا۔ ''تمہاری طرف سے شروع میں، میں نے جس غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا اس پہ شرمندگی ہے مجھے پر کیا کروں انسان ہوں میں بھی۔ اپنی اپنی انا کے مارے۔'' اب وہ اسے اور کیا کہتا کہ آج سے پہلے میں تمہیں صرف حمید جوکھیو جیسے مجرم کے حوالے سے دیکھتا تھا اور یہ نکاح صرف ڈیل تھی میرے نزدیک۔ ''پر نہ جانے کیسے مصطفیٰ کی مہندی کے روز اس لڑکے سے باتیں کرتے دیکھ کر میرے دل میں اپنے اور تمہارے رشتے کا احساس جاگا اور مجھے رقابت سی محسوس ہوئی تب ہی تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں تمہارے پاس چلا آیا۔ تم ہاسپٹل نہیں آئیں تو میرے دل میں جو جذبہ ننھے منے پودے کی شکل میں تھا اس عدم توجہ سے تناور درخت بن گیا۔ مجھے یہ سوچ ہی سرشار کر دیتی ہے کہ تم میری ہو۔ اب تم حمید جوکھیو کی بیٹی نہیں میری غیرت میری عزت بن گئی ہو۔ اس وقت وہ نکاح جو میرے نزدیک ایک کیریئر ڈیل تھی، خبر نہیں تھی کہ جان کا عذاب بن جائے گا اور مجھے تم سے سچ مچ محبت ہو جائے گی۔ میری طرف سے گھر والوں کی طرف سے کچھ زیادتیاں ضرور ہوئیں تمہارے سامنے ثنا کے ساتھ میری منگنی کا پروگرام بنا پر تم چپ رہیں۔ تمہاری روئی روئی آنکھیں میرے قرار و سکون کو لوٹ لے گئیں۔ پروا! تمہارے معاملے میں، میں اللہ سے ڈرنے لگا ہوں۔ تم رشتوں سے محروم ہو پر میں تمہیں سارے رشتوں کا مان دوں گا۔'' وہ اسے اتنے غور سے دیکھ رہا تھا کہ اس کے دل میں دہکتے جذبے آنکھوں میں لو دینے لگے تھے۔

بڑی معنی خیز سی خاموشی تھی۔ وہ اسے کارڈز کھیلنے کے لیے لایا تھا پر اب اس کی دھڑکنوں سے کھیل رہا تھا۔

''میں اب جاؤں؟'' گھڑی پہ نگاہ پڑی تو وقت کی نزاکت کا احساس ہوا۔

''جاؤ۔'' ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے سلیمان نے بڑی بے چارگی سے کہا تو وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی باہر آ گئی۔ نیچے خاموشی طاری تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے شکر ادا کیا۔

سلیمان کے اظہار نے اسے کتنا شانت کر دیا تھا۔ ساری فکروں سے بے نیاز ہو گئی تھی وہ۔ چاہت کی ایک نگاہ بھی کیا نگاہ ہوتی ہے۔ انسان سارے نفع نقصان پس پشت ڈال دیتا ہے۔

''اوہ تو، بارہ بج گئے۔ ٹائم گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ آج میری خیر نہیں امی سے جوتے پڑیں گے۔ دس بجے تک گھر سے باہر رہنے کی اجازت ہے آج بارہ بج گئے۔'' تیمور بہت متفکر تھا۔

عرفان اور سارے دوستوں نے مری جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ واپسی پر سمیرا نے اپنے گھر جانے کے لیے روک لیا۔ اب جو قصے چھڑے تو وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ تیمور اپنی خیر مناتا سارے دوستوں کو الوداع کہہ کر نکلا۔

گھر پہنچا تو ایک لائٹ کے سوا ساری لائٹس بند تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ سب سوئے ہوئے ہیں اسے اب گیٹ کود کر اندر جانا تھا کیونکہ اس وقت بیل بجانا اپنی شامت آپ بلانے کے مترادف تھا۔

آہستگی سے چلتا وہ برآمدے تک آیا۔ سامنے کا دروازہ نیم وا تھا۔ صدف بھابھی میکے میں تھیں۔ اس لیے ولید کی طرف سے قدرے بے فکری تھی کہ اسے جگا تو سکے گا۔ وہ ابھی ولید کے بیڈ روم کے دروازے پہ دستک دینے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ساتھ والے گھر کے آگے گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ اس وقت جانے کون آیا تھا۔

رات کے سناٹے میں چلتے قدموں کی آواز بڑی واضح تھی، کوئی لان کے ساتھ روش پہ چلتا گیٹ کی طرف آرہا تھا اس نے یوں ہی ذرا گردن اونچی کر کے حامد کے گھر کی طرف دیکھا گیٹ سے ساجدہ کی ہمراہی میں اندر آتے مصطفیٰ کو اس نے ایک نظر میں ہی پہچان لیا تھا۔ اس کا انداز چوروں والا تھا۔

ساجدہ کے چہرے پہ گھبراہٹ نظر آرہی تھی۔ اس نے مصطفیٰ کا بازو پکڑا ہوا تھا۔ اسی طرح۔ وہ اسے اندر لے گئی۔ گاڑی اسی طرح گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ اسے چند ثانیے کے لیے غصہ تو ضرور آیا پھر آہستہ آہستہ پرسکون ہوگیا۔

ساجدہ کے کردار کا ایک اور پہلو آج اس کے سامنے آیا تھا۔

❁

"سب سوگئے ہیں ناں؟" وہ اپنا اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔

"ہاں نیند کی گولیاں دونوں کو دودھ میں ملا کے دی تھیں۔ مرے پڑے ہیں۔" ساجدہ کے لہجے میں بے پناہ نفرت جھلک رہی تھی۔

"دیکھ لو تم نے بلایا اور میں آگیا اتنے خطرات مول لے کر بھی۔" مصطفیٰ کا لہجہ سراسر بناوٹی تھا، پر وہ نہال ہوگئی۔

"میں نے آپ جیسے ہمسفر کی آرزو کی تھی، پر جانے اس بڈھے حامد کی شکل میں کن

گناہوں کی سزا ملی ہے مجھے۔ میں نے آپ سے محبت کی ہے میری زندگی میں آنے والے آپ پہلے مرد ہیں حالانکہ اس کالونی کے بہت سے لڑکے اور مرد مجھ پر مرتے ہیں پر میں صرف آپ پہ مرتی ہوں۔"

"میرے صبر وقرار کو بھی تم نے لوٹ لیا ہے۔ شادی تک سے انکار کر دیا میں نے۔ واقعی اس غلطی کی طرف تم نے ہی توجہ دلائی..... کہاں وہ بیک ورڈ سی لڑکی جسے نظر بھر کر دیکھ لو تو پزل ہو جاتی ہے۔ ایک تم ہو ہر لحاظ سے پرفیکٹ۔ بیوی تم جیسی ہو تو لائف گزارنے کا مزہ آجاتا ہے۔ میں بہت جلد تم سے شادی کر لوں گا بس اپنے شوہر سے طلاق لو۔ میں دیر نہیں لگاؤں گا۔"

"سچ کہہ رہے ہو؟"

"بالکل سچ کہہ رہا ہوں میری جان!" وہ رومینٹک ہونے لگا تو ساجدہ بھی موم کی طرح پگھل گئی۔

جن آرزوؤں کی تکمیل حامد نہ کرسکتا تھا وہ مصطفیٰ کے ذریعے ہو رہی تھی اور گناہ وثواب کا احساس ہی مٹ گیا تھا۔

❁

حوریہ میکے آئی ہوئی تھی۔ اسے عثمان چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کا ارادہ تین چار دن رہنے کا تھا۔ تیمور رات کھانے کے بعد حوریہ کو آئس کریم کھلانے کے بہانے باہر لے آیا۔ پھر ڈرائیونگ کے دوران ہی پروا کے بارے میں اپنے جذبات سے بہن کو آگاہ کیا۔

"میں تمہیں اس سے ملواؤں گا، بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"محبت ہوگئی ہے تمہیں اس سے؟"

"میں اسے جلد سے جلد پانا چاہتا ہوں اگر اس کا نام محبت ہے تو پھر یہ محبت ہی ہوگی۔" تیمور کا پرکشش چہرہ جگمگا رہا تھا۔

"پھر کب ملوا رہے ہو اسے مجھ سے؟" حوریہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

"میں کل اس کی یونیورسٹی جاؤں گا، تم ساتھ چلنا یا اگر وہ گھر آنے کے لیے راضی ہوئی تو یہاں لے آؤں گا۔"

"ویسے تمہیں وہ ملی کہاں پہ؟" اس سوال پہ وہ مشکل میں پڑ گیا۔

"زارا کی فرینڈ ہے، پر نو ڈاؤٹ بہت اچھی ہے۔" زارا کے نام پر ایک لمحے کے لیے

اسے کچھ یاد آیا پھر حوریہ نے سر جھٹک دیا۔

"تم سناؤ تمہارے سسرال والے تو ٹھیک ہیں نا؟" تیمور نے موضوع بدلا۔

"ہاں سب بہت اچھے ہیں، بہت پیار کرتے ہیں مجھ سے" وہ تیزی سے بولی تو تیمور ہنس پڑا۔

"سب کہیں گے ہم دونوں کہاں غائب ہو گئے ہیں۔"

"کہیں گے تو سہی، تم نے صدف بھابھی کو بھی نہیں پوچھا۔"

"میری بہنا! ابھی میں نے صرف تم سے بات کی ہے جب پروا سے مل لوگی تو باقیوں کو تب بتاؤں گا اس لیے صرف تمہیں لایا۔ انہیں اب لے آتا ہوں گھر جا کر۔" اس نے گاڑی وہیں سے موڑ لی، حوریہ باہر کے مناظر میں گم ہو گئی......

صدف کباب فرائی کر رہی تھی جبکہ حوریہ سلاد بنا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی ہو رہی تھیں۔

"حوریہ! تم عثمان بھائی کے ساتھ خوش تو ہو نا؟" اس نے حوریہ کے چہرے پر کچھ تلاش کرنا چاہا۔

"ہاں بھابھی! بہت خوش ہوں۔" اس نے بھرپور طریقے سے مصنوعی خوشی کا اظہار کیا۔

"نہ جانے کیوں عثمان بھائی مجھے الجھے الجھے سے لگتے ہیں۔ اگر کوئی بات ہے تو چھپاؤ مت، مجھے بتا دو۔ کل وہ آئے تو تھوڑی دیر بیٹھے، میں نے محسوس کیا جیسے وہ جبراً مسکرا رہے ہوں تم بھی کھنچی کھنچی سی لگتی ہو نیو میرڈ کپل والی بات ہی نہیں ہے تم دونوں میں لوگ قیامت کی نظر رکھتے ہیں حوریہ ڈیئر! آج جو بات میں کہہ رہی ہوں کل کسی اور کے لبوں پہ بھی آسکتی ہے۔ عثمان بھائی نے بہت چاہت سے شادی کی ہے۔" صدف بھابھی کا آخری جملہ اس کے دماغ میں اٹک کر رہ گیا۔

سلاد فریج میں رکھ کر وہ کچن سے نکل آئی۔ پیچھے سے صدف اسے پرُسوچ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

پروا صوفے پر بیٹھی صفورا بیگم کی کسی بات کا جواب دے رہی تھی جبکہ صدف اور حوریہ نگاہوں ہی نگاہوں میں تیمور کو چھیڑ رہی تھیں پروا اس کے اصرار پر آج آ ہی گئی تھی۔ چائے پی لینے

کے بعد تیمور اسے چھوڑنے چلا گیا۔ اب تینوں خواتین پروا کے بارے میں ہی باتیں کر رہی تھیں۔

"امی! کسی روز پروا کے چچا کے پاس چلتے ہیں۔ ذرا دیکھ بھال کر لیں گے کہ کیسے لوگ ہیں۔ دیکھنے میں تو لڑکی اچھی ہی لگتی ہے پھر تیمور بھی سنجیدہ ہے اس کے لیے۔"

"صدف کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو، کچھ دن بعد چلوں گی۔" صفورا بیگم نے بہو کی تائید کی تو وہ خوش ہو گئی۔

پروا بڑی بے چین سی تھی۔ سلیمان، طاہرہ بیگم، اصغر صاحب، تائلہ، خولہ اور اس کا شوہر اور خاندان کے چند دوسرے بڑے کتنی ہی دیر سے ہال کمرے میں تھے۔ صرف ایک وہی تھی جو جلے پیر کی بلی کی طرح باہر پورے گھر میں چکر کاٹ رہی تھی۔

سلیمان نے اپنے نکاح کے بارے میں بتانے کے لیے بڑے تایا اور پھوپھو سے اخلاقی مدد کے بہانے انہیں بلوایا تھا تا کہ کیس ذرا مضبوط ہو سکے، کیونکہ اصغر صاحب بڑے بھائی کی کوئی بات ٹالتے نہیں تھے۔ اس لیے ایک روز پہلے ہی بڑے تایا کو اعتماد میں لے کر اپنے اور پروا کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا۔ بڑے تایا خود بھی انٹیلی جنس میں رہ چکے تھے انہوں نے ٹھنڈے دل سے ساری داستان سنی تھی۔

اب وہ سلیمان کے گھر میں بیٹھے سب کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"بہتری اسی میں ہے کہ پروا کو بطور بہو قبول کر لو کیونکہ قانونی و شرعی طور پہ وہ سلیمان کی بیوی ہے۔ اکیلی بے سہارا ہے۔ انسانیت کے نام پہ میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان کو مجبور مت کرو کہ اسے طلاق دے۔"

"پر بھائی جان! لوگ کیا کہیں گے کہ ایک نامی گرامی مجرم کی بیٹی ہی رہ گئی تھی ہمارے خاندان کے لیے۔ میرا بیٹا قانون کا رکھوالا ہے جبکہ وہ ایک کرپٹ کی اولاد ہے۔ حمید جوکھیو کا خون اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ اس سے ہم بھلائی کی توقع کیسے کر سکتے ہیں؟" یہ طاہرہ بیگم تھیں سجاول گیلانی کو غصہ آ گیا۔

"یہ کوئی فارمولا نہیں ہے کہ چور کی اولاد چور ہی ہو۔ مت بھولو کہ سلیمان نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو گواہ بنا کر اسے اپنی زندگی میں شامل کیا ہے۔ عہد توڑو گے تو اس کی سزا بھی ملے گی۔" طاہرہ بیگم نے ان کی بات سن کر برا سا منہ بنایا۔

"ٹھیک ہے بھائی جان! تھوڑا سا ٹائم چاہیے مجھے سلیمان کی شادی کے لیے۔ سچ پوچھیں تو یہ بچی پہلے روز سے ہی ہمیں اچھی لگی تھی۔"

"اصغر! اس کام میں اب دیر مناسب نہیں ہے۔ جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے۔"

"ٹھیک ہے بھائی جان!" اصغر صاحب سعادت مندی سے بولے تو طاہرہ بیگم نے انہیں گھورا۔

"میں امینہ کو کیا جواب دوں گی؟ کب سے اس نے ثناء کے بارے میں کہا ہوا ہے۔" انہوں نے نیا نکتہ اعتراض اٹھایا۔

"میں خود جواب دے دوں گا انہیں بھابھی! منگنی تو نہیں ہوئی ہے نا! ثناء کے لیے رشتوں کی کمی نہیں۔ ہاں اگر پروا کی ذات پر داغ لگ گیا تو ساری زندگی نہیں جائے گا۔" سجاول تلخ سے ہو گئے تو طاہرہ بیگم کا منہ بن گیا۔

خولہ اور نائلہ دونوں بہنیں باپ اور تایا کی ہموا تھیں، پھوپھو غیر جانبدار تھیں۔ سلیمان بہت خوش تھا کہ یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔

پھر اسی وقت سلیمان کو مٹھائی لانے دوڑایا گیا۔ سجاول صاحب نے پروا کو وہیں بلوالیا۔

"آج سے تم ہماری بیٹی ہو۔" انہوں نے اپنا بھاری ہاتھ اس کے سر پر رکھا تو جانے کیوں اسے رونا آنے لگا۔ اسے بابا سائیں یاد آ گئے تھے۔

سلیمان مٹھائی لے کر آیا تو ماحول خوشگوار ہو چکا تھا۔ طاہرہ بیگم نے بھی بادل نخواستہ گلاب جامن کا آدھا ٹکڑا منہ میں ڈالا۔ نائلہ اور خولہ نے بیک وقت بھائی کے منہ میں لڈو ٹھونسے۔

"پروا بیٹا! تم اپنا ضروری سامان کل رکھ لینا۔ میں آ کر لے جاؤں گا تمہیں۔" پھر سجاول صاحب، اصغر صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔ "یہ میرے گھر سے رخصت ہو کر آئے گی۔" پروا چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔

آج تو ناممکن ممکن ہو گیا تھا، کتنا اچانک ہوا تھا سب کہ وہ حیرت زدہ رہ گئی۔

بہر حال وعدے کے مطابق سجاول تایا اسے لینے آ گئے۔ ایک ماہ کا وقت دیا تھا انہوں نے اصغر صاحب اور طاہرہ بیگم کو۔ پروا ان کے ساتھ چلی گئی تو اصغر صاحب طاہرہ بیگم کو سمجھانے بیٹھ گئے۔

"طاہرہ بیگم! وہ ہمارے بیٹے کی خوشی بن گئی ہے تم نے سنا نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا کہ جب اس نے پروا سے نکاح کیا اس کے دل میں اس رشتے کے حوالے سے کوئی چاہت یا سوچ

نہیں تھی۔ اس نے صرف ایزاے ڈیل اس سے نکاح کیا تھا بعد میں آہستہ آہستہ اسی رشتے کی برکت کی بدولت اس کے دل میں محبت پیدا ہوئی۔ تم نے سنا تو ہوگا کہ نکاح دو اجنبیوں کو بھی قرب کی زنجیر میں پرو دیتا ہے۔ اب ہمارا بیٹا بھی اس راہ کا مسافر بن گیا ہے۔ تم نے اس کی آنکھوں میں جوت نہیں دیکھتی ہے کل کتنا خوش تھا وہ۔ اگر تم ایسا کرو گی تو وہ خوش نہیں رہے گا تم کیسی ماں ہو اپنے اکلوتے بیٹے کی ایک خوشی بھی تم سے گوارا نہیں ہو رہی ہے۔" اصغر صاحب نے اس کی دکھتی رگ کو چھیڑا تو وہ بلبلا گئیں۔

"کیوں گوارا نہیں ہے اس کی خوشی مجھے۔ بیٹا ہے وہ میرا۔ دشمن نہیں ہوں میں اس کی۔"

"تو پھر دوست ہونے کا ثبوت دو نا!" اب وہ انہیں صاف طور پر ستا رہے تھے۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"مطلب یہ کہ اپنی بہو کے لیے شاپنگ شروع کر دو۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ ہار مان چکی تھیں۔

◉

حوریہ ناشتے سے فارغ ہو کر اپنی نگرانی میں صفائی کروا رہی تھی۔ اس کی ساس نگینہ دو دن سے چھوٹی بیٹی کے پاس گئی ہوئی تھی۔

عثمان رات خاصی دیر سے آیا تھا اور کھانا کھائے بغیر سو گیا تھا۔ جب وہ فجر کی نماز پڑھ کر باہر آئی تب بھی وہ سو رہا تھا۔ حوریہ نے آہستہ آہستہ اپنے معمول کے کام نمٹانے شروع کیے۔ سب سے پہلے سسر کو ناشتہ بنا کر دیا اور ناشتہ کرنے کے بعد اپنے آفس چلے گئے۔ عثمان کو اس نے خود نہیں جگایا شاید اسے لیٹ جانا تھا۔

اس کی سرد مہری اور روکھا پھیکا رویہ دیکھ کر حوریہ کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ اسے بلائے اگر وہ خود سے مخاطب کرتی بھی تو ہوں ہاں میں جواب ملتا۔ عثمان کی اکثر معنی خیز باتیں اور اشارے اس کے سر سے گزر جاتے۔ اس کے باوجود وہ یہاں خوش تھی عثمان نے کسی کو کچھ محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔

اس دفعہ وہ میکے گئی تو پریشان سی ہو کر آئی۔ ان دونوں کے بیچ جو کچھ تھا صدف بھابھی نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی تو لگاتار بجتی چلی گئی۔ حوریہ نے لاؤنج میں آ کر فون اٹھایا۔

دوسری طرف ساجدہ بھابھی تھی۔

"کیسی ہو حوریہ!"

"ٹھیک ہوں بھابھی! آپ سنائیے اور حامد بھائی بھی ٹھیک ہیں نا۔"

"اس کا نام مت لیا کرو میرے سامنے۔" شوہر کے نام پہ اس کا حلق کڑوا ہو گیا۔

اب وہ کھل کر حامد سے نفرت کا اظہار کرنے لگی تھی۔ حوریہ قدرے حیران ہوئی مگر اس کا اظہار نہیں کیا۔

"تم سناؤ حالات کیسے جا رہے ہیں۔ میری بات پہ عمل کر رہی ہو یا نہیں؟"

"بس بھابھی! کیا بتاؤں صدف بھابھی کو شک ہو گیا ہے کہ میرے اور عثمان کے مابین کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔"

"تم نے بتایا تو نہیں؟" وہ پریشان ہو گئی۔

"نہیں، قطعی نہیں۔"

"بس بتانا بھی نہیں، تم بے شک بھابھی کو بتاتیں اور وہ عثمان سے پوچھتیں تو کیا وہ قبول کر لیتا کہ وہ عیاش اور بدکردار ہے؟ وہ کبھی بھی نہ مانتا۔ مردوں کی ذات ایسی ہی ہوتی ہے۔" ساجدہ کے لہجے میں زہر ہی زہر تھا۔

دوسری طرف بیڈروم میں لیٹا ہوا عثمان، ساجدہ اور حوریہ کے مابین ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن چکا تھا۔ ساجدہ کے فون آنے سے پہلے وہ باتھ روم میں شاور لے رہا تھا۔ اس لیے بجتی گھنٹی کی آواز اسے آئی ہی نہیں۔ اسے آفس فون کرنا تھا۔ اسی لیے اس نے ریسیو اٹھا کر جونہی نمبر ملانا چاہا تو ساجدہ کی آواز آئی وہ باتیں ایسی کر رہی تھی کہ نہ چاہنے کے باوجود بھی وہ سنتا چلا گیا۔

عیاشی اور بدکرداری کا طعنہ ایسا تھا کہ اندر ہی اندر وہ کھول اٹھا۔

❁

پروا گیٹ کے پاس ٹہل رہی تھی۔ کل غیر متوقع طور پر نواز کا فون آیا تو وہ بے پناہ خوش ہوئی اس سے گلے شکوے کیے۔

"بی بی سائیں! میں ملک سے باہر جا رہا ہوں، آپ کی امانت میرے پاس رہ گئی ہے، مجھے لوٹانا یاد ہی نہیں رہا کل کوریئر سے وصول کر لیجیے گا۔" پروا نے اسے بتایا کہ وہ سلیمان کے تایا کے گھر مقیم ہے اور تین ہفتے بعد یہیں سے اس کی رخصتی ہو گی۔

نواز نے اسے دعائیں دیں۔ کہا کہ وہ کوشش کرے گا اس کی شادی میں شریک

ہونے کی۔ پروا نے اسے یہاں کا ایڈریس بھی لکھوایا۔ اسے اب شدت سے کوریئر کا انتظار تھا۔

جب وہ خاکی رنگ کا موٹا سا لفافہ دے کر گیا تو اس نے اسی وقت بے تابی سے کھول لیا۔

اندر سے ایک چابی اور نواز کے ہاتھ سے لکھا مختصر سا پرچہ برآمد ہوا۔ یہ چابی بینک لاکر کی تھی۔

اگلے روز یونیورسٹی جانے کے بجائے وہ سیدھی بینک چلی گئی۔ لاکر سے مطلوبہ چیزیں نکلوائیں اور وہاں سے ایک ریسٹورنٹ میں آ گئی۔ نواز کا اسرار بھرا لہجہ بتا رہا تھا کہ بینک لاکر میں کوئی غیر معمولی چیز ہے اس لیے وہ یہاں آئی تھی۔

بڑا پرسکون سا ماحول تھا اور رش بھی نہیں تھا، زارا کے ساتھ وہ یہاں تین چار بار آئی تھی یہ ریسٹورنٹ اپنے ماحول کی وجہ سے اسے پسند تھا، یہاں وہ اطمینان سے ان چیزوں کو دیکھ سکتی تھی۔

اپنے بابا سائیں کی وصیت پڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ پھر اُن کے اپنے ہاتھ سے لکھا طویل خط تھا۔ جوں جوں وہ پڑھتی گئی اس کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا۔ بابا سائیں نے اپنی پوری زندگی کھول کر اس کے سامنے رکھ دی تھی۔

اپنی مجرمانہ زندگی کے اتار چڑھاؤ، اسے ہاسٹلز میں رکھنے کی وجہ، سلیمان کے ساتھ ہونے والی ڈیل، اپنی بیماری، نواز پر اعتماد کی وجوہات سب کچھ ہی تو تھا ان کاغذوں میں۔

اس نے بڑی مشکل سے اپنے بکھرے ہوئے جذبات پہ قابو پایا۔ نواز کا نمبر ملایا تو پہلی بیل پر ہی ریسیو کر لیا گیا۔

"نواز! اگر تم یہیں ہو تو ابھی اور اسی وقت میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔" اس کا لہجہ دو ٹوک تھا، نواز سمجھ گیا کہ بہلانے سے وہ کسی طرح نہیں مانے گی۔

"بی بی سائیں! آپ کہاں ہیں؟"

"تم گھر آ جاؤ، جو بابا سائیں نے بڑے چاؤ سے میرے لیے بنوایا ہے۔" اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی محسوس کی جا سکتی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد نواز اس کے سامنے تھا۔

"میرے بابا سائیں کے بارے میں مجھے بتاؤ کیوں نہیں بتایا مجھے وہ اتنے زیادہ بیمار تھے؟ دنیا کے لیے وہ حمید جوکھیو تھے پر میرے لیے صرف بابا سائیں تھے اور رہیں گے۔" وہ رو رہی تھی۔ نواز مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''بہرحال میں نے تمہیں اس لیے بلوایا ہے کہ مجھے بابا سائیں کی قبر پہ لے چلو میں فاتحہ پڑھنا چاہتی ہوں اپنے بدنصیب باپ کے لیے، ان کی روح کے سکون کے لیے۔''

''بی بی سائیں! میں یہ نہیں کرسکتا۔ وہاں آپ کے دشمنوں کا پہرا ہے میں اپنی جان تو دے سکتا ہوں آپ پہ کوئی آنچ آئے یہ مجھے منظور نہیں۔''

''نواز! مجھے اس زندگی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زمانہ مجھے حمید جوکھیو کی بیٹی کے حوالے سے دیکھتا ہے مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ میں ایک مجرم کی بیٹی ہوں۔'' وہ بہت دل گرفتہ لگ رہی تھی۔

''کچھ بھی ہو جائے، میں آپ کو وہاں نہیں لے جاسکتا۔''

''نواز! تم مجھے وہاں لے جاؤ گے اگر نہیں تو مجھے جگہ بتادو میں خود چلی جاؤں گی۔''

''بی بی سائیں! میں آپ کو موت کے غار میں نہیں لے جاسکتا کیونکہ میرے قابل اعتماد بندے نے بتایا ہے کہ بشیر چیمہ کا پورا گروہ وہاں موجود ہے۔ سائیں نے چھ ماہ پہلے جو بینک ڈکیتی کی واردات کی تھی وہ بشیر چیمہ کے ساتھ مل کر کی تھی۔ کامیاب واردات کے بعد انہوں نے ایک پرانے تنازعے کی وجہ سے وعدے کے مطابق آدھا حصہ اسے نہیں دیا تو دونوں میں پھوٹ پڑ گئی کیونکہ اس ڈکیتی میں بہت قیمتی اور بیش قیمت ہیرے بھی سائیں کے ہاتھ لگے جن کی قیمت اس وقت کروڑوں میں ہے۔ بس ان کے حصول کے لیے بشیر چیمہ پاگل ہو رہا ہے۔ اس نے سائیں کے آبائی گاؤں میں ڈیرہ ڈال لیا ہے۔ اس امید پہ کہ شاید ہیرے کا سراغ مل جائے۔ خود بشیر سائیں کے گاؤں کا رہنے والا ہے ان حالات میں آپ کا وہاں جانا اور قبر پر جانا آپ کے لیے جان سے جانے کا بہانہ بھی بن سکتا ہے۔ اس وقت آپ کی جذباتی حالت کسی کو بھی شک میں ڈال سکتی ہے پھر وہ بشیر چیمہ ہے جسے انسان کی نفسیات پڑھنے کا ہنر آتا ہے۔ گاؤں میں کوئی اجنبی بندہ جائے اور کسی کو پتہ نہ چلے ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ چھوٹا سا گاؤں ہے، شہر نہیں ہے۔'' نواز اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح پروا اس ارادے سے باز آجائے۔ ''آپ مجھے گولی ماردیں بے شک۔ میں آپ کا یہ حکم نہیں مان سکتا۔'' نواز نے اپنا پستول نکال کر سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ بے بس سی نظر آنے لگی۔

''اچھا مجھے اس گاؤں کا نام تو بتادو میں نہیں جاؤں گی کبھی حالات میرے حق میں ہوئے تو جاؤں گی۔''

''بی بی سائیں آپ عورت ذات ہیں ڈاکوؤں سے کبھی آپ کا واسطہ نہیں پڑا ہے اس

لیے ایسا کہہ رہی ہیں کہ کبھی جاؤں گی، آپ یہ خیال ہی ذہن سے نکال دیں۔''

''نہیں نواز! تمہیں بتانا پڑے گا یہ سب، اگر نہیں بتاؤ گے تو اپنی کنپٹی پہ یہ پستول رکھ کر میں اپنی زندگی کا خاتمہ کرلوں گی۔'' اس نے یکدم پستول اٹھالیا۔

نواز نے تھک ہار کر گاؤں کا نام بتادیا جہاں حمید جوکھیو کی قبر تھی۔

پروا کو گھر سے غائب ہوئے دوسرا روز تھا۔ اسے تلاش کرنے کی تمام تر کوششیں ناکام ہوگئی تھیں۔ کچھ بتائے بغیر جانے وہ کہاں چلی گئی تھی۔ سجاول صاحب سمیت سلیمان بھی اسے ڈھونڈنے کے لیے ہر ممکن ذرائع استعمال کر رہا تھا مگر اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔

◉

عثمان نے اب تک ہونے والے واقعات بلاکم وکاست ساجدہ کی آنے والی ٹیلی فون کال سمیت صدف کو سب کچھ بتادیا۔ اسے پورا یقین تھا صدف کو گھر کی بہو ہونے کے ناطے کچھ نہ کچھ پتہ ہی ہوگا۔

تمام زندگی صاف ستھرے طریقے سے گزاری تھی اب اس کی ذات پر اتنے رکیک الزامات اوپر سے شادی کے پہلے روز حوریہ کا روتا کتراتا انداز اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھا۔

صدف، ساجدہ کی نفسیات تک پہنچ گئی تھی۔ بدقسمتی سے اس کی شادی ایک بوڑھے سے ہوگئی تھی۔ پھر اسے اپنی خوب صورتی اور جوانی کا احساس بھی تھا اس احساس کو بڑھانے میں کالونی کے منچلے لڑکوں نے بھی نمایاں کردار ادا کیا تھا جنہیں ساجدہ آتے جاتے مسکراہٹ سے نوازتی رہتی۔

اس کی سوچ یہی تھی اگر وہ خوش نہیں کوئی اور خوش کیوں رہے۔ اسی سوچ نے اس کے حسد کو انتہا تک پہنچادیا۔ حوریہ اتنی ہوشیار نہیں تھی سو بڑے آرام سے اس کے جال میں آگئی۔

حوریہ کا مصطفیٰ سے رشتہ ٹوٹنے میں بھی ساجدہ کا ہی ہاتھ تھا۔ ولید پہ اس کی نگاہوں کا تیر چل نہیں پایا ایک دوبار اس نے صدف کو گمراہ کرنے کی کوشش کی پر وہ سمجھدار تھی ولید سے بات کرکے معاملے کو صاف کرلیا۔

باتوں باتوں میں تیمور نے بتایا کہ اس نے رات کو مصطفیٰ کو ساجدہ کے گھر جاتے دیکھا ہے، یہ بات نظرانداز کرنے والی نہیں تھی۔ صدف نے حوریہ سے پوچھا تو وہ مکر گئی مگر اب عثمان نے

بتایا تو ایک ایک کر کے سارے پردے اٹھتے چلے گئے اب صرف حوریہ سے تصدیق باقی تھی۔

❂

رات دو ڈھائی بجے کا ٹائم تھا جب حامد کا گھر چیخوں سے گونج اٹھا۔ چیخیں اتنی لرزہ خیز تھیں کہ آس پاس کے گھروں کے سوئے اکثر مکین جاگ گئے۔

صفورا بیگم کی آنکھ کھل گئی۔ ولید اور تیموران سے پہلے جاگ چکے تھے۔ حامد کے گھر کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ آوازیں اندر سے آ رہی تھیں ولید اور تیمور دونوں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔

ساجدہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھے برابر تکلیف دہ انداز میں ذبح ہونے والے جانور کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اس کا چہرا بہت بھیانک لگ رہا تھا۔ آفاق عالم نے اس کے چہرے پہ تیزاب پھینک دیا تھا۔ کافی عرصے سے وہ اس کے خلاف غم وغصہ دل میں لیے بیٹھا تھا۔ وہ دور دور سے رہ کر ترسا رہی تھی جذبات پوری طرح برانگیختہ کر کے اب دور بھاگ رہی تھی۔

پہلے خود ہی اسے لائن ماری محبت کا اظہار کیا وعدے قسمیں کھائیں۔ اسے اس انتہا تک لے آئی کہ آفاق کو اس کے بغیر جینا محال لگنے لگا وہ گوڈے گوڈے اس کے عشق میں غرق تھا وہ ایک ہی سانس میں پیاس بجھالینا چاہتا تھا جبکہ وہ قطرہ قطرہ کر کے دید کی بھیک اس کے آگے پھینک رہی تھی۔

وہ اپنے جذبات کے ہاتھوں پوری طرح بے بس ہو چکا تھا۔ ساجدہ بھری شراب کی بوتل جیسی تھی اور اس کا نشہ آفاق کے انگ انگ میں سرائیت کر چکا تھا۔

آفاق نے تین چار اور لڑکوں کو بھی اس کے عشق کا دعویٰ کرتے سنا۔ کم وبیش وہ سب کے سات ہی کھیل کھیل رہی تھی۔ البتہ مصطفیٰ کو اس نے الگ ہی حیثیت دے دی تھی ان سب سے برتر۔

کسی طرح آفاق کو بھی بھنک مل گئی تو اس نے پوری پوری تفتیش کی وہ ساجدہ کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا۔ سوئے اتفاق اس نے بھی مصطفیٰ کی گاڑی کو ساجدہ کے گھر کے آگے کھڑے دیکھا ایک بار ایک ہوٹل میں وہ اس کے ساتھ نظر آئی۔

ساجدہ کے تمام عاشقوں کو اس کا صدمہ تھا کہ اس نے انہیں دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا ہے۔ پھر آفاق کی حالت سب سے بری تھی۔ آج بھی آدھی رات کو جب آفاق نے آہستگی سے دروازہ ناک کیا تو اس نے اس گمان پہ کھولا کہ شاید مصطفیٰ ہو پر آگے آفاق کھڑا تھا۔

اس نے ساجدہ کو فرد جرم سنائی۔ اس دوران حامد بھی جاگ گیا آفاق نے اسے نفرت سے ڈانٹا۔

''تم بہت دیر سے جاگے ہو اب تک تمہاری غیرت کہاں سوئی ہوئی تھی۔'' آفاق نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اب وہ اپنی بیوی کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ پھر آفاق نے تیزاب کی بوتل نکالی جو اسی مقصد کے لیے اس نے خریدی تھی۔

''یہ خوب صورت جسم اس قابل نہیں رہے گا کہ دوبارہ کسی کو بھٹکا سکے تمہارا یہ چہرہ میں بگاڑ دوں گا۔'' اس پہ درندگی طاری تھی۔

بوتل کا ڈھکن کھول کر اس نے تیزاب ساجدہ پہ انڈیلا، تو وہ چیختی چلی گئی۔ پہلے اس نے بڑی منتیں کیں واسطے دیے پرانی محبت کا حوالہ دیا پر آفاق کی ایک ہی رٹ تھی۔

''میں تمہارے جیسی ناگن کا سر کچل کے رہوں گا تم میرے جذبات کے ساتھ کھلونے کی طرح کھیلتی رہی میں مرد تھا جیتا جاگتا مرد موم کا گڈا نہیں تھا اپنے انجام کے لیے تیار ہو جاؤ''

ساجدہ کا حسن شاداب جسم بھی کام نہ آ سکا آخری وقت اس نے اس کی بھی رشوت پیش کی جسے آفاق نے حقارت سے ٹھکرا دیا۔

جہاں جہاں تیزاب گرا وہاں وہاں سے گوشت پوست سے بنا شاداب وجود عجیب ہیبت ناک شکل اختیار کرتا گیا۔

تکلیف کی شدت سے وہ ہوش سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ آفاق عالم تو اپنا کام پورا کر کے اسی وقت نکل گیا۔ تیمور نے حامد کو رسیوں سے آزاد کیا اور اس کے منہ سے کپڑا نکالا۔

حامد کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی ساجدہ اس کی محبوب بیوی اس حال میں بے ہوش پڑی تھی کہ اس کا چہرہ دیکھ کر ہی کراہیت اور متلی آ رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ بے وفائی کرتی رہی اور اسے پتہ ہی نہ چل سکا۔

باون سالہ حامد کو آج احساس ہوا کہ ساجدہ کے ساتھ شادی کر کے اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ اتنی بڑی غلطی جس نے اسے زار زار رلا تا تھا۔

❂

پولیس اس واقعے کی تفصیلات جاننے اور تفتیش کرنے حامد کے گھر آئی تو اس نے یہ کہا کہ دو نقاب پوش آدمی رات ان کے گھر گھس آئے سیف کی چابیاں دینے سے انکار پہ انہوں نے اس کی بیوی کو بری طرح زدوکوب کیا اور پھر تیزاب پھینک کر فرار ہو گئے۔ آفاق عالم کا تو نام ہی اس نے نہیں لیا تھا۔ اس بیان میں کئی جھول تھے پولیس کو بھی اس بیان پہ یقین نہیں تھا پر حامد سختی

سے اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

ادھر ساجدہ بے ہوشی کے عالم میں ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھی۔ اس کا خوب صورت چہرہ بری طرح مسخ ہو چکا تھا۔ اب تقریباً تقریباً ناممکن تھا جو وہ اپنی کھوئی ہوئی خوب صورتی کو پالیتی۔ پولیس اس کے ہوش میں آنے کے انتظار میں تھی۔

مصطفیٰ نے شادی کے لیے لڑکی پسند کر لی تھی۔ ساجدہ پہ تیزاب پھینکے جانے کی خبر اسے اخبار سے معلوم ہوئی تھی۔

خبر پڑھنے کے بعد اس نے اخبار لاپروائی سے ایک طرف ڈال دیا۔

''ساجدہ جیسی عورتوں کا یہی حال ہوتا ہے۔'' ایک طنزیہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آئی۔

وہ ضد کر رہی تھی کہ وہ جلد از جلد اس سے شادی کر لے اور اپنے گھر والوں سے ذکر کرے تاکہ وہ حامد سے طلاق کا مطالبہ کرے۔ بھلا وہ ساجدہ جیسی گاؤں کی پروردہ معمولی تعلیم یافتہ لڑکی کو لائف پارٹنر بنائے بے شک وہ خوب صورت تھی پر اس عورت کی خوب صورتی کس کام کی جس کا کردار ہی مشکوک ہو۔

یہ ساجدہ ہی تھی جس کی وجہ سے وہ حوریہ جیسی بے مثال لڑکی کو ٹھکرا گیا۔ اب اپنے فیصلے پر پچھتاوے کا احساس ہوتا...... کہ اس نے ایسا کیوں کیا نہ کرتا تو آج حوریہ اس کے ساتھ ہوتی۔ اس جیسی باکردار لڑکی تو قسمت والوں کو ملتی ہے۔

اس نے خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی تکلیف تو ہونی ہی تھی۔

❁

وہ سب افسردہ تھے ساجدہ جیسی بھی تھی ان کی پڑوسن تھی حامد کی بیوی تھی جن کے ساتھ اچھا وقت گزرا تھا۔ ولید اور حوریہ کی شادی میں بڑھ چڑھ کا حصہ لینے کی وجہ سے اس نے تمام گھر والوں کے دل جیت لیے تھے۔

حوریہ کو بہت دکھ ہوا تھا۔ خود صفورا بیگم تاسف سے ہاتھ مل رہی تھیں۔ ساجدہ ایک انسان بھی تو تھی اسے ہونے والی تکلیف کا صرف اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ اس بات کو بھی جاننے کا تجسس تھا کہ اس پہ تیزاب پھینکنے والا کون ہے؟

❁

پروا اس کے سامنے بیٹھے رو رہی تھی۔ ابھی ابھی اس نے اپنے اور سلیمان کے نکاح کا

جو انکشاف کیا تھا اس انکشاف سے تیمور کو یوں لگا تھا جیسے اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر ہزارہا ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے۔

''میں نفرت کرتی ہوں، سلیمان سے اس نے بابا سائیں سے انہیں گرفتار کرنے کے لیے نکاح کا ڈرامہ رچایا۔ میں اتنی بدقسمت ہوں جسے اپنے باپ کا مرا ہوا منہ دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا نہ یہ پتہ ہے کہ بابا سائیں کہاں دفن ہیں؟ تم میرے دوست ہو نا، پلیز مجھے بابا سائیں کے گاؤں تک چھوڑ کر واپس آ جاؤ پلیز مجھے وہاں تک لے جاؤ میرے ساتھ آؤ۔ میں اکیلی ہوں نا۔'' وہ زار و قطار رو رہی تھی جیسے تیمور کا دل قطرہ قطرہ پگھل رہ تھا۔

وہ اس لڑکی سے محبت کرتا ہے کیسے اسے روتا دیکھ سکتا ہے؟

''پروا! اٹھو میرے ساتھ آؤ۔'' اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ اس کے آنسو تھم گئے۔

''تم میرے ساتھ جاؤ گی۔'' وہ اسے امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں فی الحال تم میرے ساتھ میرے گھر آؤ۔'' وہ اسے بہلا رہا تھا۔

پروا کو وہ اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ صدف بھابھی اور امی کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا رو رو کر پروا کی حالت خاصی قابل رحم ہو رہی تھی۔ تیمور نے دودھ کے ساتھ سلیپنگ پلز زبردستی اسے کھلائی۔

وہ سوچکی تھی۔ اس نے تیمور کے سامنے سلیمان سے اپنی نفرت کا اظہار کیا اور واضح اعلان کیا کہ وہ سلیمان کے ساتھ نہیں رہے گی نہ اس کے گھر جائے گی زندگی بھر اس کی شکل نہیں دیکھے گی۔ تو کیا جب وہ اپنے دل کا حال اسے سنائے گا تو وہ اسے قبول کر لے گی؟ یہ سوال اس کے ذہن میں چبھ رہا تھا۔

فی الحال وہ ضد کر رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ بابا سائیں کے آبائی گاؤں چلے۔ ادھر پڑوس میں ساجدہ والا حادثہ رونما ہو چکا تھا۔ جس پہ وہ بھی پریشان تھا۔

پروا صبح تک سوئی رہی۔ صبح بیدار ہوئی تو وہی رٹ لگا دی کہ اسے گاؤں جانا ہے۔

''پروا گاؤں کافی دور ہے آج سفر کا انتظام کرتے ہیں کل چلیں گے۔'' تیمور نے اسے سمجھایا تو وہ چپ ہو گئی۔ یہ وہی وقت تھا جب سلیمان اسے پاگلوں کی طرح تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

❁

سلیمان اسے ابھی ابھی تیمور کے گھر سے زبردستی واپس لایا تھا۔ اگر تیمور اسے فون کر کے

پروا کے بارے میں نہ بتاتا تو اور نہ جانے وہ کتنا پریشان ہوتا۔ اسے دیکھتے ہی پروا کا رنگ فق ہو گیا اور وہ ہٹ دھرمی پہ اتر آئی۔ سلیمان کو غصہ تو بہت آیا مگر پی گیا سب کے سامنے وہ تماشہ بنوانے پر تلی ہوئی تھی پروا کو وہ واپس لایا تو طاہرہ پریشان سی برآمدے میں کھڑی تھیں۔ سلیمان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ سخت غصے میں ہے اسے اس طرح دیکھ کر طاہرہ بھی ڈر گئی۔ سلیمان کا غصہ تھا ہی ایسا کہ سارا گھر پناہ مانگتا۔

پروا کو وہ سیدھا اپنے کمرے میں لے آیا۔

نائلہ ششدر سی سیڑھیوں کے پاس کھڑی تھی۔ دو روز سے سلیمان اتنا پریشان اور ڈسٹرب رہا تھا کہ ماں ہونے کے ناطے طاہرہ کا دل بھی پگھل گیا اب تو ان کی یہی دعا تھی کہ کسی طرح پروا مل جائے تا کہ سلیمان کو سکون آجائے ان کی ساری نفرت اور ناراضگی جو انہیں پروا سے تھی ختم ہو گئی تھی۔

''مما آپ اوپر جائیں نا!'' نائلہ، طاہرہ سے بولی خود وہ اوپر جانے کی ہمت نہیں پا رہی تھی۔ ''جانے بھائی پروا کے ساتھ کیا کر رہے ہوں گے؟'' اس سوچ کے ساتھ ہی اسے رونا آرہا تھا کیونکہ سلیمان نے کل ہی تو کہا تھا اگر پروا مل جائے تو وہ اسے سبق سکھا دے گا۔

''اسے سمجھا رہا ہوگا۔'' طاہرہ خود اندر سے ڈر رہی تھیں۔

''تم کیوں اس طرح گئی مجھے کہتی میں خود تمہیں لے جاتا۔ میرے ساتھ تم محفوظ رہتی وہاں پرائے لوگوں کے سامنے تم نے میرا تماشہ بنوا دیا کہ میں نے تمہیں جانا...... کیوں کیا تم نے ایسا بولو جواب دو۔'' سلیمان درشت تیور لیے قہر و غضب میں بھرا عین اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''بس میں نے آپ کے ساتھ نہیں رہنا آپ نے نکاح کے نام پہ میرے ساتھ میرے ساتھ......'' آنسوؤں کی زیادتی سے اس سے بات ہی پوری نہیں کی گئی۔

''تم نے کیوں میرے ساتھ نہیں رہنا؟'' سلیمان کے فولادی ہاتھ اس کے کندھوں میں گڑ گئے۔

''اس لیے کہ مجھے آپ سے نفرت ہے۔''

''ایک دفعہ پھر کہنا۔'' اس کے ہاتھوں کا دباؤ اس کے کندھوں پہ یکدم بڑھ گیا۔

''مجھے آپ سے نفرت ہے، مجھے آپ سے نفرت ہے، مجھے آپ سے نفرت ہے۔''

روتے روتے وہ اس کے فراخ سینے سے آ لگی۔

''مجھے بھی تم سے نفرت ہے۔'' سلیمان نے اسے بڑی نرمی سے سمیٹ لیا۔ جذبوں

کی شدت سے وہ پگھل رہا تھا۔

''آئندہ مجھے چھوڑ کے تو نہیں جاؤ گی؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''تم نے میری جان نکالنے میں کسر نہیں چھوڑی تھی، کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تمہیں۔ مجھ سے دور رہ کے جی لیتیں؟ تم نے سچ مچ میرا سکون لوٹ لیا ہے پروا!'' سلیمان کے اعتراف شکست نے اسے شانت کر دیا۔

بڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ سلیمان سے کس قدر قریب ہے، اس نے بازوؤں کے گھیرے سے نکلنا چاہا۔

''ابھی نہیں، میں نے تمہیں بتایا ہی نہیں کہ میں تم سے کتنی زیادہ نفرت کرتا ہوں۔'' پروا نے نگاہ چرالی۔

اچانک دروازے پہ بڑی زوردار دستک ہوئی۔ پروا تڑپ کر اس کے حصار سے نکلی۔ سامنے طاہرہ بیگم اور نائلہ کھڑی تھیں۔ پروا کو پھر رونا آ گیا۔

''آنٹی! مجھے معاف کر دیں۔'' طاہرہ بیگم نے اسے گلے سے لگا لیا۔

''بس کرو پروا! آئندہ اس طرح کی حماقت نہ کرنا۔'' ان کے لہجے اور آنکھوں میں پیار تھا۔ پروا اندر تک پر سکون ہو گئی۔

''تمہارے انکل کب سے پوچھ رہے ہیں کہ پروا کہاں ہے۔ نائلہ نے فون کر کے انہیں تمہارے آنے کی اطلاع دی تھی۔ فوراً نیچے آؤ۔'' طاہرہ بیگم ساڑھی کا پلو سنبھال کر نائلہ کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

''سلیمان! میں بہت شرمندہ ہوں۔ کیسے انکل کے سامنے جاؤں۔''

''اب جو کیا ہے وہ بھگتو بھی۔'' سلیمان شرارت پہ آمادہ تھا۔ وہ روہانسی ہو گئی تو سلیمان سنجیدہ ہو گیا۔

''آؤ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ اس بات کا یقین رکھنا کہ سلیمان ہر دکھ سکھ میں تمہارے ساتھ ہے۔'' وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا۔

پروا نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"حوریہ کی بچی، آخر کب تک تمہارا یہیں ڈیرے ڈالے رکھنے کا ارادہ ہے۔ اتنا آفت موسم ہو رہا ہے اور تم میرے بھائی کو یہاں بیٹھ کے آزمانے پر تلی ہو۔" صدف کا انداز خبر لینے والا تھا۔

"بھابھی! مجھے عثمان سے ڈر لگتا ہے۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"حوریہ! اب جب ساری بات کھل گئی ہے۔ تم ہی سمجھ داری سے کام لو، عثمان بہت اچھا ہے۔ تم چھ روز سے یہاں ہو۔ عثمان کا کل بھی فون آیا تھا تم تیاری کرو میں اور ولید تمہیں چھوڑ آئیں گے۔ تم ناراض ہو کے تو نہیں آئی ہونا! وہ تمہارا اپنا گھر ہے۔"

"بھابھی! بس نہ جانے کیوں مجھے ڈر سا لگ رہا ہے۔"

"سارے ڈر اور سارے خوف دل سے نکال دو۔ اس سے پہلے کہ تمہاری حماقت کا کسی اور کو بھی پتہ چل جائے۔"

"بھابھی! آپ کتنی اچھی ہیں۔" وہ بے ساختہ بولی۔

اتنے میں پیچھے سے تیمور بھی آ گیا۔ وہ حوریہ کا آخری جملہ سن چکا تھا۔

"بہنا! میری زیادہ تعریفیں مت کیا کرو کیونکہ مجھے پتہ ہے۔"

مجھ سا کوئی پیارا کوئی معصوم نہیں ہے

وہ گنگنایا تو ان دونوں کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

حوریہ نے شکر کیا کہ تیمور، پرواوالا شاک بھلا کے نارمل ہو گیا ہے۔

سب لوگ ہنس بول رہے تھے، صدف بھابھی اور ولید بھائی اسے چھوڑنے آئے تھے۔ نگینہ بیگم اور عثمان نے انہیں کھانے پر روک لیا۔

ان کے جانے کے بعد حوریہ نے برتن سمیٹے اور کچن صاف کیا، زینت بوا نے برتن دھوئے وہ اب فارغ تھی۔

عثمان کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ آج پھر بارش ہو رہی تھی۔ کچھ دیر اس نے بارش کی بوندوں کو ہتھیلی میں پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ کمرے میں جا چکی تھی۔

عثمان سیڑھیاں چڑھ کے جونہی اوپر آیا۔ وہ ڈریسنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی خوشبو امنڈ پڑی۔ وہ بجی سنوری بے پناہ اچھی لگ رہی تھی۔

عثمان صوفے پر بیٹھ کر جونہی جوتے اتارنے لگا حوریہ اس کے پاس نیچے بیٹھ گئی۔ اس

کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ حوریہ اس کے جوتے اتارنے لگی تو عثمان نے روک دیا۔ "مجھے یہ سب پسند نہیں ہے۔" اس نے نرمی سے ٹوکا۔

"مگر مجھے اچھا لگے گا۔ آپ کے چھوٹے چھوٹے کام کرنا۔" اس نے جوتے اتارے۔

تھکا تھکا سا بکھرے بالوں اور شرٹ کے اوپر دو کھلے بٹنوں کے ساتھ وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"یہ ہار جیت کی باتیں
کل پہ اٹھا رکھیں
آج موسم بہت اچھا ہے
آؤ
آج دوستی کر لیں"

حوریہ گلابی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلائے کھڑی تھی۔ عثمان کی ساری خفگی پل بھر میں ہوا ہو گئی۔

سادہ سے اظہار ندامت نے گزشتہ سارے شکوے دھو ڈالے تھے۔ گلاس ونڈو کے پاس کھڑی حوریہ کے شانوں کے گرد اس نے اپنے بازو پھیلا دیے۔

"بہت سارے خوب صورت دن ہم نے ضائع کر دیے ہیں۔ بارش کی وہ رات مجھے نہیں بھولتی جس کے حوالے سے میں نے بڑے خوب صورت خواب بنے تھے۔ پر خیر پھر ایسی ہی رات ہے آج۔" عثمان کا لہجہ سرگوشی میں ڈوب گیا۔

"میں بہت انتہا پسند ہوں اور تمہارے معاملے میں تو حد سے زیادہ۔" وہ بہک رہا تھا۔

باہر بارش نے خوابناک سی دھند پھیلائی ہوئی تھی۔ یہ بارش اس کی زندگی میں خوشیاں لے کر آئی تھی۔

عثمان نے اس سے کوئی وضاحت نہیں مانگی نہ ہی اسے معذرت کرنی پڑی تھی، ایسا ہی اعلیٰ ظرف اور سلجھا ہوا تھا وہ۔

"اتنے روز میکے میں لگا دیے، میں انتظار ہی کرتا رہا۔" اس نے شکوہ کیا۔

"اب کبھی انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔" حوریہ نے ہنس کر یقین دلایا تو وہ اسے اپنے پیار کی بارش میں بھگوتا چلا گیا۔

عجب مسافر دشت تھے

مغرب کی طرف سے بڑے زور کی آندھی آئی تھی۔ پل بھر میں گھر کا وسیع صحن اور برآمدہ جامن اور سرو کے درختوں کے پتوں اور گرد سے اٹ گیا۔ آندھی کے ساتھ بادل بھی گرج رہے تھے۔ رملہ نے بھاگم بھاگ تار پہ ٹنگے کپڑے اتارے۔ ادھر انوشہ کچن میں مصروف تھی سنک برتنوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ دھودھو کر بے حال ہوئی جا رہی تھی، صبح سے انوشہ کی طبیعت بھی خراب تھی مسلسل مصروف رہنے کی وجہ سے اس کی کمر اور پنڈلیاں درد کر رہی تھیں۔ ننھی علیزہ اماں کے لیے سخت بے چین تھی۔ دو تین بار وہ کچن میں اس کے پاس آئی۔ وہ مضبوطی سے اس کی ٹانگیں پکڑ کر کھڑی ہو جاتی تو مجبوراً اسے زبردستی باہر چھوڑ کر آنا پڑتا۔ وہ اسے چار پائی پہ بٹھا آتی وہاں سے علیزہ اترتے ہوئے ڈرتی اور رونے لگتی تو پاس کھیلتے بچوں میں سے کوئی نہ کوئی اس کی آہ وزاری سے متاثر ہو کر چار پائی سے نیچے اتار دیتا۔ وہ گرتی پڑتی پھر انوشہ کے پاس آجاتی جو بیک وقت کئی کاموں سے نبرد آزما تھی۔ ابھی ابھی عفان چائے کا آرڈر دے کر گیا تھا کہ ابو کے دوست آئے ہیں فٹافٹ دس کپ چائے بنا کر بھجوائیں۔ صبح سے وہ بلا مبالغہ اب نویں بار چائے بنانے لگی تھی۔ یہ تو روز کا معمول تھا۔ بھائی جان بہت ملنسار اور مہمان نواز تھے ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا کہ جب کوئی دن مہمانوں کی خاطر تواضع کے بغیر گزر جائے۔ گھر داری کی زیادہ بلکہ تمام تر ذمہ داری اب انوشہ کے سر آپڑی تھی اور تو کوئی کچن میں پھٹکتا ہی نہ تھا۔ انوشہ کی وجہ سے رومانی بوا کی بن آئی تھی۔ محنتی تو وہ پہلے بھی نہ تھیں انوشہ کی دیکھ کر اور بھی پھیل گئی تھیں، مارے باندھے پہلے وہ جو کام کرتی تھیں۔ وہ سلسلہ بھی انوشہ کی آمد کے بعد ختم ہو گیا تھا۔

''ارے کتنی دیر سے سجان رو رہا ہے کہ پھوپھو فرنچ فرائز بنا دیں مگر پھوپھو ہیں کہ مزاج ہی نہیں ملتے، بوا بھی جانے کہاں مرگئی ہیں۔'' مہوش بوا کو صلواتیں سنانے کے ساتھ ساتھ آلوؤں کی ٹوکری اٹھا کر لائیں، انوشہ ہمیشہ کی طرح ان سے دب گئی۔

''بس بھابھی! یہ پتیلا مانجھ کر بنانے ہی لگی تھی۔ آپ ہٹیں کمرے میں چلیں۔ میں ابھی لاتی ہوں۔ بس آپ جائیں۔'' اس کا عاجزی کو چھوتا لہجہ بھابھی کے ماتھے کے بلوں میں اور بھی اضافہ کر گیا۔

''رہنے دو اپنے احسانات کے بوجھ کو، سو سو بار جتاتی ہو کہ میں یہ کرتی ہوں۔ میں وہ کرتی ہوں جیسے ہم نے تمہیں اس گھر میں نوکرانی بنا کر رکھا ہوا ہے ناں!''

انوشہ کسی بھی قسم کی بدمزگی سے بچنے کے لیے خاموش ہو گئی اور کسی طرح مہوش بھابھی کی منت سماجت کر کے زبردستی ان کے ہاتھ سے آلو لے لیے۔

''انوشہ نے چکن کیوب کا پیکٹ کھولا اور ایک کیوب نکال کر گرم پانی میں حل کیا پھر اس پیسٹ کو اچھی طرح آلوؤں میں مکس کیا چند منٹ انتظار کرنے کے بعد اس نے آلو تیل سے بھری کڑاہی میں فرائی ہونے ڈال دیے۔ صد شکر کہ اس نے املی اور پودینے کی چٹنی پہلے ہی بنائی تھی۔ اس نے چٹنی کے ساتھ کیچپ بھی ڈال دیا۔ رملہ خاموشی سے ایک طرف کھڑی اس کی مصروفیت کو دیکھ رہی تھی۔ فرنچ فرائز تیار ہو چکے تھے۔ انوشہ نے ٹماٹر کاٹ کر پلیٹ سجائی اور درمیان میں خوش رنگ آلو رکھے۔ اور بھابھی کے کمرے میں چلی آئی۔

''یہ لو سجان چندا تمہارے فرنچ فرائز بنا کر لے آئی ہوں۔ اس میں چکن کا ذائقہ، لے جاؤ اپنے فرنچ فرائز میں نہیں کھاتا۔'' وہ انتہائی بدتمیزی سے بولا۔ مہوش لاتعلقی سے اسکرین پہ ناچتی ہیروئنوں میں مگن تھیں۔

''پلیز سجان کھا لو۔'' وہی عاجزانہ انداز جو سامنے والے کو خوامخواہ آسمان پہ چڑھا دیتا۔ سجان نے ہاتھ مار کر پلیٹ پرے کی۔ بھابھی نے مسکراتے طنزیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

'' ساری دنیا کے کام ہو جاتے ہیں اگر میرے بچے کچھ کہہ دیں تو یہ خوامخواہ کی مصروفیت دکھائیں گی۔ سجان عادتوں کا پتہ بھی ہے، کتنے لاڈ پیار میں پلا ہے، پورے سات سال انتظار کرنے کے بعد یہ مجھے ملا ہے۔''

انوشہ میں اب مزید یہاں کھڑے رہنے کی ہمت نہیں تھی۔ خود کو گھسیٹتی باہر آگئی۔

مہوش نے اس کے باہر نکلتے ہی جانے کس کونے سے میکڈونلڈ سے لایا گیا لنچ باکس برآمد کیا اور بڑے لاڈ سے سجان کے آگے رکھا۔ انوشہ کی لائی ہوئی پلیٹ انہوں نے اپنے آگے کرلی۔ سجان برگر پیپسی اور فرنچ فرائز دیکھ کر خوش ہوگیا۔

"شوہر کی لگام ان کے ہاتھ میں تھی اور دیور تو تھا ہی ان کا بے دام غلام آخر اپنی حسین وجمیل بہن سے سوسو جتن کر کے اس کی شادی جو کرائی تھی۔ مہوش کے والدین راضی ہی نہیں تھے۔ وہ تو ایک بیٹی دے کر افسردہ تھے سوچا کہ دوسری بھی اس جہنم میں جھونک دیتے۔ یہ ساری کوششیں اور ریاضت مہوش کی ہی تھی انہوں نے والدین کی ناراضی مول لے کر اس رشتے کی حمایت کی اور بالاخر حیدر کی ناؤ پار لگا کر ہی چھوڑی۔ اس دوران مہوش کی اپنے گھر والوں سے ناراضی چلتی رہی خدا خدا کر کے صلح ہوئی۔ حیدر ان کا شکریہ ادا کرتا نہ تھکتا جنہوں نے دیور کی خاطر ماں باپ کو ناراض کر دیا تھا، وہ اب ہمہ وقت مہوش کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگا رہتا۔ بڑے بھائی کی طرح وہ بھی انوشہ اور رملہ سے لاپرواہو چکا تھا۔ روشی کے حسن کے سحر سے بچ نکلنا آسان نہ تھا۔ یہ بھی اس کا احسان تھا کہ اس نے کئی امیر کبیر گھرانوں کے رشتے ٹھکرا کر حیدر سے شادی کی تھی۔ دن میں کئی بار وہ اس حقیقت کو حیدر کے سامنے متاثر کن انداز میں پیش کرتی اور حیدر ہوا بھرے غبارے کی طرح پھولتا جاتا کہ یہ اعزاز اس کے حصے میں آیا ہے۔ وہ پوری طرح روشی اور مہوش کے قبضے میں تھا۔

◈

مہوش چند دن کے لیے میکے گئی ہوئی تھیں مہوش زیادہ تر بچوں کو گھر چھوڑ کر ہی جاتی تھیں پیچھے انوشہ اور رملہ انہیں سنبھالتیں۔ ماں کے جانے کے بعد تو وہ اور بھی آزاد ہو جاتے۔ سجان تو ہاتھ میں نہیں آتا تھا۔ کسی کو خاطر میں نہ لانا اس کا وتیرہ بن چکا تھا یہی حال سمکی اور پنکی کا تھا۔

روشی اور حیدر کے دو بچے تھے۔ وہ ویسے بھی کم بچے خوشحال گھرانہ کے اصول پہ عمل پیرا تھے۔

"انوشہ بہت حساس ہوگئی تھی۔ ذرا ذرا سی بات کا موازنہ گزشتہ گزرے واقعات سے کرتی جب ابی جان زندہ تھے! دراماں کا ممتا بھرا وجود انہیں زمانے کے گرم وسرد سے بچائے ہوئے تھا۔"

"ان کی وفات کے بعد مہوش اور روشی پوری طرح مختار کل بن چکی تھیں۔ گھر سے پرانے اصول وقوانین رخصت ہوئے۔ مہوش نے سعد سے کہہ کر وی سی آر لے لیا تھا۔ سجان نے ضد کر کے کمپیوٹر بھی لے لیا۔ جوان ہوتے بچے اپنی مرضی کی ہر چیز سے کھل کر لطف اندوز ہو رہے

تھے اب کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں تھا۔

"ابی جان ان تمام چیزوں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ انہیں لغو اور شیطانی آلات قرار دیتے تھے۔ ان کے گھر میں صرف پی ٹی وی کے خاص خاص پروگرام ہی دیکھے جاتے تھے، رات عشاء کی نماز کے بعد وہ اسلامی کتب سے ایمان افروز واقعات پڑھ کر گھر والوں کو سناتے، دس بجے کے بعد سب ہو جاتے۔ اب پرانے اصولوں کو دقیانوسی کہہ کر پس پشت ڈال دیا گیا۔ اب مہوش کے اپنے اصول وضوابط تھے جن سے سرمو انحراف کرنا حیدر اور سعد کے لیے ناممکن تھا۔ رہ گئی انوشہ اور رملہ تو وہ کسی گنتی ہی میں نہ تھیں۔

مہوش دو دن کے بعد آئی تھیں۔ انوشہ پر بڑی مہربان تھیں۔

"آؤ تمہیں کچھ چیزیں دکھاؤں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آئیں۔ انہوں نے ایک ایک چیز اسے دکھائی جس میں ان کے کپڑے، بچوں کے ریڈی میڈ ملبوسات، سعد بھائی کے لیے قیمتی شوز، ایک عدد کرسٹل کا واٹر سیٹ، چھوٹی موٹی اشیاء اس کے علاوہ تھیں۔ انوشہ نے دل کھول کر تعریف کی۔

"پتہ ہے یہ سب امی نے دلایا ہے، سعد کا ہاتھ آج کل ذرا تنگ ہے ناں، تینوں بچے نئے کپڑوں کی ضد کر رہے تھے۔ امی نے پیسے دیے کہ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خرید لو۔" انہوں نے بتایا تو انوشہ کو نئے سرے سے بھابھی کے والدین پہ رشک آیا جب بھی میکے جاتیں واپسی پہ بھی خالی ہاتھ نہ آتیں۔

"بھئی۔ کھاتے پیتے خاندان سے تعلق ہے۔ میرے میکے میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ بیٹیوں کو دینے سے رزق اور بھی بڑھتا ہے میرے ابا اور امی ابھی تک میری ہر فرمائش پوری کرتے ہیں۔ مجال ہے جو کبھی انکار کریں۔ پتہ ہے سجان نے پینتالیس ہزار کا کمپیوٹر لیا ہے۔ یہ پیسے ابو نے دیے تھے نواسے نے فرمائش جو کی تھی۔" کافی دیر وہ بھابھی کے پاس بیٹھی ان کے میکے والوں کی سخاوت اور دریادلی کے قصے سنتی رہی جن میں حد درجہ مبالغہ آمیزی تھی۔ علیزا کے رونے کی آواز آئی تو اس کی جان چھوٹی۔

◈

علیزا دو سال کی ہونے والی تھی سارے گھر میں دوڑتی پھرتی تھی۔ انوشہ کے سر اس کے پیچھے پیچھے پھرتے رہنے کی اضافی ذمہ داری آگئی تھی۔ بے انتہا شریر بچی تھی وہ۔ کام کی

زیادتی کے سبب بے انتہا تھکی ہوتی ایسے میں اگر علیزا اس کے نزدیک آتی تو وہ ایک آدھ تھپڑ اسے جڑ ہی دیتی۔ بعد میں بیٹھ کر خوب روتی اور سوئی علیزا کے چہرے پہ پیار کرتی۔ ہر طلوع ہونے والا سورج اس کے لیے بہت سارے کام لے کر آتا۔ وہ گھن چکر بنی رہتی۔ ناشتا بنانے میں رملہ اس کی مدد کرتی بعد میں سارا دن وہ اکیلی ہوتی اور کاموں کے ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ اچھے وقتوں میں یہ گھر تعمیر ہوا تھا اچھا خاصا کشادہ اور وسیع تھا۔ ڈبل اسٹوری اس کی اضافی خوبی تھی اس کے علاوہ ایک انیکسی کے ساتھ گیسٹ روم حال ہی میں بنایا تھا یوں صفائی کرنے ہی میں اچھا خاصا وقت صرف ہوجاتا۔ سب سے زیادہ پھیلا وا ٹی وی لاؤنج، بچوں کے کمروں اور کچن میں ہوتا۔ سمیٹتے سمیٹتے وہ ہلکان ہوجاتی۔ اس دوران علیزا بھی جاگ جاتی۔ جوں جوں وہ بڑی ہورہی تھی تب سے اس نے انوشہ کی مصروفیات سے سمجھوتہ کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ کم ہی اسے تنگ کرتی۔ انوشہ، سمکی اور منابل کے مسترد شدہ کھلونے اس کے آگے رکھ دیتی تو وہ مگن ہوجاتی۔ انوشہ اطمینان سے اپنا کام کرتی۔

◉

سجان اور سمکی پنکی کے ساتھ روشی کے بچوں کی بھی اسکول سے چھٹیاں تھیں۔ اب وہ سب گھر میں دھما چوکڑی مچاتے۔ کسی کو منع کرنے کی جرات نہ ہوتی۔ علیزا بھی ان کے ساتھ شامل ہونے کی کوشش کرتی مگر سجان بڑی بے رحمی سے پیش آتا۔ انوشہ سے اور تو کچھ نہ ہوتا۔ ہر طرف سے خود کو بے یار و مددگار پاکر رونے بیٹھ جاتی۔ وہ کمزور سے دل کی مالک تھی بدمزگی بڑھ جانے کے خیال سے اس نے کبھی سعد بھائی سے بھی شکایت نہیں کی تھی۔ رہی مہوش بھابھی تو وہ بچہ ہے کہہ کر بات ٹال جاتیں۔

گھر میں خرابی مہوش کے بہو بن کر آنے کے بعد پیدا ہوئی۔ انہوں نے ڈھکے چھپے انداز میں سعد کی برین واشنگ شروع کردی۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وہ روشی اور حیدر کو قریب لائیں۔ حیدر پہلی نگاہ ہی میں روشی کے تیر نظر سے گھائل ہوگیا۔ اس سے شادی نہ ہونے کی صورت میں اس نے خودکشی کی دھمکی دے دی۔ ادھر روشی کے گھر والے بھی نہیں مان رہے تھے، آخرکار روشی بہو بن کر آہی گئی، رہی سہی کسر اس نے پوری کردی۔ ابی جان اور اماں کی آنکھیں بند ہوتے ہی وہ مالک و مختار بن گئیں۔ انوشہ کے لیے رشتہ بھی مہوش نے تلاش کیا اور جانے کون کون سی نادیدہ خوبیاں بیان کیں کہ حیدر اور سعد لڑکے کے پرجوش حامی بن گئے۔ بعد

کے مراحل خود بہ خود طے ہوتے گئے۔ انوشہ کو معمولی سا جہیز اور چند جوڑے کپڑے دے کر رخصت کردیا گیا کیونکہ لڑکے کا کہنا تھا کہ اسے جہیز نہیں چاہیے۔ مہوش نے بھی لڑکے کی ہاں میں ہاں ملائی، یوں سعد اس کی ضد کے آگے مجبور ہوگئے اور چاہتے ہوئے بھی بہن کے لیے کچھ نہ لے پائے حالانکہ ابی جان دونوں بیٹیوں کے لیے اچھا خاصا جمع جتھا چھوڑ گئے تھے۔ انوشہ اپنی قسمت پہ صابر و شاکر تھی۔

شادی کے بعد دولہا کے اوصاف و جوہر کھل کر سامنے آئے۔ موصوف غلط کاموں میں ملوث تھے۔ انوشہ کو باپ نے حلال کی روٹی کھلائی تھی۔ اس کے ضمیر کو یہ سب گوارا نہ تھا۔ وہ نوید سے کچھ کہتی تو وہ روئی کی طرح اسے دھن کر رکھ دیتا۔ سال کے اندر اندر علیزا بھی اس دنیا میں آگئی، نوید جن لوگوں کے لیے کام کرتا تھا۔ ان میں سے ایک شخص کیساتھ اس کی ٹھن گئی۔ سو نوید کو خاموشی کے ساتھ راستے سے ہٹا دیا گیا۔ اس کی لاش پہ انوشہ کے سوا رونے والا کوئی نہیں تھا نہ جانے نوید کون تھا، کہاں سے آیا تھا اس کے والدین یا دیگر رشتہ دار تھے بھی یا نہیں۔ یہ کسی کو بھی پتہ نہیں تھا ہاں البتہ ایک بار نوید نے انوشہ کے پوچھنے پہ اسے بتایا تھا کہ وہ کوئٹہ کے ایک قبائلی سردار کا بیٹا ہے۔ نسل در نسل دشمنی میں اس کے خاندان کے زیادہ تر مرد مارے جاچکے تھے۔ وہ اپنی جان بچا کر نکل آیا تھا۔ انوشہ کے گھر والوں میں سے کسی نے بھی نوید کے بارے میں زیادہ چھان بین نہیں کی تھی۔ مہوش کی تو بن آئی تھی کیونکہ نوید نے جہیز لینے سے انکار کردیا تھا۔

صحیح معنوں میں انوشہ کو اب بے سائباں ہونے کا احساس ہوا تھا۔

مہوش اور روشی اپنے فرائض سے جان کر پہلو تہی کرنے لگیں۔ تمام دن کی محنت کے بعد انوشہ کو یوں لگتا جیسے وہ سب کچھ بے سبب کر رہی ہے کیونکہ کبھی کوئی جھوٹے منہ اس سے ہمدردی نہیں کرتا تھا گویا وہ جو کچھ کر رہی تھی۔ یہ اس کا فرض تھا۔

◉

علیزا زور و شور سے رو رہی تھی۔ رملہ اسے لے کر گھر سے قریب پارک میں چلی آئی جہاں اس وقت اور بھی بہت سے بچے کھیل کود میں مگن تھے۔ علیزا اس کی گود سے اتر گئی۔ رملہ لوگوں کے جائزے میں مصروف ہوگئی یونہی اس کی نگاہ سامنے پڑی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا کیونکہ علیزا جس جھولے کے پاس کھڑی تھی، اب وہاں نہیں تھی، پریشانی کے عالم میں وہ بینچ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چاروں کونوں میں نگاہ دوڑائی۔ وہ کہیں نہیں تھی اس سے پہلے کہ وہ گھبرا کر

زور زور سے رونا شروع کر دیتی۔ علیزا کو ایک شخص اٹھائے ادھر ہی آتا دکھائی دیا۔ وہ دور ہی سے رملہ کی طرف اشارے کر کے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس نے بھاگ کر اس آدمی سے علیزا کو لیا اور آنکھوں میں آئے آنسو بمشکل پیچھے دھکیلے۔

''علیزا! کہاں چلی گئی تھیں تم۔؟''

''میں آپ کو بتاتا ہوں۔'' اس نووارد شخص نے شائستگی سے اس کی بات کاٹی۔

''میں پارک کے سامنے اس طرف اسٹیڈیم میں بیٹھا ہوا تھا کہ یہ بچی بھی اس طرف نکل آئی، میں نے سوچا، شاید اس کے والدین یہیں قریب ہی ہوں گے، اس لیے ادھر آ گیا۔ اس کیوٹ سی بے بی نے آپ کو دور سے ہی دیکھ کر اشارے کرنے شروع کر دیے تو میں سمجھ گیا آپ اس کے ساتھ ہیں۔'' وہ نفیس و مہذب سا شخص بڑے سلجھے ہوئے لہجے میں بتا رہا تھا۔ رملہ نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ علیزا اس سے چمٹی جا رہی تھی اور توتلی زبان میں جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ اس مہربان صورت آدمی نے جیب سے چاکلیٹ نکال کر علیزا کو دیں اور جھک کر اسے پیار کیا۔

''کیوٹ بے بی! کل پھر آنا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔'' اس نے جاتے جاتے علیزا کو یاد دہانی کرائی۔

❁

سعد اور حیدر کے سالے کی شادی کو چند دن ہی ہوئے تھے کہ انہوں نے نئے جوڑے کی دعوت کا پروگرام بنا ڈالا۔ حسب معمول انوشہ پہ سارے کام کا بوجھ تھا۔ کھانے پکانے میں وہ ویسے بھی ماہر تھی۔ دعوت کا سارا مینو اس نے خود ترتیب دیا تھا اور سب کی پسند کے آئیٹم شامل کیے تھے۔ عفان علیزا کو باہر لے گیا تاکہ وہ کام کرتی انوشہ کو تنگ نہ کرے روشی نے خود عفان سے کہا تھا کہ وہ علیزا کو گھمانے لے جائے۔ عفان اسے اٹھائے اپنی دھن میں محو آسمان پہ ڈولتی رنگ برنگی پتنگوں میں کھویا ہوا تھا جب تیمور حسن کی گاڑی سے ٹکرایا۔ علیزہ دھکا لگنے سے اُس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر دُور جا گری۔ خود عفان کا سر گاڑی کے بونٹ پہ لگا۔

ڈاکٹر آفتاب کا کلینک سامنے ہی تو تھا۔ تیمور نے دونوں کی بینڈ یج کرائی، علیزا کو وہ پہچان چکا تھا کہ یہ وہی بچی ہے جو پارک میں اسے ملی تھی۔ اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ عفان تو اس سے دوستی بھی کر چکا تھا۔

''بیٹے! آپ کا گھر کہاں ہے۔ مجھے گائیڈ کرو تاکہ میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔''

عفان فوراً راضی ہو گیا یہ پاس ہی تو تھا گھر۔ وہ خوش پوش اور شائستہ نوجوان جب علیزا کو اٹھائے اور عفان کی انگلی پکڑے گھر میں داخل ہوا تو روشی کی نگاہ سب سے پہلے اس پہ پڑی۔ ساتھ عفان تھا جس کے ماتھے پہ بینڈ یج تھی۔ اسے دیکھتے ہی روشی نے شور کرنا شروع کر دیا۔ اس کے واویلا پر تیمور حسن گھبرا گیا ایسی صورت حال کا اس نے تصور تک نہ کیا تھا۔ حیدر، سعد اور دوسرے بھی اس شور شرابے پر باہر نکل آئے۔ انوشہ نے علیزا کی ٹانگ پر بینڈ یج دیکھی تو دل پہ ہاتھ رکھ کر وہیں ڈھے سی گئی۔ حیدر نے شور کرتی روشی کو بمشکل چپ کرایا۔ تیمور بے چارا خجل سا کھڑا تھا حیدر اسے اندر لے گیا۔ اس کی قیمتی گاڑی لباس اور رکھ رکھاؤ سے مہوش سمیت دوسرے بھی متاثر دکھائی دے رہے تھے۔

حیدر نے تیمور کو رات کا کھانا کھا کر ہی جانے دیا۔ سعد کو بھی تیمور بہت اچھا لگا تھا، پہلی ملاقات ہی میں اس نے سادگی سے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ مہوش اس کے کاروبار کی تفصیل سن کر بڑی متاثر ہوئی۔

تیمور اکثر ان کے گھر آنے لگا۔ وہ بھی اس کے گھر جاتے تھے اب تو وہ اس کے بارے میں سب کچھ جان چکے تھے۔ تیمور کا اپنا بزنس تھا۔ والدین حیات نہیں تھے۔ بس ایک بڑا بھائی تھا جو جرمنی میں مقیم تھا۔ بہن کوئی تھی نہیں۔ وہ یہاں اپنا بزنس کر رہا تھا جو ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ ابھی تک تیمور غیر شادی شدہ تھا۔ یہ اس کا ایک اور پلس پوائنٹ تھا۔ وہ آتا تو اس کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جاتی۔ بڑے سے لے کر چھوٹے تک اسے کمپنی دیتے۔ علیزا تیمور کے ساتھ بہت مانوس ہو گئی تھی اگر ایک دو دن وہ نہ آتا تو وہ اپنے توتلے لہجے میں کہتی ''تیمور انکل نہیں آئے'' رملہ اور انوشہ کم ہی تیمور کے سامنے جاتیں۔ اپی جان اور اماں کی دی گئی تربیت کا اثر تھا جو وہ ابھی تک نہیں بھولی تھیں۔

تیمور نے اپنے نئے گھر میں شفٹ ہونے کی خوشی میں پارٹی دی تو ان سب کو بھی بڑے اصرار سے مدعو کیا اور علیزا کو تو خاص طور پر لانے کو کہا تھا۔ جوش و خروش سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ روشی اور مہوش نے پارلر سے فیشل، مساج، تھریڈنگ اور جانے کیا کیا کروایا جس پہ اچھے خاصے پیسے خرچ ہو گئے تھے مگر شکل بھی نکھر آئی تھی۔ اب کپڑوں کا مسئلہ تھا۔ وہ مہنگے بوتیک سے خریدے گئے۔ رملہ تو بہت ہنسی تھی۔

سعد بھائی نے انوشہ اور رملہ کو بھی جانے کو کہا تو انہیں بھی رضامندی دینی پڑی۔

انوشہ تو عرصہ دراز سے اس طرح کی محفلوں سے کنارہ کش ہوگئی تھی۔ بھائی کے کہنے کی وجہ سے وہ جانے پہ تیار ہوئی۔ مہوش بڑی جزبز ہوئیں کیونکہ ان دونوں کے پاس ڈھنگ کے کپڑے ہی نہیں تھے۔ انوشہ تو اپنے حال میں مگن رہتی تھی۔ اسے اچھے کپڑوں کا شوق رہا ہی نہیں تھا۔ رہ گئی رملہ تو اس کے پاس کپڑے تو تھے مگر مہوش کے نقطہ نگاہ سے وہ کسی اعلیٰ تقریب میں پہننے کے لائق نہیں تھے۔ چنانچہ از سرنو بازار جا کر مہوش ان دونوں کے لیے کپڑے لائیں تا کہ تیمور حسن کے سامنے سبکی نہ ہو، آخر کو تھیں تو ان کی نندیں۔ وہ چاہے بھی تو اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتی تھیں۔

تیمور حسن کا گھر بڑا خوب صورت اور ویل ڈیکوریٹڈ تھا، خاصے وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا بنانے والے ہاتھوں نے تمام تر مہارت اسے خوب صورت دکھانے پہ صرف کردی ہے۔ سب لوگ متاثر دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں مرعوبیت وستائش تھی۔ ایک ایک چیز پہ تبصرے ہو رہے تھے۔ تیمور نے چند گنے چنے مہمانوں کو مدعو کیا تھا۔ مہوش اور روشی نے اپنی الگ ٹولی بنالی تھی جبکہ رملہ کو اپنی ہم عمر زری مل گئی تھی۔ انوشہ بے توجہی سے ہنستے مسکراتے بے فکر خوش باش لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ بیرے وقفے وقفے سے کھانے پینے کی مختلف اشیاء سرو کر رہے تھے۔ ڈنر کا انتظام اندر ہال میں کیا گیا تھا۔ انوشہ نے ایک پلیٹ میں کباب اور تھوڑا سا قورمہ نکالا۔

اس سے یہ بھی نہیں کھایا جا رہا تھا عجیب اجنبیت محسوس ہو رہی تھی جبکہ باقی مہمان خاصی بے تکلفی سے کھا پی رہے تھے۔ تیمور تمام مہمانوں کا جائزہ لیتا ہوا اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

''کچھ اور بھی لیں ناں، آپ کی پلیٹ تو تقریباً خالی ہے، لگتا ہے کھانا پینے سے بھی آپ کو زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ آپ بہت سادہ ہیں، آپ اچھی ہیں تو اچھا لگنا چاہیے۔'' وہ انوشہ کے سادہ و پرکار روپ کا جائزہ لیتے ہوئے آہستگی سے بولا پھر اس کے چہرے پر پھیلتی ناگواری دیکھ کر وہاں سے ہٹ گیا۔ انوشہ اس کی گفتگو سے پہلے تو بوکھلائی پھر اسے غصہ آگیا اسے مزید کھانا کھایا ہی نہیں گیا۔ کیا لگتا تھا وہ اس کا جو اتنے مزے سے مشورہ دے کر چلتا بنا تھا۔ ناگواری کے احساس سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ابی جان کی موجودگی میں اس نے کبھی ایسی کسی تقریب میں شرکت نہیں کی تھی نہ کسی مرد کو برملا یوں کھلم کھلا اس پہ تبصرہ کرنے کی جرات ہوئی تھی۔ ابی جان کہتے تھے، عورت کو اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ مرد کو بری نگاہ ڈالنے کی اور بے تکلفی برتنے کی ہمت

ہی نہ ہو تو کیا اس کے رویے یا کردار میں کوئی جھول یا ہلکا پن آگیا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اپنے گھر میں اس نے کبھی تیمور سے دانستہ بے تکلفانہ گفتگو کی ہو یا سلام کرنے سے زیادہ اس کی زبان سے کوئی اور لفظ تیمور کے روبرو اس کی زبان سے نکلا ہو۔

اسے ابھی تک یاد تھا جب مدت کے بعد اس نے ہلکے پیلے رنگ کا سفید اور کالی کڑھائی والا سوٹ پہنا تو بھابھی نے کیا کیا کہا تھا۔

''انوشہ! تم بیوہ ہو۔ اس طرح کے چونچلے اب تم پہ سجتے نہیں ہیں اگر یہ رنگ ڈھنگ رکھے تو تمہارے بھائیوں کے نام پر دھبہ لگے گا۔ سادگی سے رہو، نگاہیں نیچی رکھو۔''

بھابھی کے جملوں نے اسے اندر تک چھید ڈالا تھا۔ اس نے اب تک بڑی صاف ستھری زندگی گزاری تھی۔ جانے انہوں نے اس کے کون سے رنگ ڈھنگ دیکھے تھے۔ بھائیوں کی عزت پہ وہ حرف لانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس دن کے بعد سے اس نے کبھی شوخ کلر کے کپڑوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ ایسے تمام شوق اس نے زندہ اپنے دل میں دفن کر لیے۔ بھابھی ہنسی ہنسی میں بڑی دلخراش جملے کہہ جاتی تھیں۔

تیمور حسن کے بارے میں انوشہ کی رائے خراب ہوگئی تھی۔ عورتوں سے گفتگو کے بہانے ڈھونڈنے والے مرد اسے کبھی اچھے نہیں لگتے تھے تیمور حسن اسے اسی قبیلے کا نظر آرہا تھا۔ پر علیزا اسے بہت پسند کرتی تھی توتلے لہجے میں جب وہ اسے تیمول انکل کہتی تو وہ بے اختیار اسے خود سے لپٹا کر چوم لیتا۔ شکل تو تھی ہی پیاری، اس پہ باتیں اتنی دل موہ لینے والی کرتی کہ مخاطب کے دل میں اس ننھی سی گڑیا کے لیے صرف پیار کا جذبہ ہی اُمڈتا۔

''انوشہ اب اس کی آمد پہ علیزا کو دانستہ اِدھر اُدھر کر دیتی مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی، جانے اسے کیسے تیمور کی آمد کی خبر ہو جاتی۔ وہ جب بھی آتا علیزا کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لاتا۔ اس روز بھی وہ اس کے لیے چاکلیٹس لالی پاپ اور سپر کرسپ کے کئی پیکٹس لایا تھا جب علیزا کو دیے تو وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

''مما تہتی ہیں آپ دندے ہیں۔'' (مما کہتی ہیں' آپ گندے ہیں) ڈرائنگ روم میں موجود تمام افراد چونک گئے سعد اور حیدر کو بہت غصہ آیا۔ سعد تیمور کے ساتھ پارٹنر شپ کا خواب دیکھ رہے تھے اور یہ انوشہ سب کچھ خراب کرنے پہ تلی ہوئی تھی۔

انہوں نے انوشہ کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے لی تھی اس بات پر کہ اس نے تیمور میں کون

سی برائی دیکھی ہے جو بچی کو منع کیا ہے۔

دوپہر گزر چکی تھی۔ روشی مہوش کے میں کمرے میں تھی دونوں آہستہ آہستہ باتیں کررہی تھیں۔

''اب رملہ بھی شادی کے لائق ہوگئی ہے۔'' مہوش یوں بولیں جیسے انہیں رملہ کی شادی کی بڑی فکر ہے۔ روشی نے ان کی تائید کے ساتھ ایک نیا رخ بھی دکھانے کی کوشش کی۔

''ہاں آپا! آپ ٹھیک کہتی ہیں مگر اب ایسا رشتہ دیکھنا چاہیے جو تمام عمر رملہ کو گھر بٹھا کر رکھے۔ ایسا نہ ہوا انوشہ کی طرح پھر ہمارے سینے پہ مونگ دلنے آجائے۔''

''اس کا بندوبست بھی ہوجائے گا۔ اپنے فیاض بھٹی ہیں ناں۔ انہیں آج کل ایک شریک حیات کی ضرورت ہے بس عمر میں بارہ چودہ سال بڑا ہے تو کیا ہوا۔ پیسے والا ہے۔ رملہ راج کرے گی راج، رہ گئی انوشہ تو وہ ادھر ہی ٹھیک ہے، اب کون اسے پوچھے گا۔ ایک بچی کا بھی ساتھ ہے آج کل تو کنواری لڑکیوں کو اچھے رشتے نہیں ملتے ہیں، وہ تو پھر ایک شوہر کو مٹی کے سپرد کر چکی ہے ورنہ کسی سے کہہ سن کر بات چلانے کی کوشش کرتی۔'' مہوش نے اپنے چہرے پہ مصنوعی سنجیدگی وافسردگی طاری کرلی۔ جیسے اس دنیا میں ان سے بڑھ کر انوشہ کا کوئی ہمدرد ہی نہ ہو۔

''ویسے آپا انوشہ کی وجہ سے ہمیں گھر کی طرف سے بہت بے فکری ہے کوئی پرابلم نہیں ہے۔ تو ہم نے بھی اسے پھولوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔ اچھا کھاتی، اچھا پہنتی ہے، سب سے بڑھ کر اپنی مرضی سے جو چاہے کرتی ہے۔ دوسری شادی کی صورت میں اسے یہ سکھ نہیں ملیں گی۔'' روشی کی یہ بات اگر رملہ سن لیتی تو ضرور لڑائی ہوجاتی۔ مبالغہ آمیزی کی انتہا تھی اور رملہ سے ایسی باتیں برداشت نہیں ہوتی تھیں۔

سجان کے اسکول سے شکایت آئی تھی کہ وہ اپنے ہم عمر لڑکے لڑکیوں اور دوسروں بچوں کے ساتھ مار پیٹ کرتا ہے۔ سعد مری گئے تھے، جہاں سجان کے پرنسپل نے انہیں بلوایا تھا۔ واپسی پہ سعد بہت پریشان تھے کیونکہ پرنسپل نے صاف صاف وارننگ دی تھی اگر سجان نے آئندہ ایسی حرکت کی تو اسے اسکول سے نکال دیا جائے گا کیونکہ یہاں متمول خاندانوں کے بچے پڑھتے تھے۔

پرنسپل نے سعد سے کہا تھا کہ سجان بے حد تشدد پسند ہے، انہوں نے بڑے خلوص سے

انہیں ایک مشہور سائیکاٹرسٹ کا پتہ بھی دیا تھا اور سجان پہ کڑی نگاہ رکھنے کو کہا تھا۔

انوشہ کھانے کے برتن دھو کر کچن سمیٹ رہی تھی۔ علیزا ابھی ابھی سوئی تھی۔ اس نے اس وقت کو غنیمت جانا تھا کیونکہ رات کے لیے کبابوں کا مسالا بھی تیار کرنا تھا اور چنا چاٹ بنانے کے لیے چنے ابالنے تھے۔ کباب بنا کر اس نے ٹرے میں پھیلا کر انہیں فریج میں رکھ دیا۔ لگے ہاتھوں آٹا بھی گوندھ لیا۔ عین اسی وقت ڈوربیل بجی۔ ساڑھے تین بج رہے تھے آرام کا وقت تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں محو استراحت تھے، جانے اس وقت کون آ گیا تھا۔

اس نے گیٹ کھولا۔ تیمور حسن اپنے پروقار سراپے اور مسکراتی نگاہوں سمیت سراپا انتظار تھا۔ انوشہ نے اس پہ نگاہ ڈالنے سے گریز کرتے ہوئے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اس نے اے سی آن کیا اور باہر نکلنے لگی تو تیمور حسن اس کے راستے میں حائل ہوگیا۔

''مجھے بھابھی کے سامنے بات نہیں کرنی ہے ورنہ اس وقت آپ کو پریشان نہ کرتا۔ پلیز بیٹھ جائیں۔ میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' وہ شائستگی سے بولا پر وہ کھڑی رہی۔ بے اعتباری کی تحریر اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اسے ہر لحظہ کسی کے آنے کا دھڑکا سا لگا تھا۔

''انوشہ! میں گھماؤ پھراؤ کا قائل نہیں ہوں نہ کسی کو دھوکا دینا میری سرشت میں ہے۔ صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کے بارے میں میرے محسوسات اب ایک واضح صورت اختیار کرگئے ہیں۔ میں انہیں ایک پائیدار تعلق میں بدلنا چاہتا ہوں۔ آپ اور علیزا کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کا بھی مجھے بہت افسوس ہے۔ یہ بھی میرے علم میں ہے کہ آپ کو اس گھر میں پالتو جانور سے بھی کم حیثیت دی جاتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کی تمام تکلیفوں کو راحتوں سے بدل دوں۔ انوشہ! میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ اس کے تمام انکشافات آنکھیں پھاڑے منہ کھولے حیرت سے سن رہی تھی۔

''میں پھر آؤں گا۔ تب تک آپ اچھی طرح سے سوچ لیں۔ اور ہاں، اب بے شک بھابھی کو بلا لائیں اگر سعد گھر میں ہے تو اسے بھی بتادیں کہ تیمور حسن ڈرائنگ روم میں انتظار کررہا ہے۔'' وہ الٹے قدموں باہر نکلی اور مہوش بھابھی کو اٹھایا۔ اتنے میں سعد بھائی بھی آگئے۔ وہ مشروب کے ساتھ دیگر لوازمات ڈرائنگ روم میں بھجوا کر کمرے میں آگئی جہاں رملہ علیزا کے ساتھ بے خبری کی نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ وہ بھی ایک کرسی پہ جا کر بیٹھ گئی۔ یوں لگ رہا

تھا۔تمام اعصاب بے کار ہوگئے ہیں ہاتھ پاؤں میں ابھی تک لرزش تھی۔نوید کی موت کے بعد کسی نے پہلی مرتبہ یوں بے دھڑک اپنی چاہت کا اظہار کیا تھا اور ایک بیٹی کی ماں ہونے کے باوجود جھٹ پروپوز بھی کرڈالا تھا۔

◉

گیارہ بج گئے تھے۔نیند انوشہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، رملہ نے غیر محسوس سے انداز میں اس کا چہرہ جانچا اور کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔

''آپی! کوئی بات آپ کو ڈسٹرب کررہی ہے ناں، دن کو بھی آپ نے مجھے نہیں بتایا۔ وہ پریشانی ابھی تک آپ کے چہرے پہ موجود ہے۔'' وہ اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے رسان سے بولی تو انوشہ کچھ دیر ذہن میں الفاظ کو ترتیب دیتی رہی پھر بولی تو اٹک اٹک کر۔

''رملہ۔وہ تیمور حسن ہے ناں۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی جیسے سوچ رہی ہو۔اب آگے کیا کہے پھر وہ آہستہ آہستہ جھکی نگاہوں کے ساتھ رک رک کر اسے بتاتی چلی گئی۔

''آپی، یہ تو بہت اچھی بات ہے اس وقت آپ کے حق میں یہی بہتر ہے حالات جس نہج پہ جارہے ہیں اور جو گھر والوں کا رویہ ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہ اقدام انتہائی مناسب ہے۔بھائیوں کی بے حسی آپ نے ملاحظہ کرلی ہے ان سے توقع رکھنا عبث ہے۔نوید بھائی اتنے مثالی شوہر نہیں تھے کہ آپ ان کی یاد میں جوگ لے لیں۔پھر تیمور صاحب اچھے انسان دکھائی دیتے ہیں۔وہ بھلا آپ سے کیا فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں اگر ان کے ذہن میں کوئی ٹیڑھ ہوتی تو وہ آپ کو پروپوز نہ کرتے۔ان کا رویہ ایک شریف انسان کا ہے۔خوشیاں بار بار دروازے پر دستک نہیں دیتیں۔وقت ضائع مت کریں۔'' وہ کسی عمر رسیدہ تجربہ کار بزرگ کی طرح اسے سمجھا رہی تھی۔

''رملہ علیزا کا کیا بنے گا۔باپ کے سائے سے تو پہلے ہی محروم ہے۔کیا میں جیتے جی اسے ماں سے بھی محروم کردوں۔''

''وہ کیوں آپ سے محروم ہونے لگی۔تیمور بھائی ایسے لگتے تو نہیں ہیں کہ آپ ماں بیٹی کو الگ کردیں۔علیزا سے وہ اتنا پیار کرتے ہیں، وہ بھی ان سے اتنی مانوس ہوگئی ہے۔یقیناً انہوں نے سوچ سمجھ کر یہ بات کی ہوگی۔میرا خیال ہے علیزا جیسی پیاری بچی کو تیمور حسن بخوشی اپنے پاس رکھیں گے آپ خوامخواہ اندیشوں کو دل میں جگہ مت دیں۔اوپر والا بہتر ہی کرے گا

اب اگر تیمور آپ سے جواب مانگیں تو آپ بھائی سے بات کرنے کو کہیں۔دنیا والوں کو زبانوں کا مت خیال کریں۔آپ کے سامنے بہت لمبا سفر ہے، آپ چاہے کتنی ہی پاک صاف کیوں نہ ہوں۔ہمارے اردگرد رہنے والے آپ کے ہر عمل کو غور سے دیکھتے ہے۔آپ ہنسیں کیوں؟ آپ نے بال کیوں بنائے؟ آپ نے فلاں رنگ کے کپڑے کیوں پہنے؟ آپی آپ جیسی لڑکی کا جینا ایسا ہی ہے جیسے ہر قدم تنی ہوئی رسی پہ چلنا پڑے آپ کے ساتھ ایک مرد کا نام وابستہ ہونا اس وقت بہت ضروری ہے۔گھر سے باہر کیوں جائیں، کبھی مہوش اور روشی بھابھی کے رویے پہ غور کیا ہے۔وہ کیسی کیسی باتیں کرتی ہیں مجھے تو دہراتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، خون کھولتا ہے۔آپ تیمور حسن کے پروپوزل پہ آنکھ بند کرکے ہاں کردیں، آپ کو ایک نام، ایک تحفظ مل جائے گا۔''

وہ جذب سے بولتی بڑے خلوص سے اس کے ہاتھ کو تھپک رہی تھی۔اس کے لمس اور لہجے میں محبت کا ایسا احساس تھا جو رگ وپے میں سرائیت کرکے اس سرشار کرگیا۔وہ بڑے سکون سے سوئی۔رملہ نے اس کے ذہن سے ہر خوف وخدشے کو مٹادیا تھا۔

◉

''ہماری ناک تلے یہ عشق وعاشقی کے کھیل کھیلے جاتے رہے اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔'' مہوش قصداً اونچی آواز میں روشی سے باتیں کررہی تھیں تاکہ کچن میں مصروف عمل انوشہ بھی سن لے۔تیمور نے بڑے سلیقے وسبھاؤ سے بات کی تھی اور جلی بھنی مہوش نے اسے عشق کے معنی پہنادیے تھے۔انوشہ جیسی مختی اور دبو نند انہیں اپنے قبضے سے باہر ہوتی محسوس ہورہی تھی۔

''تیمور حسن نے سعد سے انوشہ صاحبہ کے رشتے کی بات کی ہے۔کتنا بے حیا شخص ہے۔خود اپنے منہ سے کس بے شرمی سے بات کی اور کہا کہ جلد ہی وہ اپنے بڑوں کو لارہا ہے۔لو پہلے خود بات کی، بعد میں بڑوں کا کہا۔میں جانتی ہوں۔تیمور حسن کو کس نے اتنی ہمت دلائی ہے کہ وہ براہ راست اپنا رشتہ پیش کر بیٹھا۔سچ پوچھو تو مجھے تیمور کوئی اچھا آدمی نہیں لگتا۔مشکوک سی حرکتیں ہیں۔پھر ہماری انوشہ اب اکیلی نہیں ہے۔ایک بیٹی کا ساتھ ہے۔کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو روتی پھرے گی، ہماری نند ہے۔بھاری نہیں ہے کوئی ہمیں۔میں سعد سے کہہ کر انکار کرادوں گی۔'' وہ حتمی لہجے میں بولیں تو روشی نے بھی ان کی تائید کی۔اندر کیک بیک کرتی انوشہ کا رنگ تیمور کے ذکر پر زرد پڑگیا تھا۔دراصل مہوش اور روشی کو تیمور اپنی چوتھے نمبر والی بہن شمع کے لیے دل وجان سے پسند آگیا تھا۔اب تیمور نے انوشہ کے لیے پروپوزل دیا تو انہیں شدید

دھچکا لگا۔ ان کی امی ویسے بھی شمع کی طرف سے بہت پریشان تھیں اٹھائیس سال کی عمر ہوگئی تھی۔ ابھی تک کوئی رشتہ نہ آیا تھا۔

اس کی زبان درازی اور جھگڑالو فطرت سے سب خائف تھے۔ اپنے آگے وہ کسی کو کچھ گردانتی ہی نہیں تھی۔ خاندان والے تو اسے پوچھنے تک کے بھی روادار نہ تھے اور جو کوئی باہر سے قسمت کا مارا بھولا بھٹکا آ بھی جاتا تو آگاہ ہو کر دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرتا۔ مہوش اور روشی کی مثالیں بھی تو سامنے تھیں پھر شمع کو آئے روز جونت نئی محبتیں لاحق رہتی تھیں۔ اس سے بھی اس کی ریپوٹیشن پہ اثر پڑا تھا۔ اسے ایسا شوہر چاہیے تھا جو اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتا، مہوش تیمور کی نرم مزاجی اور مہذب رویے سے اسے شمع کے لیے سو فی صد پسند کر چکی تھیں۔ شمع کو ایسا دبو شخص ہی تو چاہیے تھا جس کی آواز پہ اس کی آواز حاوی رہے۔ مہوش نے سعد کے سامنے انوشہ کا نام لے کر انکار کر دیا اور جذباتی دل پذیر تقریر بھی کر ڈالی۔ سعد نے بہن سے پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ آخر تیمور میں کیا کمی ہے جو تم نے انکار کر دیا ہے۔ سعد کی عقل تو مہوش نے سلب کی ہوئی تھی۔ تیمور کو اس انکار سے بہت دکھ ہوا تھا۔ اس واقعے کے بعد بھی وہ معمول کے مطابق ان کے گھر آتا رہا کیونکہ اسے یہ بتایا گیا تھا، یہ انکار انوشہ کی طرف سے ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ انوشہ کو یہ انکار واپس لینے پہ مجبور کر دے گا۔

ادھر مہوش نے شمع کو بھی بلوالیا۔ وہ پرانے طور طریقے گھر چھوڑ آئی تھی۔ تیمور کی بڑھ بڑھ کر خاطریں کرتی۔ مہوش کی ہدایت کی وجہ سے وہ بہت نرم اور میٹھی زبان کی مالک بنی ہوئی تھی۔ زبان کی تیز دھار کہیں چھپا آئی تھی رملہ حیران تھی کہ سعد بھائی نے تیمور حسن کو انکار کر دیا ہے۔ کیوں کیا ہے؟ یہ جواب وہ ڈھونڈنے کی سعی کر رہی تھی۔

مری سے سجان کے پرنسپل نے پھر سعد کو کال کیا تھا۔ وہ بہت پریشانی کے عالم میں گئے۔ مہوش کو کس متوقع جھگڑے کے خیال سے انہوں نے کچھ نہیں بتایا ان سے بعید نہیں تھا ان کے ساتھ چلنے کی وہ بھی ضد کرتیں۔ پرنسپل احمد خورشید جواد بہت ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے مگر اس وقت بہت غصے میں تھے سعد سر جھکائے سن رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار انہیں مہوش پہ بہت غصہ آیا۔ سجان جو کچھ کر رہا تھا۔ اس کی جو ایکٹویٹیز تھیں۔ وہ ضرور ماں ہونے کے ناتے مہوش کے علم میں رہی تھیں اگر اسے شروع سے ہی پتہ چل جاتا تو وہ طوفان کے آنے سے پہلے

ہی کوئی حفاظتی تدابیر اختیار کر لیتے۔

سجان نے اس بار تو ان کا دل دہلانے میں کوئی سر نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے کلاس فورتھ کی طالبہ یسریٰ رحمان کو اسکول میں بنے حوض میں دھکا دے دیا۔ اس نے اس پہ بس نہیں کیا بلکہ اس کا سر پکڑ کر اس وقت تک فرش سے ٹکراتا رہا جب تک کہ حوض کا پانی اس کے سر سے نکلنے والے خون سے سرخ نہ ہو گیا۔ اسی وقت ایک دوسرے طالب علم نے دیکھ لیا اور شور مچا دیا ورنہ یسریٰ رحمان کو یقیناً زندگی سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ اس وقت بھی وہ ہاسپٹل میں تھی۔ اس کے ماں باپ اور خاندان کے دیگر افراد بہت غصے میں تھے۔ رحمان خاصی اپروچ والا شخص تھا۔ سعد نے تیمور کو بیچ میں ڈال کر بمشکل اپنی جان چھڑائی۔

سعد سجان کو لے کر گھر آ گئے کیونکہ اسکول سے اس کا نام خارج کر دیا گیا تھا۔ مہوش نے یوں ظاہر کیا جیسے یہ خاص بات نہ ہو۔

رملہ دھڑکتے دل کے ساتھ ڈور بیل بجا کر اندر سے کسی کے برآمد ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دعا کر رہی تھی۔ تیمور حسن گھر پہ ہی ہو۔ اس نے صدق دل سے دعا مانگی تھی تب ہی تو تیمور مل گیا تھا وہ رملہ کو دیکھ کر خوش گوار حیرت سے دوچار ہوا۔

اشرف کو چائے سمیت دیگر لوازمات لانے کا کہہ کر وہ رملہ کو ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ کافی دیر خاموشی چھائی رہی بالآخر تیمور نے ہی توڑا۔

''ہاں بھئی رملہ آج کیسے ادھر کا راستہ بھول گئیں جبکہ آپ کی بہن نے تو اس طرف آنے کے تمام راستے بند کر دیے ہیں۔'' وہ آرام سے شکوہ کر گیا تو رملہ کو بات کرنی آسان ہو گئی۔

''تیمور صاحب! آپ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''ایسی ہی بات ہے ورنہ انوشہ کی طرف سے اتنا صاف انکار سننے کو نہ ملتا۔''

''مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے، آپ کی مہوش اور روشی بھابھی سے بات ہوتی رہی ہے۔ یقیناً انہوں نے ہی کہا ہوگا کہ انوشہ ایسا نہیں چاہتی۔ بھائی سے بھی یہی کہلوایا گیا ہوگا۔'' وہ غضب کی قافیہ شناس تھی۔

''ہاں، بالکل یہی بات ہے بلکہ مہوش بھابھی نے کوئی اور چکر بھی چلایا ہوا ہے۔ کئی بار اشارتاً مجھ سے اپنی بہن شمع کے لیے کہہ چکی ہیں۔ میں اب سب کچھ سمجھ چکا ہوں۔ تھینک یو

رملہ! آپ مجھے تیمور صاحب نہیں بلکہ تیمور بھائی کہیں۔ میں اب بہتر طریقے سے اپنا کیس پیش کر سکوں گا۔'' وہ ہلکا پھلکا ہو گیا۔

''ویسے آپ انوشہ سے زیادہ ذہین ہیں، بہادر ہیں۔ تھوڑی سی عقل انہیں بھی دے دیں۔ انوشہ کو اس کی شدید ضرورت ہے۔ کمال ہے اپنا ذہن استعمال ہی نہیں کرتیں۔'' رملہ مسکرا دی۔

''میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ سعد بھائی سے بات کریں اور ہاں میری یہاں آمد کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ اب مجھے اجازت دیں۔'' وہ بیگ کندھے پہ ڈال کر جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ تیمور نے اسے ڈراپ کرنے کی آفر کی جو اس نے سلیقے سے ٹال دی۔

***

مہوش کی سب سے بڑی بہن ارسلا آئی ہوئی تھیں۔ اپنی چھوٹی بہنوں کے برعکس وہ بہت مختلف اور پسندیدہ عادت کی مالک تھیں۔ انوشہ کو تو وہ بہت اچھی لگتی تھیں۔ مہوش اور روشی کے برعکس وہ نمود و نمائش اور حسد جیسے جذبوں سے دور تھیں۔ مہوش اور روشی دونوں بازار گئی ہوئی تھیں۔ انوشہ ان کی خاطر مدارات میں مصروف تھی۔ ارسلا بھی اس کے پیچھے آ گئیں اور اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود اس کا ہاتھ بٹانے لگیں۔

''توبہ ہے انوشہ! تم کیسے اتنا کام کر لیتی ہو۔'' وہ ان کے سادہ سے ریمارک پہ ہنس دی۔ ارسلا نے خود ہی اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا۔

''میں اپنی سب سے بڑی بیٹی کی منگنی کر رہی ہوں، آج کل ہاتھ ذرا تنگ ہے۔ سوچا مہوش اور روشی سے کہوں اللہ نے اتنا کچھ دے رکھا ہے اماں کی مدد بھی کرتی رہتی ہیں۔ ابھی دو ماہ پہلے ہی تو مہوش نے عبید کو ڈیڑھ لاکھ روپے دیے ہیں۔ سونیا کو وی سی آر اور چھوٹی کو بائیسکل روشی نے دلائی ہے۔ میرے بھائی عبید کا تو تمہیں پتہ ہی ہے کام وام تو کرتا نہیں ہے۔ ابا بھی ریٹائرڈ ہو گئے ہیں اور پنشن و بچت سرٹیفکیٹ سے کہاں پوری پڑتی ہے۔ اوپر سے اکرام کی شادی بھی کر دی ہے۔ کافی حد تک تو مہوش اور روشی نے بھرم رکھا ہوا ہے۔''

وہ اپنی سادگی میں تمام بھید ایک ایک کر کے کھول رہی تھیں۔ اگر مہوش ہوتیں تو یقیناً انہیں کچا چبا ڈالتیں۔ وہ بالکل بھی تو ان کی بہن نہیں لگتی تھیں۔ انوشہ کو آج علم ہوا کہ مہوش بھابھی جو واپسی پہ لدی پھندی آتی ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔ سعد سارا پیسہ بیوی کے پاس رکھواتے تھے جب ضرورت ہوتی تو لے لیتے ان کا کام اس نوعیت کا تھا کہ وہ روز روز بنک سے پیسہ نکلوانا

افورڈ نہیں کر سکتے تھے، ان کے کاروبار میں کیش کی اہمیت تھی۔ اس لیے مہوش کے پاس ہر وقت ٹھیک ٹھاک رقم موجود رہتی تھی۔ انہوں نے کبھی حساب کتاب نہیں کیا اور نہ کبھی اس کی ضرورت محسوس کی وہ مہوش پہ اندھا اعتماد کرتے تھے ان کے اس اعتماد کا مہوش نے خوب صلہ دیا تھا۔

انوشہ کو بہت دکھ ہو رہا تھا۔ علیزا ذرا ذرا سی چیزوں کی خاطر کتنا ترستی تھی مہوش نے اسے تو کبھی ایک روپیہ بھی نہیں پکڑایا تھا۔ اپنے میکے والوں کا گھر وہ کس فراخدلی سے بھر رہی تھیں گویا آنکھوں میں دھول جھونکی جا رہی تھی۔ انوشہ نے سعد اور حیدر بھائی سے بذات خود کبھی اپنی زبان سے ضرورت کا سوال نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ رقم اس کے ہاتھ میں پکڑا دیتے تو ٹھیک ورنہ وہ عزت نفس کی ماری کہاں انہیں بتانے والی تھی کہ اسے بھی پیسے چاہئیں۔ ارسلا شام کو اپنے گھر گئیں جب بازار سے روشی اور مہوش کی آمد ہوئی۔ جاتے وقت ان کے چہرے پہ جو مسکراہٹ و سکون تھا اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ناکام نہیں لوٹی ہیں۔

***

مہوش پریشانی کے عالم میں سر پکڑے بیٹھی ہوئی تھیں، انہیں ابھی تک اپنی سماعتوں پہ اعتبار نہیں آیا تھا کہ جو کچھ سنا ہے۔ آیا وہ سچ ہے بھی کہ نہیں۔ سعد اپنی بات آرام سے مکمل کر کے اب ان کے تاثرات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہیں زندگی میں شاید پہلی بار شرمندگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ کیسے بھائی ہیں جنہیں گھر میں ہونے والی ذرا سی بات تک کی بھی خبر نہ تھی۔ مہوش کا رویہ ان کی بہنوں کے ساتھ کیسا ہے انہوں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اماں جان کے انتقال کے بعد کلی اختیارات کی مالک مہوش ہی تھیں۔ خود وہ ان پہ انحصار کرتے تھے، ہر ماہ وہ مہوش کو رملہ، انوشہ اور علیزا کی مختلف ضرورتوں کے لیے گھر کے خرچ کے ساتھ پیسے دے کر مطمئن ہو جاتے۔ کبھی پلٹ کر پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ آج انہیں یوں لگا جیسے وہ واقعی ایک ذمہ دار بھائی کا رول نبھانے کی پوزیشن میں آ گئے ہوں۔ انہوں نے تمام پتے کھول کر مہوش کے سامنے رکھ دیے تھے۔

''میں نے تیمور سے انوشہ کی شادی کا فیصلہ کر لیا۔'' انہوں نے عین ان کے سر پر بم پھوڑا جیسے۔ کتنی دیر انہیں اپنے حواسوں میں آتے لگ گئی۔ بمشکل تمام وہ چہرے پہ رکھی سی مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہوئیں۔

''مگر سعد! کیا انوشہ راضی ہو جائے گی۔ آپ اس کی رضامندی تو معلوم کر لیتے۔''

انہوں نے لرزتی کانپتی امید کے دیے کی لو کو کچھ دیر اور روشن رکھنا چاہا۔

"میں اس کا بڑا بھائی ہوں، میرے کسی فیصلے سے انکار کی جرات نہیں ہے اس میں نہ میں کبھی اس کے لیے بُرا چاہوں گا۔" سعد بہت سکون سے بولتے ہوئے دم توڑتی امید کی لو کو مکمل طور پہ بجھا گئے۔ مہوش نے لاکھ کوشش کی کہ سعد ان کے چہرے پہ پھیلے مایوسی کے رنگ کو نہ دیکھ پائیں، پر کامیاب نہ ہوسکیں۔ سعد نے اس بار تمام اہم امور کے انتظامات اپنے ہاتھ میں لیے مگر مہوش تھیں کیسے ہار مان لیتیں۔ انہوں نے انوشہ کو مزا چکھانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

مہوش نے دروازے کی چرچراہٹ کی آواز پہ فون کریڈل پہ رکھ دیا اور مڑیں، علیزا دروازے کے کھلے پٹ سے اندر جھانک رہی تھی "می می! مما کہاں ہیں؟" اس کے گلابی رخساروں پہ آنسوؤں کی لکیریں چمک رہی تھیں۔ انوشہ ذرا سی دیر کے لیے اس کی نظروں سے اوجھل ہوتی تو گویا اس کی جان نکل جاتی، یہاں تک کہ کبھی اگر وہ نہانے کے لیے جاتی تو علیزا دروازہ پیٹ پیٹ کر بے حال ہوجاتی۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا انوشہ باتھ روم میں تھی علیزا اسے تلاش کرتی یہاں تک آگئی تھی۔ اس کے سوال نے لمحہ بھر کے لیے مہوش کو الجھن میں ڈال دیا پر یہ کیفیت تھوڑی دیر کی تھی۔ تیر کی طرح ایک خیال ان کے ذہن میں آیا اور آنکھیں چمکنے لیں' تب شاید انہوں نے پہلی بار علیزا کو پیار سے بلایا۔ وہ بچی بھی حیران ہوگئی کیونکہ می می ہمیشہ اس سے ڈانٹ ڈپٹ کر ہی بات کرتی تھیں بلکہ اکثر ایک دو تھپڑ بھی لگا جاتیں۔ وہ ڈرتے ہوئے آہستہ آہستہ انکے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔ مہوش اٹھیں اور سائیڈ ٹیبل کے دراز کھول کر امپورٹڈ چاکلیٹس کا پورا پیکٹ نکال کر علیزا کے ہاتھ میں پکڑایا تو چند سیکنڈ وہ یونہی دیکھتی رہ گئی پھر پوری طرح یقین کرلینے کے بعد واقعی اب یہ میرا ہے۔ خوشی سے نہال ہوگئی۔ شام کو مہوش نے اسے سمکی کا بڑا ہیلی کاپٹر بھی دے دیا جو ریموٹ کنٹرول سے اڑتا تھا۔ دوسرے روز مارکیٹ سے وہ اس کے لیے بہت پیارے شوز اور فراکس لائیں تو علیزا کی ان سے دوستی پکی ہونے لگی۔ بچے تو ویسے بھی پیار کے بھوکے ہوتے ہیں۔ دن بہ دن اپنے مقصد کے قریب ہونے کے بعد مہوش کی حالت اس بلی کی سی ہوگئی تھی جس نے بہت سارا گوشت اکٹھا دیکھ لیا ہو۔

تیمور نئے سرے سے اپنا گھر ڈیکوریٹ کروا رہا تھا۔ ادھر انوشہ کے ہاں بھی بہت

مصروفیت تھی سعد، رملہ اور انوشہ کو لے کر خود بازار جاتے تو مہوش کے سینے پہ سانپ لوٹ جاتے پر سوائے ہاتھ ملنے کے وہ کیا کرسکتی تھیں۔ سعد نے ایک بار بھی انہیں ساتھ چلنے کی پیشکش نہیں کی۔ وہ اپنی پسند سے انوشہ کو خریداری کروا رہے تھے، شاید اس طرح وہ اپنی گزشتہ کوتاہیوں کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔ جس روز انوشہ کے لیے زیور خریدا گیا اس دن مہوش بھی ان کے ساتھ تھیں۔

رملہ نے انوشہ کا مقدمہ بھائی کے سامنے اس خوبی سے پیش کیا تھا کہ صورت حال اس کے حق میں ہوگئی تھی۔ اس لیے وہ بہت خوش تھی اس بات کا دکھ بھی تھا کہ انوشہ کے بعد وہ اکیلی رہ جائے گی مگر ایک سکون کا احساس بھی تھا انوشہ اپنے گھر کی ہورہی ہے۔ اسے پاؤں جمانے کے لیے زمین تو میسر آجائے گی۔ انوشہ کے لیے یہ بات خاصے اطمینان کا باعث تھی۔ تیمور نے بخوشی علیزا کو اپنے ساتھ رکھنے کا اظہار کیا تھا۔ اس کے لیے اپنے گھر میں بطور خاص کمرا تیار کرایا تھا اس میں وہ ہر چیز تھی جو علیزا جیسی عمر کے بچوں کے لیے دلچسپی و کشش کا باعث ہوسکتی تھی۔

علیزا! مہوش کے بیڈ پہ لیٹی ان سے کہانیاں سن رہی تھی۔ دو کہانیاں سنانے کے بعد وہ خاموش ہوگئیں۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے باتوں کا رخ انوشہ کی شادی کی طرف موڑ دیا۔

"علیزا جانو! تمہیں پتہ ہے مما شادی کر رہی ہیں۔" وہ ننھی سی بچی کی آنکھوں میں اپنی بات کا تاثر تلاش کر رہی تھیں۔

"چھادی کیا ہوتی ہے می می۔" (شادی کیا ہوتی ہے؟)

"علیزا میری جان! تمہاری مما اس گندے تیمور انکل کے ساتھ چلی جائیں گی تمہیں بھی ساتھ لے جائیں گی۔ تیمور انکل کے پاس اتنا بڑا سا چھرا ہے اس سے وہ آپ کا گلا کاٹ دیں گے ان کے گھر میں بھوت بھی ہیں۔ وہ آپ کو ڈرائیں گے اور ماریں گے۔"

"نہیں نہیں۔ میں مما تے پاش نہیں داؤں گی۔ تیمول انکل وندے ہیں۔" وہ مارے خوف کے ان کے ساتھ لپٹ گئی۔

"میری بیٹی میرے پاس رہے گی، یہ اتنی ڈھیر ساری چاکلیٹس اور کھلونے لے کر دوں گی۔ روز آئس کریم کھلانے لے جایا کروں گی۔ پارک بھی جایا کریں گے۔"

مہوش میٹھے لفظوں کے سنہری جال سے اسے پرچا رہی تھیں۔

تیمور نے جہیز کے نام پہ کوئی بھی چیز لینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ مہوش کو تیمور کی اس بات پہ بہت خوشی ہوئی کیونکہ سعد بہن کے لیے جو پیسے خرچ کر رہے تھے۔ وہ انہیں بڑی تکلیف دے رہے تھے۔ نوید کی طرح تیمور نے بھی جہیز لینے سے انکار کر کے ان کے شوہر کا خرچا بچا دیا تھا۔ روشی کے بھی اس وقت یہی خیالات تھے۔ شادی سادگی سے کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سعد کی طرف سے قریبی رشتہ دار مدعو تھے۔ البتہ تیمور کی طرف سے کافی لوگ آئے۔ اس نے ولیمہ کی تقریب ہوٹل میں کی تھی۔

انوشہ کو گھر ہی میں تیمور کی خالہ زاد نے تیار کیا۔ ساتھ رملہ نے بھی اس کی مدد کی۔ انوشہ کی علیزا کے بارے میں ہدایات جاری تھیں۔

اس کے کپڑے رکھے ہیں کہ نہیں اس کا سوٹ کیس تیار کروا دیا ہے؟ اس کے فلاح جوتے کہاں ہیں وغیرہ وغیرہ۔

رملہ کو ہنسی آ رہی تھی انوشہ جس کے لیے اتنی پریشان ہو رہی ہے۔ وہ تو مہوش بھابھی کے ساتھ چپکی جا رہی ہے۔ کھانے کا سلسلہ جاری تھا۔ رملہ انوشہ کے پاس تھی۔ اسے روشی نے آواز دی تو وہ اندر چلی گئی۔ اب انوشہ اکیلی تھی۔ مہوش کو اب اپنا رول ادا کرنا تھا وہ اس کے پاس چلی آئیں۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو۔ بس دعا ہے کہ نصیب اچھے ہوں۔'' انہوں نے اوپرے دل سے دعا دی۔

''ایک بات گرہ میں باندھ لو کہ شوہر چاہے جتنا اچھا ہو، بیوی کے پہلے شوہر کی اولاد کو پسند نہیں کرتا ہے۔ اب تیمور ہی کو دیکھ لو۔ بظاہر تو کہہ رہا ہے علیزا کو ساتھ رکھے گا مگر تم اس خوش فہمی میں مت رہنا۔ فی الحال علیزا کو ادھر ہی رہنے دو۔ اس موقعہ پہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا اپنا ہی زیاں ہوگا۔ چند دن تیمور کے ساتھ رہ کر اس کے مزاج کے مختلف پہلوؤں کو دیکھ لو۔ ایسا نہ ہو کہ تم عین وقت پہ کوئی مسئلہ کھڑا کر دو، علیزا یہاں زیادہ خوش رہے گی۔ تیمور کی یہ پہلی شادی ہے۔ اپنے اور تمہارے درمیان اسے علیزا کا وجود پسند نہیں آئے گا۔ تم لوگ دعوتوں میں گھومنے پھرنے جاؤ گے تو علیزا کیا کرے گی؟ اب تیمور اتنی فراخدلی کا مظاہرہ ہرگز نہیں کرے گا کہ ہنی مون پہ علیزا کو ساتھ لے جائے۔ تمہیں سمجھداری سے کام لینا ہوگا۔ یہاں رملہ ہے اسے سنبھال لے گی۔ بچوں والی جوان بیوہ کو دوسری شادی دیکھ بھال کر کرنی چاہیے کیونکہ بچے کہیں

کے نہیں رہتے ہیں اور اگر اپنا سکھ دیکھنا ہو تو بچوں کو بھول جانا چاہیے۔'' ہمدردی کے پردے میں مہوش نے اپنے ترکش کے تیر آخر چلا ہی دیے۔

انوشہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ نئی زندگی کی شروعات ایسی ہوں گی۔ اس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بھابھی کی گفتگو کی روشنی میں اسے اپنی شادی کا فیصلہ اب سراسر احمقانہ لگ رہا تھا۔ آگے قدم قدم پہ کھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ بوقت رخصتی علیزا نے ایک ہنگامہ مچا دیا۔

''میں مما کے تھات نہیں داؤں گی۔ تیمول انکل دندے ہیں۔ انتے پاش چھلا ہے۔''

(میں مما کے ساتھ نہیں جاؤں گی تیمور انکل گندے ہیں ان کے پاس چھرا ہے) وہ زور سے رو رہی تھی ''تیمول انکل مالیں دے۔ مما بھی دندی ہیں انکل تے تھات دا رہی ہیں (تیمور انکل مار دیں گے مما بھی گندی ہیں تیمور انکل کے ساتھ جا رہی ہیں) تیمور تو تیمور انوشہ بھی مارے شرمندگی کے سب مہمانوں کے سامنے گویا زمین میں گڑی جا رہی تھیں۔ مہوش نے علیزا پہ جو اتنی محنت کی تھی۔ وہ رائیگاں نہیں گئی تھی۔ سب کے سامنے وہ جو تاثر دینا دکھانا چاہتی تھیں۔ اس میں سو فی صد کامیاب رہی تھیں۔

انوشہ جب سے آئی تھی، رو رہی تھی۔

''انوشہ! علیزا آنے کو تیار ہو تو میں اسے ابھی لے آؤں۔ میں خود اتنا حیران ہوا ہوں کہ وہ یوں اچانک مجھ سے نفرت کیوں کرنے لگی ہے۔'' وہ اپنی پیشانی انگلی سے مسل رہا تھا۔

انوشہ کو ڈھیروں شرمندگی نے آن گھیرا۔ اس نے انوشہ کو اپنے بارے میں بڑے بے تکلفانہ انداز میں سب کچھ بتایا۔

''ہمارے والدین ہمارے بچپن میں ہی ہمیں اکیلا چھوڑ گئے، والدہ صاحبہ نے بڑی محنت اور مشکل حالات میں زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کر کے ہمیں پروان چڑھایا جب میں نے علیزا کو دیکھا تو مجھے اپنا بچپن اور محرومی یاد آ گئی مجھے بہت دکھ ہوا۔ تمہارے ساتھ ہونے والے سلوک نے مجھے اور بھی ہرٹ کیا۔ میرے اندر سے کوئی جذبہ بے اختیار ابھرا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے اچھی طرح سوچنے سمجھنے کے بعد میں نے تمہارا ہاتھ مانگنے کا فیصلہ کیا درحقیقت اس فیصلے کا محرک علیزا کی ذات تھی۔ یہ بتانے میں اب کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ تمہیں اب فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور علیزا کے بارے میں تو قطعاً نہیں، تم سے زیادہ وہ اب میری

بیٹی ہے۔ میں یہی سمجھوں گا کہ وہ میری پہلی اولاد ہے۔"

انوشہ نے بھیگی بھیگی پلکوں سے اسے تشکر سے دیکھا تو تیمور نے اس کے ہاتھ کو دھیرے سے تھپ تھپایا۔ اس کے لمس میں یقین اور اعتماد تھا۔ انوشہ کے سارے خود ساختہ خوف اور مہوش کے پیدا کردہ اندیشے اڑن چھو ہو گئے۔ تیمور سا مخلص ساتھی ملنے کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے حقیقی معنوں میں اس کی ازدواجی زندگی اب شروع ہوئی ہو۔

دو دن مری میں تیمور کے بنگلے میں ہنی مون کے نام پہ رہنے کے بعد تیسرے دن وہ تیمور کے ساتھ علیزا کو لینے گئی تو اس نے رو رو کر اپنا حال برا کر لیا۔ اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ تیمول انکل تے تاتھ نہیں دانا (تیمور انکل کے ساتھ نہیں جانا) تیمور نے بذات خود اسے کتنے لالچ دیے، پیار سے منایا علیزا کی ناں ہاں میں نہ بدل سکی۔ انوشہ تو بہت پریشان تھی۔ جانے علیزا کو کیا ہو گیا تھا۔ کیا اس نے تیمور کے ساتھ شادی کر کے کچھ غلط کیا تھا۔ فی الوقت اس کے ذہن میں یہی خیال آیا۔ ان دونوں کو مجبوراً مایوس لوٹنا پڑا۔ علیزا مہوش کے پیچھے چھپ گئی تھی۔

فتح کے احساس سے مہوش کا چہرا چمک رہا تھا۔ انوشہ کو دوسری، تیسری اور چوتھی بار بھی مایوس لوٹنا پڑا تو وہ ٹینشن کا شکار ہو گئی۔ تیمور اسے ناکردہ احساس جرم اور دباؤ سے بچانے کی خاطر مری لے آیا، شاید دلفریب نظاروں میں وہ اس تکلیف دہ حقیقت کو فراموش کر دے۔ تیمور خود حیران تھا علیزا جو اس کی آمد کی راہ تکتی تھی۔ اچانک اس سے نفرت کیوں کرنے لگی ہے وہ انوشہ سے بدگمان کیوں ہو گئی ہے۔ کسی دوسرے رخ پہ اس سے سوچا ہی نہیں گیا کیونکہ انوشہ بھی بہت پریشان اور دل شکستہ تھی۔ یہ خوب صورت دلکش مناظر بھی اس کی سوچوں کو منتشر نہ کر سکے ادھر تیمور کو فوری طور پہ سنگاپور جانا پڑ گیا۔ وہ انوشہ کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ وہ راضی تو نہیں تھی مگر مہوش بھابھی نے اسے ڈرا دیا۔

"بیٹی کی خاطر ازدواجی زندگی کو داؤ پہ لگا دو گی اگر اس مرحلے پہ تم نے بے رخی برتی تو ساری زندگی کے لیے تیمور کی نگاہ میں معتوب ٹھہرو گی۔" جانے سے پہلے انوشہ نے ایک بار پھر علیزا کو ساتھ لے جانے کے لیے راضی کرنا چاہا، مگر وہ نہ مانی۔

رات انوشہ ادھر ہی رکی کہ شاید اسے اپنے پاس دیکھ کر علیزا کے دل میں ماں کی محبت جاگ اٹھے۔ جب سونے کا وقت آیا تو وہ چپ چاپ آ کر رملہ کے پاس لیٹ گئی۔ ماں کے پاس سونا بھی اسے گوارا نہیں تھا کیونکہ اس کے تیور یہی گواہی دے رہے تھے۔ علیزا کے سونے کے بعد

رملہ انوشہ کے بستر پہ آ گئی جو تکیہ آنکھوں پہ رکھے بے آواز رو رہی تھی۔

"آپی" اس نے دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر اس کا رخ اپنی طرف کیا "آپی مت روئیں مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ آپ روئیں گی تو میرا حوصلہ بھی ٹوٹ جائے گا۔" وہ دلسوزی سے بولی تو انوشہ نے آنسو دوپٹے سے پونچھے۔

"ایک مزے کی بات بتاؤں۔ بھابھی کو شاید اپنی گزشتہ غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے کیونکہ مجھ سے وہ اتنے اچھے طریقے سے پیش آتی ہیں یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنے کیے پہ نادم ہوں انہوں نے زبان سے تو اقرار نہیں کیا ہے پر ان کے رویے سے شرمندگی جھلکتی ہے۔ علیزا سے بھی اتنے پیار سے پیش آتی ہیں گھر کے فالتو کاموں کے لیے ایک ماسی بھی رکھ لی ہے تاکہ مجھ پہ زیادہ کام کا بوجھ نہ پڑے۔ میری تو آدھی سے زیادہ فکریں کم ہو گئی ہیں۔ لگتا ہے ہمارے مشکل دن ختم ہو گئے ہیں۔ اللہ نے مہوش بھابھی کے دل میں رحم ڈال دیا ہے۔ یہی حال روشی بھابھی کا ہے۔ مہوش بھابھی نے علیزا کو ڈھیروں فراکیں اور شوز دلوائے ہیں۔ اب تو علیزا بھی ان سے بہت اٹیچ ہوتی جا رہی ہے۔

"اچھا!" انوشہ کے لیے یہ انکشافات خاصے ناقابل یقین تھے رملہ کی طرح اسے بھی آسودگی و کشادگی کا احساس ہوا۔

"رملہ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ اب میں آرام سے تیمور کے ساتھ جاؤں گی۔ علیزا کی طرف سے میں ہنوز فکر مند ہوں۔ اتنی سی بچی اور اتنا شدید ردعمل۔ میں بہت ہرٹ ہوئی ہوں۔ سوچتی ہوں تیمور کے ساتھ میری شادی کا فیصلہ ٹھیک نہیں ہے شاید۔"

"آپی پلیز" ایسی بات مت کریں جو ہوا اچھا ہوا۔ شاید اس میں کوئی مصلحت ہو۔ اب آپ آرام سے سو جائیں، اچھے اچھے خواب دیکھیں۔" وہ اس کے پاس سے اٹھ کر سوئچ بورڈ کے قریب آئی اور ٹیوب لائٹ بند کر دی۔ انوشہ کو رملہ کی تسلی دلاسوں کے باوجود نیند نہیں آئی آخر اس کے سینے میں ایک ماں کا دل دھڑکتا تھا۔

تیمور نے انوشہ کے ساتھ مل کر تمام ضروری سامان کی پیکنگ کر لی تھی اب وہ تھی کہ مسلسل رو رہی تھی۔ تیمور تو چپ کرا کرا کر عاجز آیا ہوا تھا۔

"بابا! تین ماہ کے لیے سنگاپور جا رہے ہیں۔ کوئی تین صدیوں کے لیے تو نہیں۔ میرا

جانا بہت ضروری ہے اگر تم نہیں جانا چاہتیں تو تمہاری مرضی ہے ویسے جرمنی سے اکا بھائی کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے میں جلد پاکستان آؤں گا۔ میں نے کہا آپ جب بھی آئیں گھر حاضر ہے کیونکہ ان کے جرمنی سیٹل ہونے سے پہلے ہم اکٹھے رہتے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں نے اپنے آبائی گھر کی خوب صورتی و حسن کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ گھر میں نے بزنس پوائنٹ آف ویو سیلیا ہوا ہے ہمارا اپنا گھر زیادہ اچھا ہے شادی کے بعد اکا بھائی تھوڑے عرصہ ہی وہاں رہے۔ اب تو کافی برس گزر گئے ہیں۔ غم روزگار نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کبھی ان کی طرف چکر لگا آؤں......انوشہ ایک بات سوچتا ہوں میں اگر تم مائنڈ نہ کرتو......"

وہ رک گیا۔ بھائی کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس کے چہرے اور آنکھوں سے بس اکا بھائی کی محبت جھانک رہی تھی۔ انوشہ رونا بھول کر دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"ہاں کہیں ناں۔ ایسی کون سی بات ہے جو میں مائنڈ کروں گی۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"انوشہ! دراصل میں شروع سے ہی اکا بھائی کے بہت قریب رہا ہوں چاہتا ہوں جب وہ پاکستان آئیں تو ہم دونوں بھائی اپنے آبائی گھر میں اکٹھے رہیں۔ یہ میری دیرینہ خواہش ہے کہ ہم دونوں بھائیوں کی فیملیز مل جل کر سکون و محبت سے رہیں اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو کیا میں ایسا کر سکتا ہوں۔" وہ امید بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ خوش ہو گئی اتنے بڑے گھر کی تنہائی کی وہ عادی نہیں ہوتی تھی یہ تو خوش آئند بات تھی تیمور خوشی سے کھل اٹھا۔

علیزا سے ملنے کے بعد وہ دونوں ایئرپورٹ گئے جہاں ان کے ساتھ گھر کے دوسرے افراد بھی تھے۔ علیزا ایئرپورٹ کی گہما گہمی کو دیکھ رہی تھی ماں کی اسے مطلق پروا نہیں تھی۔ انوشہ نے زبردستی خود سے لپٹا کر اسے پیار کیا پھر بھی اس کا جی نہیں بھرا، جاتے جاتے وہ بار بار مڑ کر اسے دیکھتی رہی۔ رملہ کو اس کی بے قراری پہ رونا آ رہا تھا۔ انوشہ نگاہوں سے اوجھل ہوئی تو اس نے علیزا کو گود میں بھر لیا۔ سعد بھائی آج فارغ تھے۔ علیزا اور دوسرے بچوں کو گاڑی میں گھمانے لے گئے۔ دوسرے روز سعد مہوش کے ساتھ جا کر اسے اسکول ایڈمٹ کرا آئے۔ دو تین دن تو وہ روئی کہ اسکول نہیں جانا پھر بہل ہی گئی۔

حیدر کے ایک جاننے والے کے توسط سے رملہ کے لیے بہت اچھا رشتہ آیا۔ سعد کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا ویسے بھی وہ تعلیم سے فارغ ہو چکی تھی یوں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کا فیصلہ

ہو گیا۔ انوشہ اور تیمور کو گئے چار ماہ سے زائد گزر چکے تھے۔ تیمور نے فون کر کے بتایا تھا کہ فی الحال وہ نہیں آ سکتے دیکھتے ہی دیکھتے پورا سال گزر گیا۔ اب علیزا مونٹیسوری سے نرسری میں آ گئی تھی۔ انہی دنوں انوشہ کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی تو تیمور نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے سنگاپور میں پھیلتے بزنس پہ توجہ دے گا، انوشہ بیٹے کی ولادت کے فوراً بعد سفر کرنے کے قابل نہیں تھی کیونکہ بیٹا میجر آپریشن کے بعد پیدا ہوا تھا۔ سعد نے ان کے آنے کا انتظار نہیں کیا اور رملہ کی شادی طے کر دی پنکی اور سمکی بھی چھٹیوں پہ گھر آئی ہوئی تھیں۔ سجان فارغ تھا لہٰذا بہت مناسب وقت تھا چنانچہ انوشہ کے بغیر ہی تمام رسمیں سرانجام پا گئیں اور رملہ اپنے گھر سدھاری، وہ بیاہ کر خانیوال گئی تھی۔ میکے سے اچھا خاصا فاصلہ تھا شروع کے دنوں میں تو وہ چکر لگاتی رہی۔ اب اس نے بھی آمد و رفت کم کر دی تھی ذیشان کی نوکری کا جو معاملہ تھا وہ آئے روز کئی کئی گھنٹے صرف کر کے رملہ کو میکے نہیں لا سکتا تھا ویسے بھی وہ اپنی گرہستی میں مطمئن اور مسرور تھی۔

❁

اس روز علیزا سے کھیلتے ہوئے سجان کے کمرے میں رکھا گیا گل دان ٹوٹ گیا تو سجان نے اسے بڑی بیدردی سے مارا اس کے پورے چہرے پہ سجان کے ہاتھوں کی انگلیاں چھپی ہوئی تھیں۔ وہ روتی ہوئی می می کے پاس چلی آئی تو انہوں نے ایک اور تھپڑ اسے لگایا۔

"خبردار جو اپنے ماموں سے شکایت لگائی۔ میں زبان کاٹ ڈالوں کی کتنی کہیں کی۔ ماں خود تو شادی رچا کر بیٹھ گئی اور اس روگ کو میرے لیے چھوڑ گئی۔ میں تمہارا حشر کر دوں گی۔

مہوش کے چہرے سے نقاب سرک چکا تھا۔ علیزا کا ذہن گویا یک دم اندھیرے سے اجالے میں آیا۔ اتنے دن مہوش کے ٹرانس میں رہنے کے بعد وہ آج اپنے آپ میں واپس آئی تھی۔

"مما کہاں ہیں۔ میں مما کے پاس جاؤں گی۔" علیزا مہوش کے اس نئے روپ سے خوفزدہ ہو گئی۔

"مما کے پاس تو میں تمہیں ایسا بھیجوں گی کہ یاد کرو گی۔ وہ میرے قصبے سے نکل گئی ہے پر تمہیں میں نہیں جانے دوں گی۔ اگر آئندہ مما کا نام لیا تو زبان کاٹ ڈالوں گی اور ماموں سے شکایت لگائی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" مہوش کی آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ علیزا کے آنسو آنکھوں ہی میں جم کر رہ گئے تھے۔

❁

مہوش نے پوری طرح علیزا کے ذہن اور شخصیت کو مسخ کیا تھا۔ اسے قدم قدم پہ کچلا تھا یونہی وقت گزرتا رہا نہ جانے کتنے برس گزر چکے تھے، اسے مما کا انتظار کرتے ہوئے، اب تو اس کے دل میں کوئی امید بھی باقی نہ رہی تھی بس ذہن میں مُبہم سے خلا کا احساس ہوتا تھا۔

اس کی عمر کے ساتھ ساتھ سجان کا خوف بھی پروان چڑھتا رہا، مہوش نے کبھی سجان کی حرکتوں کا نوٹس ہی نہیں لیا اور علیزا خوف کی چکی میں دن رات پستی رہی۔

ان کا گھرانہ اب خاصا آزاد خیال ہوگیا تھا۔ ان کا رہن سہن، بول چال اٹھنا بیٹھنا سب کچھ اپ ٹو ڈیٹ ہوگیا تھا۔

سجان گاڑی لے کر لانگ ڈرائیو پر نکل آیا۔ گاڑی میں حسب معمول ہیجان خیز میوزک بج رہا تھا۔ وہ مال روڈ کی پرہجوم سڑک پہ گاڑی چلا رہا تھا، اسے بھوک لگ رہی تھی۔ وہی بڑے کی یہ دکان خاصی مشہور تھی لوگ فیملز کے ساتھ وہی بڑے کھانے آتے تھے۔ خالی ٹیبل کے گرد کرسی گھسیٹ کے وہ بھی بیٹھ گیا۔

''رخشی کی بچی! تم نے میری پلیٹ میں اتنی ڈھیر ساری مرچیں جھونک دی ہیں۔ مجھ سے تو کھایا ہی نہیں جا رہا ہے۔'' روہانسی سی آواز پہ سجان کی نگاہ بے اختیار سامنے بیٹھی دو لڑکیوں کی طرف اٹھ گئی اور پھر جیسے پلٹنا بھول گئی۔

لڑکی کی بے پناہ خوب صورتی نے اسے مبہوت کر دیا۔ وہ بے اختیار ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے گیا۔ رخشی نے رانیہ کو ٹہوکا دیا۔

''کیا ہے؟'' اسے ابھی تک رخشی پہ غصہ تھا جس نے اس کی پلیٹ میں مرچیں ڈال دی تھیں۔

''وہ سامنے دیکھو، ایک ہیرو تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' رانیہ نے اس کی انگلی کی سمت دیکھا۔ سجان کی نگاہوں میں اتنی گرمی تھی کہ وہ نظر چرانے پہ مجبور ہوگئی۔

''پتہ نہیں کون بدتمیز ہے۔'' وہ آہستہ آواز میں بڑبڑائی۔

''دیکھ ایسے رہا ہے جیسے آنکھوں آنکھوں ہی میں سالم نگل جائے گا۔'' اس نے پیٹھ موڑ لی۔ سجان اس پہ مسلسل نظر رکھے ہوئے تھا، جونہی وہ بل ادا کر کے باہر نکلیں سجان بھی اٹھ آیا۔

''مس! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کا نام پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں۔'' وہ گاڑی کے پیچھے سے نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان دونوں کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔ رانیہ اس

کی جرات پہ ششدر رہ گئی۔

''کیا مطلب ہے آپ کا۔ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی ہوں جو ہرایرے غیرے کو اپنا نام بتاتی پھروں گی۔'' رانیہ کا چہرہ لال ہوگیا۔

''میں بھی کوئی ایسا ویسا لڑکا نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے کھو نہ جائیں۔'' اس کے سادہ و مضبوط لہجے پہ رانیہ اور رخشی اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

رانیہ ایک ریٹائرڈ جج احمد مقبول کی اکلوتی اور لاڈلی اولاد تھی جس کی ہر ضد پوری کی جاتی تھی۔ رانیہ کو سجان پہلی ملاقات ہی میں اپنی جرات اور خود اعتمادی کی وجہ سے بہت اچھا لگا تھا اور اسی جذبے کی وجہ سے وہ اس کے بہت قریب آگئی تھی۔ ان دونوں کی مسلسل ملاقاتیں جاری تھیں سجان نے رانیہ کے حسن کی تعریف اس انداز سے کی تھی کہ وہ اس کی گرویدہ ہوگئی تھی۔ سجان کے سوا اسے اب کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا سجان نے بہت جلد اپنی والدہ اور والد کو ان کے گھر لانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ ہواؤں میں اڑتی پھر رہی تھی کسی مست بے خود تتلی کی مانند۔

''سجان! میں کپڑے کون سے پہنوں، کل آپ کی مما ہمارے گھر آ رہی ہیں۔'' وہ سجان سے پوچھ رہی تھی۔

''تم کچھ بھی پہن لو، تم پہ ہر رنگ اور ہر لباس تم پر جچتا ہے۔ میری نگاہوں سے پوچھو جو تمہیں دیکھتے ہی بہکنے لگتی ہیں۔'' وہ بیباک ہوا جا رہا تھا۔ رانیہ کا گلابی چہرا سرخ ہوگیا۔

احمد مقبول ایک بااثر خاندانی آدمی تھے۔ نوکری بھی رعب دبدبے والی کی تھی مگر اپنی اکلوتی بیٹی رانیہ کے معاملے میں وہ بہت حساس تھے۔ رانیہ کے لیے ان سے بڑھ کر کوئی نرم دل اور مشفق نہیں تھا۔ مہوش بہت خوش تھیں کیونکہ مقبول صاحب کا بڑا نام تھا۔ سجان کا پروپوزل وہ دے آئے تھیں اب ادھر سے منظوری ملنے کے بعد ہی باقی کا لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔ احمد مقبول نے مطمئن ہونے کے بعد سجان کو اوکے کر دیا۔ اب دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں جاری تھیں۔ شہنائیوں کی گونج میں رانیہ دلہن بن کر سجان کے گھر آنگن میں وارد ہوئی۔

مختلف رسموں کا ایک طویل سلسلہ تھا جس سے نمٹنے کے بعد رانیہ کو آرام کرنا نصیب ہوا۔ علیزا کو یوں لگ رہا تھا جیسے آج اسے بڑے سکون کی نیند آئے گی کیونکہ سجان کے عفریت سے اسے رہائی مل گئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ عجیب اذیت ناک، دل دہلا دینے والی حرکتیں کرتا تھا۔ اذیت کی انتہا پہ پہنچا کر آواز بھی نہیں نکالنے دیتا تھا۔ ایک بار اس نے علیزا کے منہ پہ ٹیپ

چکا کر سگریٹ سے اس کا بازو داغ دیا تھا۔ وہ ایسا ہی جنونی اور اذیت پرست تھا۔ علیزا نے کئی بار سوچا جب رملہ آنی آئیں گی تو وہ انہیں بتائے گی۔ سال میں وہ ایک آدھ بار ہی آتیں۔ مگر انہیں دیکھ کر جانے کیوں علیزا کے منہ پہ چپ کے تالے پڑ جاتے۔ سجان کے خیالی بھوت کہیں سے نکل کر سامنے آ کھڑا ہوتا۔

''اگر کسی کو بتایا تو میں زبان کاٹ دوں گا۔ آنکھیں نکال لوں گا۔'' وہ اسے ڈراتا تو علیزا صبر کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ اس بے فکر عمر میں ہی وہ صبر وضبط کے کڑے مراحل طے کر چکی تھی۔

رانیہ کی نگاہ دیوار گیر گھڑیال کی طرف اٹھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ قدموں کی آہٹ اسی کمرے کی طرف آ رہی تھی۔ سجان کی آمد کے تصور نے اس کے دل کو گدگدانا شروع کر دیا۔

سجان نے آتے ہی بیڈروم ریفریجریٹر سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور منہ سے لگائی۔

''کتنی دیران اسٹوپڈ سی رسموں میں ہوگئی، کسی کو پتہ ہی نہیں ہے، میرا وقت کتنا قیمتی ہے۔'' وہ بے حد غصے میں تھا۔ رانیہ نے ذرا کی ذرا اس کی سمت نگاہ اٹھائی اور پھر جھکالی۔

۞

پنکی اور سمکی دونوں بہنیں تعلیم سے فارغ ہو چکی تھیں، ان دونوں کا زیادہ وقت گھومنے پھرنے یا ہلے گلے میں ضائع ہوتا، گھر میں ہوتیں تو فون سے چپکی رہتیں۔ دونوں مہوش کی طرح آرام طلب اور زبان دراز تھیں۔ روشی کے بچے عفان اور مناہل بھی جوان تھے۔ ان دونوں بہن بھائی کا سلوک علیزا کے ساتھ مخالصانہ تھا، خود روشی کو اپنی پست خیالی کا احساس ہو چکا تھا اگر وہ مہوش کو اس کی خود غرضی یا بے حسی پہ ٹوکتی تو وہ اس کی جان کو آ جاتیں مجبوراً وہ چپ ہو جاتی رفتہ رفتہ وہ مہوش کی حرکتوں سے لاتعلق ہی ہو گئی۔ عفان اور مناہل پڑھنے لکھنے کے شوقین تھے۔ زیادہ وقت اسی میں مصروف رہتے۔ رہ گئی علیزا تو وہ مہوش کیساتھ رہتی تھی۔ مہوش اس پہ زر خرید لونڈی کی طرح حکم چلاتیں، عدم تحفظ، تنہائی، بے چارگی اور اکیلے پن کے احساس نے علیزا کی شخصیت کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ دو آدمیوں کے سامنے وہ بات تک نہیں کر سکتی تھی۔ پنکی اور سمکی اس کا بری طرح مذاق اڑاتیں۔ اسی پہ بس نہیں تھا۔ وہ اپنے دوستوں اور سہیلیوں کے سامنے بھی یہ رویہ اپنائے ہوئے تھیں۔

انوشہ کا فون مہینے میں تین چار بار آتا اور وہ علیزا سے بات چیت کی خواہش کا اظہار کرتی تو مہوش سفید جھوٹ بولتیں۔

''وہ تو تمہارا نام بھی نہیں سننا چاہتی، کہتی ہے جب مجھے ماں کی گود کی ضرورت تھی تو ماں شادی رچا کر بیٹھ گئی۔ اب مجھے فون مت کیا کرے۔ ویسے علیزا مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔''

وہ جتاتیں تو انوشہ مارے شرم کے گویا زمین میں گڑ کر رہ جاتی کہ علیزا اس کے بارے میں کیسی کیسی باتیں کرتی ہے۔ مہوش بہت کم علیزا کو انوشہ کے فون کے بارے میں بتاتیں اگر علیزا فون سن بھی لیتی تو سلام دعا کے سوا اس کے لبوں سے کوئی اور بات نکلتی ہی نہیں۔ یہ اور بات تھی کہ اس کا دل فون کی بیل ہی میں اٹکا رہتا اور جو وہ فون ریسیو کر لیتی تو برسوں سے ذہن میں بیٹھی مہوش کی باتیں گونجنے لگتیں، وہ کیسے انوشہ کو اپنے دل کا حال بتاتی۔

انوشہ کے دو بچے تھے۔ دونوں بیٹے تھے۔ ان میں محبت تقسیم ہو جانے کے باوجود بھی اسے اپنی ممتا کے پیاسے ہونے کا احساس رہتا۔ پندرہ طویل برس گزر چکے تھے علیزا کو دیکھے بغیر۔ اس نے تیمور پہ زور دینا شروع کر دیا کہ بزنس وائنڈ اپ کر کے پاکستان چلیں۔ ادھر ابا کا بھائی بھی تیمور پہ مسلسل زور دے رہے تھے ''اب پاکستان چلے آؤ میں بہت تھک گیا ہوں۔'' ویسے بھی اب وہ بیمار رہنے لگے تھے۔ رمشہ اپنے گھر کی ہو چکی تھی۔ رہ گیا بیٹا وہ اپنی نوکری میں مصروف تھا۔ اس بری طرح کہ شادی کے سوال پہ دامن بچا جاتا۔ سو وہ گھر کی تنہائی سے گھبرا گئے تھے۔ زیادہ جی گھبراتا تو سال میں ایک دو بار تیمور کی طرف چلے جاتے۔

۞

گھر میں بہت خاموش اور سکون تھا، سجان رانیہ کو لے کر گھومنے پھرنے نکل گیا تھا۔ پنکی اور سمکی آئے روز اپنی فرینڈز کے ہاں پارٹیز میں شریک ہوتیں۔ ایسے میں علیزا کو بہت اچھا لگتا جب گھر میں کوئی بھی نہیں ہوتا تو وہ اپنی مرضی سے جو چاہے کرتی اسے کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں تھا۔ اسے شاعری اور مطالعے سے بہت دلچسپی تھی۔ لائبریری سے کتابیں لے کر آتی اور فارغ اوقات میں پوری طرح کتابوں کی دنیا میں گم ہو جاتی۔ مہوش کا بی پی زیادہ تر ہائی ہی رہتا۔ وہ اپنے کمرے میں سوئی رہتیں یا ڈاکٹرز کے ہاں چکر لگاتیں۔ آرام ہی نہیں آتا تھا۔ سعد ڈانٹتے کہ تم بدپرہیزی کرتی ہو۔ وہ لڑنے پہ اتر آتیں۔ علیزا اس جھک جھک بک بک سے بے نیاز اپنے خوابوں میں گم ہو جاتی جو اس کے لیے گوشہ عافیت اور سہانے مستقبل کے امین تھے۔

فروا نے پنکی اور سمکی دونوں کو بلوایا تھا۔ پنکی تو سخت بے چین تھی۔ آخر ایسی کون سی بات تھی جس کے لیے فروا نے ابھی اور اسی وقت پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔

''پھوٹو بھی کچھ منہ سے۔'' پنکی نے بالآخر فروا سے پوچھ ہی لیا۔

''ابھی نہیں بتاؤں گی۔ دو دن انتظار کرنا پڑے گا۔'' اس نے انہیں چڑایا اور سمکی نے کشن اٹھا کر اسے دے مارا۔

''ٹھیک ہے نہ بتاؤ۔ میرے پاس بھی ایک بمباسٹک نیوز ہے۔'' پنکی نے بے نیازی سے شانے اچکائے تو فروا کا اشتیاق کچھ اور بھی سوا ہو گیا۔

''پلیز بتاؤ ناں۔ آئی پرامس پھر میں بھی تم سے اپنا سیکرٹ شیئر کروں گی۔''

''نہیں پہلے تم پنکی۔'' وہ ضدی لہجے میں بولی تو فروا کو ہار ماننا پڑی۔

''وہ میرا کزن مانی ہے ناں۔ اس نے مجھے سلیمان سے ملوایا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی جیسے ان کے اشتیاق کو سوا کر رہی ہو۔

''اب آگے بھی بتاؤ۔ یہ سلیمان کون ہے۔'' سمکی نے دخل دیا۔

''بڑی اونچی چیز ہے یہ سلیمان۔'' اس نے ''اونچی'' چیز پہ زور دیتے ہوئے اپنی ستواں ناک سکوڑی۔

''خوامخواہ تم سسپنس کری ایٹ کر رہی ہو۔'' پنکی بور ہو گئی۔

''سنڈے کو مری برتھ ڈے ہے، سلیمان بھی انوائیٹ ہے وہاں تم دیکھ لینا میں اتنا سسپنس کیوں کری ایٹ کر رہی ہوں۔''

''چلو دیکھ لیں گے تمہارے سلیمان کو بھی، ویسے ایک بات کہوں مائنڈ مت کرنا، تم تو جواد کو بھی اونچی چیز کہتی تھیں۔ کھودا پہاڑ نکلا چوہا اور وہ بھی مرا ہوا۔'' سمکی نے نامحسوس سے انداز میں طنز کیا تو فروا کی بھنویں تن گئیں۔

''تم میری توہین کر رہی ہو سمکی! میری طبیعت کا تمہیں پتہ ہے۔ میں کتنی جلدی دوسروں سے متاثر ہو جاتی ہوں۔ جواد بھی ان میں سے ایک تھا بعد میں مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ خوامخواہ کمل ہوا جا رہا تھا پر سلیمان جیسا لڑکا میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔'' وہ ایک جذب سے بولی تو سمکی اسے دیکھ کر رہ گئی۔

اس روز پنکی کے جی میں جانے کیا سمائی کہ علیزا کو بھی برتھ ڈے پارٹی میں اپنے ساتھ جانے کو کہا۔ سمکی نے ناک بھوں چڑھائی۔

''یہ مت سمجھنا کہ میرے دل میں یکایک اس کی محبت بیدار ہو گئی ہے ایسی کوئی بات

نہیں ہے۔ علیزا ساتھ جائے گی تو دیکھے گی ہمارا کتنے اونچے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔ اس پہ رعب پڑے گا، مزید احساس کمتری کا شکار ہو گی۔'' سمکی اس کی منطق پہ خاموش ہو گئی۔

فروا کے گھر جا کر علیزا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ بہت کم کہیں جاتی تھی۔ رنگ و بو کی یہ دنیا اس کے لیے نئی تو نہیں مگر نا آشنا ضرور تھی۔ سمکی اور پنکی اپنی اپنی دلچسپیوں اور دوستوں میں مگن ہو گئیں۔ علیزا ایک طرف بیٹھی حیرت سے دیکھتی رہی۔ لڑکیوں کے لباس، ان کی باتیں انکے انداز اسے سب کچھ ہی عجیب لگ رہا تھا۔ ساری محفل میں اسے اپنی پسند کی ایک شخصیت بھی نظر نہیں آئی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا لڑکیاں بے چین دکھائی دے رہی تھیں شاید انہیں کسی کی آمد کا انتظار تھا۔ خاص طور پر فروا جس کی سالگرہ تھی۔ بار بار گیٹ کی جانب متلاشی انداز میں دیکھ رہی تھی۔ حُسن کے سارے ہتھیاروں سے لیس وہ جان محفل لگ رہی تھی۔ پھر وہ شخصیت آ ہی گئی جس کا ان سب کو انتظار تھا۔ علیزا ابھی دیکھ رہی تھی ایک مرد کے لیے لڑکیوں کا یہ جوش و خروش اسے اچنبھے میں ڈال رہا تھا۔ کیک کٹنے کا وقت آیا تو فروا نے علیزا کو بھی پاس بلا لیا تب اس نے غور سے اس لڑکے کو دیکھا۔ کڑکڑاتے سفید لٹھے کے شلوار سوٹ میں کشمیری دھسہ کندھوں پہ ڈالے وہ باقی لڑکوں سے ذرا الگ تھلگ نظر آ رہا تھا کیونکہ پوری محفل میں موجود لڑکوں میں سے صرف اسی نے شلوار سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ فروا اس کے آگے پیچھے پھر رہی تھی۔ خود پنکی اور سمکی بھی اس میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ سمکی نے فروا کی برتھ ڈے پہ باقی دوستوں کی فرمائش پہ کلاسیکی رقص پیش کیا۔ دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ سمکی چند ماہ میں ہی اعضاء کی شاعری میں طاق ہو گئی تھی جبکہ پنکی کو کوشش کے باوجود ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ملی تھی وہ ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کے چکر بھی لگا چکی تھی۔ کہیں شنوائی نہیں ہوئی تھی اپنے تئیں تو وہ بہت بڑھکیں مارتی تھی کہ مجھے ماڈلنگ میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ آج سمکی کی پذیرائی پہ اسے دل میں پہلی بار حسد سا محسوس ہوا۔

مہمان آہستہ آہستہ رخصت ہو رہے تھے۔ فروا کا خاص الخاص مہمان ان تینوں سمیت ابھی تک وہیں تھا۔ پنکی اس سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔ ان کے درمیان علیزا خود کو مس فٹ محسوس کر رہی تھی۔ خدا خدا کر کے پنکی اور سمکی نے فروا سے رخصت چاہی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ گاڑی میں بھی موضوع گفتگو سلیمان کی ذات تھی۔

''تم نے دیکھا۔ فروا کیسے سب سے اس کا انٹروڈکشن کرا رہی تھی جیسے سلیمان اس کی

جاگیر ہو مگر سلیمان اسے گھاس ڈالنے والوں میں سے نہیں لگ رہا ہے۔ کتنی بے نیازی سے بیٹھا ہوا تھا۔ فروا پہ بس ایک عام سی نگاہ ڈالی اس نے اور وہ چھچھوری لڑکیوں کی طرح اس کے قدموں میں گویا بچھی جا رہی تھی۔'' پنکی جانے کیوں فروا سے اتنی جلی بھنی ہوئی تھی۔ سمکی خاموشی سے تنی رہی۔ کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھی۔ وہ اس وقت سلیمان کے بارے میں کسی اور ہی انداز سے سوچ رہی تھی۔ وہ سلیمان کو اپنے ہاں دعوت پہ بلائے گی۔ فروا کی دوست ہونے کے ناتے وہ یقیناً اس کی دعوت قبول کرلے گا۔

بکھرتی زندگی کی بن بیاہی خواہشیں
اب چیونٹیاں بن کر
مرے کل کے تصور کے بدن کی ہڈیاں تنکھا رہی ہیں اور نہ جانے اب یہ سانسیں کہاں سے آ رہی ہیں۔

وہ جس ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اس کی تیسری منزل سے اردگرد کا نظارہ بخوبی کیا جا سکتا تھا مگر رانیہ جسے پہلے ان قدرتی مناظر اور خوب صورتی سے بالکل اپنے وجود کی طرح پیار تھا۔ اب ذرا بھی دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی روح مر چکی ہو اور وہ بے جان جسم رہ گئی ہو۔ سسکتے تڑپتے بے جان جسم سمیت۔ اس وقت بھی وہ کارپٹ پہ بیٹھی بمشکل اپنی چیخیں روکنے کی کوششیں کر رہی تھی جبکہ سجان لاتعلقی سے کھڑکی سے باہر کے مناظر میں گم تھا۔

سجان رانیہ کے ساتھ ہنی مون سے واپس آ گیا تھا۔ وہ بہت خوش اور مطمئن لگ رہا تھا جبکہ رانیہ بجھی بجھی اور پژمردہ نظر آ رہی تھی۔ اس کی گلابی رنگت میں سا ہی جھلک آئی تھی۔

علیزا کی رات کو اچانک آنکھ کھل گئی۔ وہ بہت خوفناک خواب دیکھ رہی تھی۔ آنکھ کھلی تو وہ پسینے پسینے ہو رہی تھی اور حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ وہ دوپٹہ کندھے پہ ڈالتی بال درست کرتی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ لاؤنج سے گزرتے ہوئے دھیمی دھیمی سسکیوں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اونچی آواز میں بولی۔

''کون ہے۔؟'' اس کی آواز پہ سسکیاں یکدم تھم گئیں۔ علیزا نے سوئچ بورڈ کے پاس جا کر لائٹ جلا دی۔ وہ رانیہ تھی جو اپنی آنکھیں دوپٹے سے رگڑ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی سرخی اور

سوجن سے لگ رہا تھا۔ وہ کافی دیر سے روتی رہی ہے۔ علیزا تیزی سے اس کے پاس آئی۔

''بھابھی! کیا بات ہے۔'' اس نے بے اختیار ہی رانیہ کے دونوں بازو تھامے تھے۔

اس نے تھکی تھکی نم آلود نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

''بھابھی! بتائیں ناں کیا بات ہے؟'' رانیہ نے کچھ کہنے کے بجائے اپنا بازو اس کے سامنے کر دیا۔

''اف۔'' علیزا تھرا سی گئی۔ رانیہ کا انتہائی سفید، شفاف دودھیا بازو سگریٹ سے جگہ جگہ داغا ہوا تھا۔ دانتوں سے کاٹنے کے نشانات بھی واضح تھے جو خاصی گہرائی تک جلد میں چلے گئے تھے۔ ان کی وجہ سے زخم بنتا جا رہا تھا۔

''علیزا! ان نشانات، ان زخموں پہ ہی کیا موقوف، میرا تو پورا وجود اور روح ان زخموں سے اٹ گئی ہے۔ کاش میں تمہیں دکھا سکتی۔'' وہ سسکی۔

''یہ سب کیسے ہوا؟۔'' اسے قصداً لاعلمی ظاہر کرنا پڑی۔ اسے پتہ تھا رانیہ کا جواب کیا ہو گا۔

''علیزا! اس گھر میں سب کے چہرے نقاب میں پوشیدہ ہیں۔ ایک تم ہو جو سب سے الگ نظر آتی ہو۔ تمہیں بتانے میں میں کوئی حرج نہیں سمجھتی کہ سجان ایک اذیت پرست، وحشی مزاج اور نفسیاتی مریض ہے۔ اس سے شادی میری اپنی پسند سے ہوئی تھی۔ میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتی۔ سجان کس پست درجہ اخلاق کا مالک ہے پتہ نہیں میں نے کون سا گناہ کیا تھا جس کے نتیجے میں یہ عذاب بھگتنا پڑ رہا ہے۔ وہ مجھے اس بے حیائی اور بے شرمی سے اپنے اخلاق سے گرے کارنامے سناتا ہے کہ زبان بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ میں روشن خیال ہوں مگر آزاد خیال نہیں ہوں۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ......''

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر پھر رونے لگی۔ علیزا کے ساکت وجود کے اندر ایک جوار بھاٹا سا اٹھا۔ سجان کی حرکتوں سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی اسے اس انتہا تک پہنچا دے گی اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ وہ تشدد پسند تھا اور اس کا یہ تشددانہ رویہ صرف صنف نازک تک ہی محدود تھا۔ مہوش سے کچھ بھی تو ڈھکا چھپا نہیں تھا مگر انہوں نے دانستہ، خود کو کنارا کش کیا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے روشی نے اپنا پورشن علیحدہ کر لیا تھا۔ اس کی بھی ایک بیٹی تھی۔ اس نے پیش بندی کے طور پر اپنا حصہ الگ کر کے درمیان میں دیوار کھڑی کر لی تھی سجان کی حرکتوں کی وجہ سے وہ اسے سخت

ناپسند کرتی تھی اسی باعث دونوں بہنوں کے تعلقات پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔ روشی نے کئی بار آپا سے کہا کہ سجان کی حرکتوں کا نوٹس لیں، اسے پیار وڈانٹ ڈپٹ سے سمجھائیں۔ کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کے پاس جائیں ورنہ کل کلاں کو وہ ناقابل تلافی نقصان اٹھائیں گی مگر مہوش کہاں کسی ایسی نصیحت کو خاطر میں لانے والی تھیں۔ الٹا روشی پہ چڑھ دوڑیں۔ وہ اپنا سامنہ لے کر رہ گئی۔ مہوش سجان کی ان بیمار ذہنیت والی حرکتوں کو جوانی کی شرارتیں کہتی تھیں۔ روشی نے اب منائل کی نچلے پورشن میں آمد بند کی ہوئی تھی جس کی وجہ سے مہوش مکمل طور پر ناراض ہوگئی تھیں۔

وقتاً فوقتاً جب سجان گھر میں اکیلا ہوتا تو روشی آواز دے کر علیزا کو بھی اپنے پاس بلالیتی جب تک وہ موجود رہتا۔ وہ اسے اپنے پاس بٹھائے رکھتی۔ اپنی بیٹی کے جوان ہونے کے بعد وہ بہت حساس ہوگئی تھی اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کرنے لگی تھی کہ اب علیزا کو اپنی ماں کے پاس چلے جانا چاہیے۔ وہ جوان و خوب صورت تھی۔ سجان کی کمینی اور گندی فطرت سے کچھ بعید نہ تھا۔ پرائی بیٹی کی ذمہ داری کوئی کب تک اٹھا سکتا تھا۔ کئی بار جب بھی انوشہ سے فون پہ بات چیت ہوتی تو وہ ڈھکے چھپے انداز میں کہتی۔ اب واپس آجاؤ علیزا تمہیں بہت مس کرتی ہے۔ ظاہر ہے وہ واشگاف الفاظ میں تو نہیں کہہ سکتی تھی ادھر انوشہ خوش ہوجاتی مگر اس وقت دل مسوس کر رہ جاتی جب مہوش بھابھی روشی کے بالکل متضاد کہتیں۔

''بھابھی! اب آپ سو جائیں۔ بہت رات ہوگئی ہے۔'' علیزا نے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کیے جو ماضی میں سفر کرتے ہوئے اس کی آنکھ میں در آئے تھے۔

''مجھے سجان کے پاس جانے سے خوف آتا ہے۔'' وہ کرب آلود لہجے میں بولی تو علیزا نے اس کا دکھ اپنے دل و جاں میں اترتا محسوس کیا۔

سمکی نے آج کسی خاص الخاص مہمان کو کھانے پہ مدعو کیا ہوا تھا۔ صبح سے علیزا سمیت سب کی دوڑیں لگی ہوئی تھیں۔ ماسی کے سر پہ کھڑے ہو کر اس نے صفائی کرائی۔ صاف دھلے ہوئے برتنوں کو دوبارہ دھلوایا۔ ڈرائنگ ہال کی ترتیب بدلی گئی۔ ڈرائنگ روم میں نئے پردے لٹکائے گئے تو گھر چمک اٹھا ورنہ تو نوکروں نے برا حال کر رکھا تھا۔ جب گھر کے مکینوں کو ہی پروا نہ ہو تو نوکروں کو کیا پڑی ہے اپنی جان جلاتے پھریں۔

پنکی کھانے کی ٹیبل پہ برتن سیٹ کر رہی تھی جب سمکی کے مہمان نے قدم رنجہ فرمایا۔

سب بہ نفس نفیس اس کے استقبال کے لیے ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔ علیزا چائے بنا کر ٹرالی سجائے ڈرائنگ روم میں آئی۔ اسے بھی مہمان کو دیکھنے کا معصوم سا اشتیاق تھا۔ مہمان فروا کی برتھ ڈے پارٹی والا تھا۔ اسے یہاں دیکھ کر علیزا کو حیرت نہیں ہوئی، کیونکہ سمکی کی دلچسپی وہ بھانپ چکی تھی۔ چائے دے کر وہ باہر آگئی۔ اپنے ملگجے کپڑے دیکھ کر اسے تھوڑی سی شرمندگی ہوئی جو زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ اسے کچن میں مصروف عمل دیکھ کر منائل بھی آگئی۔ علیزا نے تمام چیزیں تیار کرلیں تو بتانے کے ارادے سے ڈرائنگ روم کی طرف آئی سب غائب تھے سوائے مہمان کے۔ وہ ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا باقی نہ جانے کہاں تھے وہ ان ہی قدموں لوٹنے لگی تھی جب فون کی بیل بجنے لگی۔

''ہیلو اسلام علیکم۔'' وہ مری مری آواز میں بولی۔

''کون ہو بیٹا! سمکی ہو کہ پنکی۔ خود ہی بتادو۔'' انہوں نے اسے پہچانا ہو یا نہ مگر علیزا اچھی طرح پہچان چکی تھی۔

''میں علیزا بات کر رہی ہوں۔ آپ ہولڈ کریں۔ میں ممی کو بلواتی ہوں۔'' وہ بمشکل تمام پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

''علیزا! اوہ گاڈ! یہ تم ہو۔ میں انوشہ بات کر رہی ہوں تمہاری ماما۔'' دوسری طرف موجود انوشہ کی آواز بھر آگئی تھی علیزا نے سختی سے اپنے ہونٹ کاٹے اور پلکیں جھپک جھپک کر امڈتے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

''میں ممی کو بلواتی ہوں۔'' اس نے ریسیور نیچے رکھ دیا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

رانیہ کافی دن سے میکے میں تھی۔ ایسا پہلے نہیں ہوا تھا کہ رانیہ اتنے زیادہ دن ادھر رکی ہو۔ سجان نے فون کر کے اسے آنے کو کہا۔ نہ جانے ادھر سے کیا جواب ملا جو وہ کف اڑانے لگا۔ پندرہ دن اور گزر جانے کے بعد علیزا کو یوں لگا یہ معاملہ سنجیدہ ہوتا جارہا ہے اگرچہ اسے کسی نے بتایا نہیں تھا مگر رہتی تو وہ بھی اسی گھر میں تھی پھر ایک جگہ رہتے ہوئے کوئی بات کتنے دن تک چھپی رہ سکتی ہے۔ مہوش فون پہ فون کرتیں۔ سعد سر جھکائے پریشان سے بیٹھے رہتے۔ سجان غیظ و غضب کے عالم میں کسی غیر مرئی وجود کو یوں دیکھتا جیسے وہ رانیہ ہو۔ سمکی

اور پنکی کو اتنی خاص پروا نہیں تھی۔

رانیہ نے سجان سے خلع کا مطالبہ کر دیا تھا جس پہ وہ اور بھی بھپر گیا۔
''میں اس کا وہ حال کروں گا کہ ساری عورتیں پناہ مانگیں گی۔ اسے اپنے حسن پر بہت ناز ہے ناں۔ اتراتی ہے اپنے آپ پہ۔ خود کو پہچان ہی نہیں پائے گی۔ میں اسے کسی اور کے قابل نہیں رہنے دوں گا۔'' وہ خلا میں تکتے ہوئے بڑبڑایا اس حالت میں اس کی آنکھوں سے مخصوص سی وحشت جھانک رہی تھی جس میں شیطانیت تھی۔ مہوش بھی رانیہ کو لعن طعن کر رہی تھیں۔ سعد نے انہیں سمجھایا۔

''رانیہ کو برا بھلا کہنے کا فائدہ نہیں ہے نہ وہ قصوروار ہے۔ حقیقت کا سامنا کرنا سیکھو۔ برائی گھر کے اندر ہو تو باہر والوں کو دوش نہیں دینا چاہیے۔'' وہ تلخی سے بولے تو مہوش بھتھے سے اکھڑ گئیں۔ اب وہ کہاں چپ ہونے والی تھیں۔ سعد خود رانیہ کے گھر گئے اسے منا کر واپس لانے کے لیے مگر وہ سامنے ہی نہیں آئی۔ احمد مقبول نے صاف صاف کہہ دیا۔
''رانیہ کسی صورت بھی واپس جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔'' رانیہ نے اس موقع پہ شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خاندان کے بزرگوں کو درمیان میں لا کر معاملہ ان کے آگے رکھا تھا۔ وہ پڑھے لکھے روشن خیال لوگوں کا گھرانہ تھا اور کوئی بھی اپنی اولاد کو آگ کے سمندر میں دھکا نہیں دیتا۔ سعد کو صاف صاف جواب دے دیا گیا کہ رانیہ کو خلع چاہیے۔ رانیہ کے والدین باشعور تھے خود رانیہ پڑھی لکھی تھی۔

سجان روز رانیہ کو فون کرتا اور گڑگڑاتا کہ گھر آجاؤ۔ اب میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ ایک ثانیے کے لیے اس کا دل نرم پڑ جاتا پھر اگلے ہی لمحے سجان کا گزشتہ رویہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا تو وہ دل کو سمجھا لیتی۔ سجان کی طرف سے اسے مسلسل دھمکیاں مل رہی تھیں۔ اس نے گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کا تمام وقت ایک ذہنی اذیت وخوف میں گرفتار رہتے ہوئے گزرتا۔ ہر آہٹ پہ وہ چونک اٹھتی۔ رات کو کئی بار اٹھ کر کمرے کی کھڑکیاں اور دروازہ چیک کرتی۔ اکیلے لان میں بھی نہ جاتی نہ جانے اس نے چھ ماہ سجان کے ساتھ کیونکر چپ چاپ گزار لیے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سجان اس کی زبان سے نکلی والی ہر فرمائش پوری کرتا تھا، اسے خوشی خوشی شاپنگ کراتا۔ اسے والدین سے ملوانے لے جاتا۔ اسے سراہتا، تعریف کرتا۔

لیکن خلوت ہوتے ہی اس کے اندر کا درندہ باہر آجاتا اور رانیہ کو چیرنے پھاڑنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ میکے میں اس نے کسی کو بھی خود پہ پڑنے والی بپتا کا احوال نہیں بتایا۔ جب اذیت سہنا اس کے اختیار سے باہر ہو گیا تو تب اس نے اپنی خالہ زاد سارا کو بتائی کہ سجان کہتا ہے۔ ''تم کبھی بھی ماں نہیں بنو گی۔ یہ مجھے گوارا نہیں ہے۔'' سارا نے یہ تمام باتیں رانیہ کی مما کو بتائیں۔ ان کے ذریعے یہ واقعات خاندان کے معتبر افراد تک پہنچے جس کے نتیجے میں وہ اب والدین کے گھر تھی۔ اس کے روز و شب اب بھی خوف کی وادی پر خار میں آبلہ پا چلتے ہوئے بسر ہو رہے تھے۔

❁

انوشہ کے تو مارے خوشی کے پاؤں زمین پہ ہی نہیں ٹک رہے تھے۔ تیمور بالآخر پاکستان جانے پہ رضامند ہو گئے تھے۔ وہ اپنا بزنس یہاں سے وائنڈاپ کر کے اپنے وطن میں سیٹ کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ انوشہ خوشی خوشی اپنا سامان پیک کر رہی تھی۔ اطمینان و سرمستی نے ان دونوں جیسے اس کے پورے وجود کو سیراب کیا ہوا تھا۔ مونی اور سنی کے سامنے اس نے علیزا کی اتنی تعریفیں اور باتیں کی تھیں کہ انہیں بھی اپنی آپی سے جلد از جلد ملنے کا اشتیاق ہو گیا تھا۔ اکا بھائی از سر نو گھر سیٹ کرا رہے تھے۔ سلیمان کو انہوں نے اپنے آنے کا دن اور وقت بتا دیا تھا۔ سلیمان دوبارہ سنگاپور ان کے پاس مختصر عرصے کے لیے گیا تھا۔ بعد میں ملازمت میں مصروف ہونے کے بعد جانے کا موقع ہی نہیں ملا حالانکہ مونی اور سنی اسے بہت مس کرتے تھے۔ انوشہ بھی اسے بہت پسند کرتی تھی۔ اب تو انوشہ کا جی چاہتا اڑ کر اپنی علیزا کے پاس پہنچ جائے۔ دل میں وہ خود کو بھی مجرم گردانتی کہ اس نے نئی زندگی میں کھو کر علیزا کو فراموش کر دیا ہے حالانکہ ایسا کوئی لمحہ کم ہی گزرا تھا جب اس نے علیزا کو یاد نہ کیا ہو۔ مونی اور سنی نے صرف علیزا کے فوٹوگرافس دیکھے تھے جو مہوش کی ہدایت پہ ہر سال بھجوائے جاتے تھے۔ وہ دونوں بھائی بے چینی سے ان دن کا انتظار کر رہے تھے

❁

موسم بڑا سہانا ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پہ بادلوں کے جھنڈ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ عصر کا وقت تھا مگر خواب ناک ملگجے اندھیرے کی وجہ سے رات سی چھائی محسوس ہو رہی تھی۔ سلیمان ایئرپورٹ پر چچا اور چچی کا انتظار کر رہا تھا۔
سلیمان کا انتظار ختم ہوا۔ وہ چاروں ارائیول لاؤنج سے نکل رہے تھے وہیں ملنے

ملانے مرحلہ طے ہوا۔ پورٹر نے سلیمان کی گاڑی کی ڈگی میں ان کا سامان رکھا۔ واپسی کا سفر جاری تھا۔ بادلوں کا رنگ اور بھی ضیالا ہوگیا۔ اکا دکا بوندیں کرنے لگی تھیں۔ انوشہ نے سلیمان کو گاڑی موڑنے کو کہا۔ دراصل وہ سعد بھائی کے ہاں اچانک جا کر سرپرائز دینا چاہتی تھیں، خاص طور پر یہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ علیزا اسے یوں اپنے سامنے پاکر کس طرح کے ردعمل کا اظہار کرتی ہے۔ تیمور نے کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ انوشہ کی یہ ننھی سی خوشی برباد نہیں کرسکتے تھے۔ انوشہ سلیمان کو راستہ بتا رہی تھی۔ کئی نئی عمارتوں اور گلیوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس لیے اسے راستہ جاننے میں دقت پیش آرہی تھی پھر اوپر سے بادلوں کے باعث اندھیرا تھا۔ محکمہ موسمیات نے پیشن گوئی کی تھی کہ شدید بارش ہوگی۔

◉

علیزا کو گہری طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ آج سب مہوش اور روشی کے ایک عزیز کے ہاں شادی پہ مدعو تھے۔ اس کا پیپر تھا، اس لیے وہ نہیں گئی۔ کالج سے آنے کے بعد وہ لمبی تان کر سوئی اور پھر عصر کے وقت ہی اٹھی۔ اپنے لیے چائے بنائی اور لان میں بیٹھ کر پی۔ موسم اچھا ہو رہا تھا بادل برسنے کو تیار کھڑے تھے۔ اوپر سے گہرا گہرا اسرار آمیز سا اندھیرا اس کی شاعرانہ طبیعت کو بڑا ابھار رہا تھا۔ گھر میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ جو چاہے کرسکتی تھی۔ اسے اپنا آپ بہت آزاد اور ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ کام والی ماسی جا چکی تھی۔ چوکیدار چھٹی پہ تھا۔ وہ اندر آگئی اور کھڑکی پہ پڑے پردے سرکائے۔ کرسی پہ بیٹھ کر اس نے پلیئر میں اپنے پسندیدہ گلوکار کی کیسٹ ڈالی۔ کرسی پہ نیم دراز اس کا دل ہلکے سے گداز کے زیر اثر آچکا تھا۔

میں تو جلا ایسا جیون بھر
کیا کوئی دیپ جلا ہوگا
میرے جیسا اس دنیا میں کوئی اکیلا کیا ہوگا
جتنی اُمنگیں تھیں سب دل میں
ساتھ میرا چھوڑ گئیں

اسے رونا آنے لگا۔ وہ کرسی سے اٹھی اور کیسٹ بدل دی۔
وہ کشن سر کے نیچے رکھ کر بے تکلفانہ وہیں پہ نیم دراز ہوگئی۔

◉

سجان کی طبیعت ناچتی تھرکتی شوخ وشنگ بے پرواسی لڑکیوں کو دیکھ کر عجیب سی ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگا اگر وہ تھوڑی دیر بھی اور یہاں رہا تو کچھ کر بیٹھے گا۔ اس کی حالت اسی نشئی کی سی ہو رہی تھی جسے کافی روز سے اپنے پسندیدہ نشے کی ڈوز نہ ملی ہو اور اس محرومی کے باعث اس کا بدن ٹوٹ رہا ہو اس کا جی چاہ رہا تھا کاش اس وقت رانیہ اس کے سامنے آجائے تو وہ اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ اچانک اس کے مایوس ذہن میں ایک کوندا سا لپکا اور آنکھیں اسی درندے کی طرح چمکنے لگیں جسے اچانک غیر متوقع طور پہ شکار نظر آگیا ہو۔

راستے میں اس نے ایک جنرل اسٹور دیکھ کر گاڑی روکی اور سگریٹ خریدے۔ اس کے آگے اس نے پھر گاڑی روکی اور ایک چھوٹا سا تیز دھار چاقو، سیفٹی پن اور ماچس خریدی۔ چھوٹی قینچی تو اس کی جیب میں ہمیشہ موجود رہتی تھی۔ اس نے کوٹ کی دونوں جیبیں تھپ تھپا کر ان کی موجودگی کا اطمینان کیا۔ اب اس کے لبوں پر آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔

اسے معلوم تھا۔ شادی کی یہ تقریب کسی طرح بھی آدھی رات سے پہلے ختم نہیں ہوگی اور نہ اس سے پہلے سب واپس آئیں گے۔ مما تو اس پہ بھی اس کے جلدی آنے پہ خفا ہو رہی تھیں۔ آخر ان کی خالہ زاد بہن کی بیٹی کی شادی تھی۔ اسی وجہ سے پورا گھر شریک تھا۔ روشی کی تمام فیملی موجود تھی۔ سجان مہوش کی ایک نہ سنتے ہوئے چپکے سے واپس آگیا۔

وہ بہت ریش ڈرائیونگ کرتے ہوئے واپس آرہا تھا۔ آسمان بادلوں میں ڈھکا ہونے کی وجہ سے رات کا سا سماں تھا۔ یعنی اپنا کھیل کھیلنے کے لیے قدرت نے اسے از خود ہی مناسب و موزوں ماحول مہیا کردیا تھا۔ گیٹ کنڈا لگا کر بند کیا گیا تھا۔ وہ کنڈا ہٹا کر اندر داخل ہوگیا۔ اس نے گاڑی اندر لانے کا رسک نہیں لیا۔ اسے شکار کے خبردار ہونے کا خدشہ تھا اور یہ وہ نہیں چاہتا تھا، گھاگ شکاری تھا ناں۔ وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا۔ آسمان سے جھومتی جھامتی سرد بوندیں ٹپاٹپ ایک تواتر سے گرنے لگیں۔ پیاسی دھرتی کا سینہ سیراب ہونے لگا۔ یہ سنگین اور دلکش موسم سب کچھ اپنے اندر چھپا لینے والا تھا۔ اس کے اندر کا سویا حیوان پوری طاقت سے جست لگا کر باہر آچکا تھا۔

اس نے آہستگی سے سٹنگ روم کا دروازہ کھولا۔ علیزا فلور کشن پہ سر رکھے آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ اس کی شلوار کے پائنچے ٹخنوں سے اوپر چڑھے تھے۔ گوری گوری بے داغ پنڈلیاں جیسے چاندنی بکھیر رہی تھیں۔ علیزا کو آہٹ کا احساس ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

سجان اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے خطرے کا اعلان کر دیا۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی۔

"وہیں چپ چاپ بیٹھی رہو۔ حرکت مت کرنا اگر زندگی چاہتی ہو تو۔" سجان سرسراتی آواز میں بولا اور ساتھ ہی اپنی جیبوں میں موجودہ چیزیں نکالنے لگا۔ ان سب کو دیکھ کر مارے خوف کے علیزا کا سانس سینے میں رکنے لگا۔ اسے اپنی موت آنکھوں کے سامنے رقص کرتی نظر آ رہی تھی۔ ساتھ عزت بھی رخصت ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

"رانیہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی مگر تم چھوڑ کر مت جانا۔ سنا تم نے۔ مجھے چھوڑ کر مت جانا۔" وہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے کوئی چیز ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ تو اس کو نہیں البتہ اس نے علیزا کا ڈوپٹہ اس کے گلے اور کندھوں سے کھینچ لیا۔ ایک طرف پکڑ کر درمیان میں سے اس نے پھاڑ لیا۔ اب دو حصے بن گئے تھے۔ علیزا خوفزدہ نگاہوں سے اس کی تمام کارروائی دیکھ رہی تھی۔ اس کے جسم میں اتنی سکت ہی نہیں رہی تھی جو وہ اپنے بچاؤ کے لیے حرکت کرتی۔ باہر بادل زوردار آواز میں گرج رہے تھے، اس شور میں کون اس کی بے آواز فریاد سنتا۔

"رانیہ منہ سے آواز نہیں نکالتی تھی۔ اس کے منہ سے تو گھٹی گھٹی چیخیں تھیں جو میرے سوا کسی کو بھی نہیں سنائی دیتی تھیں۔ اس کے تاثرات دیکھ کر مجھے بہت مزا آتا تھا۔ تسکین کا احساس ہوتا۔ اتنے روز خوامخواہ ٹینس رہا۔ کبھی سوچا ہی نہیں کہ رانیہ کا متبادل بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔" اس کے لبوں پہ شیطانی مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔

"پلیز سجان بھائی! میرے ساتھ ایسا مت کریں۔ میں آپ کی بہنوں کی طرح ہوں اگر ماموں کو پتہ چل گیا تو وہ آپ کا حشر کر دیں گے۔" پہلی بار علیزا نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا تو سجان اور بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔

"میں کسی کو بھی نہیں پتہ چلنے دوں گا، سارے ثبوت مٹا دوں گا۔" وہ دو حصوں میں پھاڑا دوپٹہ اٹھانے کے لیے گھوما جو کمرے کے وسط میں پڑا ہوا تھا۔ علیزا کے پاس ایک یہی فیصلہ کن لمحہ تھا۔ سجان نے اپنے جوش میں کمرے کے دروازے کو لاک نہیں کیا تھا۔ علیزا بے آواز دروازے کی طرف مڑی۔ سجان وہیں رک گیا البتہ اس نے مڑ کر دیکھا نہیں۔ وہ سن سی ہو گئی سجان کے پاؤں تلے کوئی چیز آ گئی تھی۔ وہ غور سے دیکھ رہا تھا۔ علیزا نے تین قدم آگے بڑھائے۔ دروازے کا ہینڈل اس کی پہنچ میں تھا۔ وہ واپس مڑا علیزا کو اس نے دیکھ لیا اور بجلی کی تیزی سے حرکت میں آیا۔ علیزا نے بھی تمام تر ہمت و طاقت جمع کر کے اندھا دھند باہر کی طرف دوڑ لگا

دی۔ بارش شدت سے ہو رہی تھی۔ گیٹ بند تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ سجان غلیظ گالیاں بکتا اس کے پیچھے تھا۔ علیزا نے گیٹ کھولا۔ سجان نے اسے پکڑا اندر کی طرف کھینچا۔ اس طرح کہ وہ کھلے گیٹ سے اندر پختہ روش پہ جا گری۔ عین اسی وقت کسی گاڑی کے بریک زوردار آواز میں چرچرائے۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سارا منظر واضح ہو گیا۔ علیزا گرتے ہی ساکت ہو گئی۔ سر پہ لگنے والی چوٹ نے اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا تھا۔ خون کی ایک پتلی سی لکیر اس کے سر سے بہتے ہوئے کنپٹی تک آ گئی۔

انوشہ سب سے پہلے گاڑی سے نکلی۔ سجان حیران پریشان سا علیزا کے پاس کھڑا تھا۔

انوشہ اور وہ سب جب گاڑی سے اتر کر اندر آئے تو تب وہ چونکا۔ ایک اور گاڑی گیٹ کے باہر رکی۔ یہ سعد کی ساری فیملی تھی۔ ان کے پیچھے ہی حیدر اور روشی تھے۔ بجلی کے اچانک فیل ہو جانے اور بے وقت برسنے والی موسلا دھار بارش کی وجہ سے دلہن والوں نے بہت جلدی رخصتی کر دی تھی۔ اس لیے وہ سب لوٹ آئے تھے۔ اتنے عجیب حالات میں ان سب کی برسوں بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ پنکی، سمکی، مہوش وغیرہ سلیمان کو ان کے ساتھ دیکھ کر چونکے مگر علیزا کو آڑا ترچھا پڑا دیکھ کر ان کی حیرت زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ سجان نے اس مشکل پوزیشن میں خود کو تیزی سے سنبھالا۔

"یہ بارش میں نہا رہی تھی۔ چھینٹے اڑا رہی تھی۔ میں نے منع کیا علیزا بیمار پڑ جاؤ گی مگر اس نے سنا ہی نہیں۔ پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے ابھی ابھی گری ہے۔" وہ جھوٹ بولتے ہوئے بہت مطمئن تھا۔ انوشہ کو اس وقت ملنے ملانے کا ہوش ہی کہاں تھا۔

"تیمور! کچھ کریں ناں۔ دیکھیں میری علیزا کو کیا ہو گیا ہے۔" اس کی بے چین مامتا تڑپ اٹھی۔ تیمور نے سلیمان کی طرف دیکھا صرف ایک ثانیئے کے لیے۔ ایک فیصلہ کن لمحہ تھا اور انوشہ کی نگاہوں کے اعتماد نے اسے آسانی دے دی تھی۔ سلیمان نے فوراً آگے بڑھ کر علیزا کو اٹھا کر گاڑی کی پچھلی نشست پہ ڈالا۔

"قریب ہی ہاسپٹل ہے۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔" وہ بہت سہولت سے بولا۔ اس نے کسی کو بھی کچھ کہنے کا موقعہ نہیں دیا اور گاڑی نکال کر لے گیا موٹی اور سنی جو گاڑی سے اترے ہی نہیں تھے۔ اس کے ساتھ تھے۔ سعد کو سب سے پہلے خیال آیا۔ وہ ہڑبڑا کر بولے۔

"چلیں سب اندر۔" انہوں نے آداب میزبانی نبھائے۔ کسی اور کو اتنا ہوش کہاں تھا۔ اندر چل کر ملنے ملانے کے مراحل طے ہوئے۔ سب بھیگے ہوئے تھے۔ روشی نے انوشہ سے

کہا کپڑے بدل لو۔اس نے سہولت سے انکار کردیا۔یہ ملاقات بہت اچانک تھی۔شکوے شکایتیں ہورہی تھیں حیدر، سعد تیمور کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے، پاس ہی انوشہ، روشی، مہوش اور پنکی سمکی کے سوالات کے نرغے میں تھی۔وہ سب یہی شکوہ کررہے تھے کہ ہمیں اپنے آنے کا بتایا ہی نہیں۔انوشہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی یہ نہ کہا کہ سرپرائز دینے کے چکر میں مجھے خود ہی بہت بڑا پرائز مل گیا سجان نے بڑی مہارت سے جھوٹ سچ ملا کر علیزا کے گرنے کا واقعہ بتایا اور چپکے سے کھسک گیا۔سٹنگ روم سے اس نے تمام چیزیں غائب کردیں۔علیزا کا دو حصوں میں تقسیم دوپٹہ اس نے گولہ سا بنا کر الماری میں ٹھونس دیا اور بائیک اڑاتا ہوا ہاسپٹل پہنچا۔اسے سلیمان کے آخری الفاظ اچھی طرح یاد تھے کہ میں ہاسپٹل جارہا ہوں۔یہ ہاسپٹل سجان کا جانا پہچانا تھا۔ ریسپشن سے اس نے علیزا نام کی مریضہ کا پوچھا اور پھر تقریباً بھاگتا ہوا اس کے کمرے میں آیا۔ جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی۔چوٹ اور خوف کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوگئی تھی ڈاکٹر نے ضروری دوائیں دینے کے بعد علیزا کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔سلیمان بے منٹ کرنے گیا ہوا تھا۔سجان کے پاس وقت بہت کم تھا۔اس نے مناسب سمجھا کہ ضائع نہ کرے۔علیزا اسے دوبارہ دیکھ کر سخت دھچکے کے زیر اثر آگئی۔

''سنو علیزا!! ایک بات اچھی طرح جان لو۔جو کچھ ہوا ہے۔اس میں میرا نام نہ آئے ورنہ سخت نقصان اٹھاؤ گی۔میں تمہارا حال خراب کردوں گا۔کہنا، میں بارش میں پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے گری تھی۔''

وہ دھمکی آمیز لہجے میں کہتے ہوئے جتنی تیزی سے آیا تھا، اتنی ہی تیزی سے چلا گیا۔علیزا نے ہاتھ کی پشت سے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے سلیمان نے حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتی علیزا کو سب کچھ مختصراً بتادیا تھا اور اسے یہاں لانے کا سبب بھی بیان کیا تھا کیونکہ اس کی آنکھوں میں بہت سارے سوالات مچل رہے تھے۔سنی اور مونی کی اپنی آپی سے یہ پہلی ملاقات تھی۔حیرانیوں کے سمندر میں گھری علیزا نے ان پہ کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔تھوڑی دیر قبل ہونے والا سانحہ جو ہوتے ہوئے رہ گیا تھا۔اس کا بے ہوش ہونا، مما کی آمد، سلیمان جیسے ایک اجنبی شخص کا اسے دوپٹے کے بغیر ہاسپٹل لانا۔یہ سب واقعات اس کے ذہن میں گڈمڈ ہورہے تھے۔وہ خاص گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کرپائی۔اجنبیت کا احساس سا ت تھا جو اس پہ حاوی تھا۔علیزا سلیمان کے ساتھ واپس آچکی تھی۔وہ بے تعلق سی کھڑی تھی۔انوشہ

نے بے چینی سے اسے خود سے لپٹا لیا اور زور زور سے رونے لگی۔اس جذباتی منظر پہ خواتین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔علیزا کے دل کی جگہ جیسے کسی نے برف کا ٹکڑا رکھ دیا تھا۔اس کے سارے جذبے سارے شکوے ساری شکایتیں جو اس نے سینت کر رکھی ہوئی تھیں اسی ٹکڑے میں مقید گویا جم گئی تھیں۔

تیمور بہت پیار اور شفقت سے ملے۔علیزا نے وہی بتایا جو سجان نے کہا تھا سلیمان نے اس وقت علیزا کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔تیمور کے موبائل پہ اکا بھائی کی تین کالز آچکی تھیں وہ پریشان تھے کہ تیمور اور انوشہ ابھی تک کیوں نہیں آئے ہیں۔پنکی اور سمکی کے ساتھ روشی اور منا ہل بھی کھانے کے انتظامات میں مصروف تھیں۔ان سب کے اصرار کی وجہ سے تیمور وغیرہ مجبور ہوگئے پھر پنکی اور سمکی بھی تو انکی خاطر داری میں پیش پیش تھیں۔سمکی نے تو سلیمان سے شکوہ بھی کیا۔

''آپ کا اور ہمارا اتنی قریبی رشتہ ہے۔آپ نے کبھی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔''

''مجھے پتہ ہوتا تو میں ضرور بتاتا۔مجھے خود ابھی ابھی علم ہوا ہے۔'' سلیمان نے اس کے اعتراض کو رد کردیا۔کھانا کھانے کے نام پہ تیمور اور انوشہ نے چند لقمے ہی لیے۔سلیمان نے معذرت کرلی۔انوشہ نے علیزا سے اپنی ضروری چیزیں رکھنے کو کہا تو مہوش بول پڑیں۔

''انوشہ! رہنے دو، علیزا اجنبی گھر اور اجنبی لوگوں میں کیسے رہ پائے گی یہاں پہ وہ زیادہ ٹھیک ہے۔ہم نے پہلے بھی اسے کوئی تکلیف نہیں ہونے دی ہے۔آئندہ بھی پھولوں کی طرح رکھیں گے۔'' وہ اس وقت اپنے مخصوص حاکمانہ موڈ میں تھیں جس کے آگے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔روشی چپ نہ رہ سکی۔

''اجنبی گھر اور اجنبی لوگ کیوں ہونے لگے۔وہ علیزا کا اپنا گھر ہے۔'' مہوش نے اندر ہی اندر دانت پیسے۔

''علیزا سے بھی تو پوچھو۔اتنی سی تھی جب تم چھوڑ کر گئی تھیں۔اب تو ماشاء اللہ سے جوان ہوگئی ہے میری بچی۔مجھ سے اس کی محبت مثالی ہے۔میں نے تمہاری غیر موجودگی میں اسے ماں کا پیار دیا ہے۔'' مہوش نے انوشہ کو کچھ جتایا تو وہ شرمندگی میں نہا گئی۔وہ تاک تاک کر نشانے لگا رہی تھیں۔

''برسوں بعد ماں بیٹی کی ملاقات ہوئی ہے۔ادھر انوشہ اور ادھر علیزا پل پل تڑپتی رہی

ہے۔اتنے کم وقت میں دونوں کا جی نہیں بھرا ہوگا۔جاؤں علیزا!اپنے گھر۔" روشی نے پھر دخل دیا تو مہوش نے اسے قہر آلود نگاہوں سے گھورا۔سجان بھی کہہ رہا تھا۔

"علیزا ادھر ہی رہے گی" دونوں ماں بیٹا کسی مفتوحہ جاگیر کی طرح اس پہ اپنا حق جتا رہے تھے۔علیزا مایوس ہونے لگی تھی اگر روشی اس کی مدد کو نہ آتی تو جانے کیا ہوتا کیونکہ می می کے سامنے اس کی بولتی ہمیشہ سے ہی بند ہو جاتی تھی۔اس نے چھوٹی می می کو تشکرانہ نگاہوں سے دیکھا۔

تیمور بھی بڑے پیار بھرے اصرار سے علیزا سے گھر چلنے کو کہہ رہے تھے اور رہ گئے مونی اور سنی تو وہ اس فیصلے سے بہت خوش تھے "اب تم ہمیشہ اپنے گھر رہو گی۔" تیمور کے لہجے میں مان اور استحقاق تھا۔انوشہ نے پرخلوص سے تیمور کو محبت سے دیا۔اب وہ اپنے گھر جا رہے تھے۔علیزا پچھلی سیٹ پہ مونی اور سنی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی جو اس کے سر پہ لگنے والی چوٹ کی وجہ سے پریشان تھے۔علیزا نے برسوں بعد اپنے اردگرد گہرا تحفظ محسوس کیا۔

اکا بھائی نے کھلے دل سے علیزا کو اپنے گھر میں خوش آمدید کہا۔اس کا لرزتا کانپتا ننھا سا دل پر اعتماد ہو گیا۔

رات گئے تک وہ سب بیٹھے باتیں کرتے رہے۔انوشہ نے کارپٹ پہ بیٹھی علیزا کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا۔اس کی نرم و ملائم انگلیاں علیزا کے سر میں سرسرا رہی تھیں۔اسے بے پناہ سکون کا احساس ہو رہا تھا مگر درمیان میں اپنے برسوں کی دوری، شکوے شکایات اور مہوش کی باتوں نے علیزا کو کسی بھی قسم کا اظہار کرنے سے روکا ہوا تھا۔اکا بھائی اور سلیمان سونے چلے گئے۔مونی اور سنی بھی وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئے۔تیمور نے دونوں کو اٹھا کر بستر پہ ڈالا۔

"علیزا اور انوشہ!اٹھو۔دونوں ماں بیٹی یہیں بیٹھے بیٹھے صبح کر دو گی۔کمرے میں آؤ علیزا کے لیے ہم نے جو ڈھیروں گفٹس خریدے ہیں، وہ اسے دکھائیں۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولے۔

"کم آن علیزا آؤ اب یہ تمہارا گھر ہے۔اس کے مالکوں میں سے ایک نام اب تمہارا بھی ہے۔" اس کی جھجک دور کرنے کے لیے تیمور مسلسل اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ایک پورا سوٹ کیس علیزا کے لیے لی گئی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔تیمور علیزا کو پرانی باتیں یاد کراتے رہے۔

"تمہیں جب میں نے پہلی بار پارک میں دیکھا تو میرے دل نے کہا تھا اگر میری کوئی بیٹی ہوئی، تو وہ بالکل تم جیسی ہو گی۔تم توتلے لہجے میں مجھے "تیمول انکل" کہتی تھیں۔یاد ہے تمہیں۔اگر میں ایک دن بھی نہ آتا تو تم پریشان ہو کر میرا پوچھا کرتی تھیں۔علیزا!میں کل بھی

تمہیں بے انتہا چاہتا تھا اور آج بھی تم میرے لیے پہلی اولاد کی طرح ہو۔انوشہ وہاں پل پل تمہیں یاد کرتی رہی ہے۔کچھ مصلحتوں اور بزنس کی مجبوری کے پیش نظر میں انوشہ کو پاکستان لا ہی نہیں سکا مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نے تمہیں نظر انداز کر دیا یا بھول گئے۔بخدا میرے دل میں تمہارے لیے پہلے سے بھی بڑھ کر محبت موجود ہے۔" تیمور آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ان کے لہجے میں سچائی تھی۔

انوشہ، علیزا اور تیمور نے ساری رات باتوں میں گزار دی۔علیزا انوشہ سے کھنچی سی تھی۔وہ بھی محسوس کر رہی تھی مگر اسے علیزا کی ناراضی پہ محمول کر رہی تھی جو اتنے برسوں کی دوری کے باعث پیدا ہوئی تھی۔یہ خلا وقت کا پیدا کردہ تھا۔کچھ دنوں تو علیزا تکلف برتتی رہی مگر ان سب کی پرخلوص محبتوں کے آگے اس نے ہار مان لی۔اس کا رویہ اب گھر کے ایک فرد کا تھا۔یہ سب تیمور کی دی گئی محبت کا اعجاز تھا۔وہ کہتے تھے تم میری بیٹی کی طرح ہو، مونی اور سنی نے خوشی خوشی یہ شراکت برداشت کر لی تھی۔رہ گئے اکا بھائی، تو وہ تیمور سے بھی زیادہ اسے چاہنے لگے تھے اگر وہ چائے کی ایک پیالی بھی انہیں بنا کر دے دیتی تو وہ اسے دعائیں دیتے نہ تھکتے۔سلیمان کو گھر کا ماحول بہت خوشگوار لگ رہا تھا۔ابو جان بہت خوش رہنے لگے تھے۔بہانے بہانے سے علیزا کی تعریفیں کرتے تو وہ ہنس دیتا۔

۞

اس دن پنکی نے فون کر کے اسے اپنے گھر آنے کو کہا تو اس نے تیمور سے اجازت مانگی۔انوشہ کو علیزا کی اس بیگانگی پہ دکھ تو ہوا پر اس نے اظہار نہیں کیا۔وہ انوشہ سے یوں غیریت برتتی تھی جیسے ماں کے بجائے وہ اجنبی ہستی ہو۔باقی سب کے ساتھ ہنستی بولتی۔اسے دیکھتے ہی اس کے لبوں پہ کھلے مسکراہٹ کے پھول مرجھانے لگتے تو انوشہ اندر ہی اندر سسکنے لگتی۔اس نے تیمور سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا، جانے اس کا کیا ردعمل ہو۔

علیزا ہر طرح سے گھر میں سیٹ ہو گئی تھی مگر اس نے مما سے کمپرومائز نہیں کیا۔اس کے ذہن میں مہوش کی باتیں گونجنے لگتیں تو اس کے قدم خود بخود پیچھے ہٹنے لگتے، آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر جاتیں۔اس کے آگے پانچ چھ سالہ علیزا کی صورت گھومنے لگتی جو سجان سے مارے خوف کے چھپتی پھرتی اور مما کی نرم آغوش ڈھونڈنے کی سعی کرتی۔وہ وقت یاد آتے ہی اس کے بدن میں اب بھی پھریری سی دوڑ جاتی اور اسے انوشہ سے سخت نفرت محسوس ہوتی۔وہ دل کو تنگ

سا پاتی۔اس نے انوشہ سے ماموں کے گھر گزارے کڑے دنوں کا ذکر تک نہیں کیا تھا ویسے بھی مہوش نے نمائشی حد تک اپنی ریپوٹیشن اچھی ہی رکھی تھی۔رملہ بھی ان کے باطن کو نہیں جان پائی تھی۔سب اپنی اپنی زندگی میں مگن تھے۔علیزا دل کا درد کس سے بیان کرتی۔اب انوشہ اس سے کرید کرید کر سوال کرتی مگر وہ کچھ نہیں بولتی تھی۔

اس کے سر کا زخم مکمل طور پہ بھر چکا تھا۔تیمور نے نئے کالج میں اسے بی اے میں ایڈمشن دلوا دیا تھا۔اب اسے اپنی مرضی سے وقت گزارنے کی آزادی تھی۔اکا بھائی کی لائبریری میں اس کی پسند کی ڈھیروں کتابیں موجود تھیں۔

رملہ بھی انوشہ کے آنے کا سن کر ملنے آئی تو مہوش بھابھی کے اچھے رویے کا ذکر کیا۔ انوشہ کے دل سے تمام خفگی دور ہو گئی بلکہ الٹا وہ بھابھی کی احسان مند ہو گئی۔مہوش نے ایک بار بھی اشارتاً نہیں جتایا تھا کہ انہوں نے اتنے سال علیزا کو کھلایا پلایا ہے۔تعلیم دلوائی ہے۔اس کا بیٹی کی طرح خیال رکھا ہے۔انوشہ نے ایک دو بار سنگاپور سے ڈرافٹ بھیجا تو سعد بھائی نے منع کر دیا تھا۔ایک بچی کتنا کھاتی ہے۔اس کے بعد سے انوشہ خاموش ہو گئی تھی۔البتہ ملنے جلنے والوں کے ہاتھ وہ وقتاً فوقتاً تحائف بھجواتی رہتی تھی۔

مونی اور سنی سے ایک اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔مونی کا اصل نام منیب اور سنی کا پورا نام سکندر تھا۔مونی،علیزا سے تقریباً ساڑھے پانچ سال چھوٹا تھا جبکہ سنی اس سے سات برس چھوٹا تھا دونوں اسے آپی کہہ کر مخاطب کرتے تھے تو اس کے رگ و پے میں انجانی سی خوشی دوڑ جاتی اور وہ خود کو یکدم معتبر سا محسوس کرنے لگتی۔

اس روز ویک اینڈ تھا۔مونی اور سنی سیر کے لیے ضد کر رہے تھے تیمور،انوشہ اور علیزا کو بھی لے جانا چاہتے تھے علیزا نے معذرت کر لی۔کل اس کا ٹیسٹ تھا جبکہ انوشہ کو قریبی مارکیٹ سے گھریلو استعمال کی چند اشیاء خریدنی تھیں۔تیمور مونی اور سنی کو لے گئے انوشہ بھی چلی گئی تو علیزا کچھ دیر پڑھنے کے بعد سو گئی۔اس وقت آنکھ کھلی جب فون کی گھنٹی بج رہی تھی اس نے کسلمندی سے گھڑی کی طرف دیکھا اور ریسیور اٹھایا۔دوسری طرف مہوش تھیں۔کافی دیر بات چیت ہوتی رہی۔علیزا نے بتایا ''انکل تیمور پکنک پہ اور مما بازار گئی ہوئی ہیں۔گھر پہ صرف تایا جان اور میں ہوں۔'' جہانگیر کی طبیعت خراب رہتی تھی۔اس لیے وہ گھر پہ تھے۔

''لو ابھی تک تمہاری ماں کی لاپروائی کی عادت ختم نہیں ہوئی۔تمہیں غیر مرد کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر نکل گئی زمانہ بہت خراب ہے منہ بولے رشتوں کا کیا اعتبار اکیلی جوان لڑکی کو دیکھ کر نیت خراب ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔اب تو انوشہ کو ہوش کے ناخن لینے چاہئیں۔''

مہوش رفتہ رفتہ اپنی پرانی روٹین پہ واپس آ رہی تھیں جن میں سرفہرست علیزا کی برین واشنگ تھی۔علیزا نے فون بند کیا تو اندیشوں کے ناگ اسے ڈسنے لگے۔وہ کمرا بند کر کے بیٹھ گئی۔مہوش نے کہا تھا۔

''اگر انوشہ سے جوان بیٹی کی حفاظت نہیں ہوتی تو وہ دوبارہ میرے پاس بھجوا دے۔ اسے تو اپنے شوہر اور جیٹھ کے چونچلوں سے ہی فرصت نہیں ہے۔یتیم بچی کو کہاں دیکھے گی۔''

آخری جملے پہ مہوش کا لہجہ اتنا دردناک ہو گیا تھا کہ علیزا کو خود بھی رونا آنے لگا۔می می کی تمام باتوں پہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایمان لے آئی تھی۔یہی تو مہوش کا کمال تھا۔چرب زبانی اور جھوٹی ہمدردی کے بولوں سے اچھے اچھوں کو رام کر لیتی تھیں۔یہ تو پھر کچے ذہن کی علیزا تھی جدھر ہانکو مڑ جاتی۔پھر بچپن سے ہی وہ می می کے زیر اثر رہی تھی۔

سجان مہوش کی گود میں سر رکھے لیٹا ہوا تھا۔وہ اس کے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں پھیر رہی تھیں۔ایک دم وہ چونک کر اٹھ بیٹھا جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔

''مما!رانیہ نہیں آئی ناں۔آپ علیزا کو لے آئیں،وہ انکار نہیں کرے گی۔اسے اس گھر سے جانے نہیں دینا ہے۔'' وہ عجیب بچکانہ ضدی انداز میں بولا تو مہوش کے لبوں پہ پراسرار سی مسکراہٹ آ گئی۔

''لاؤں گی ضرور لاؤں گی۔چن مہر سائیں تو نہیں ملے۔پیر کامل شاہ مل گئے ہیں۔ میں جلد سجان کے پاس جاؤں گی۔پہلے گئی تھی تو انہوں نے کہا کہ جس جگہ لڑکی رہتی ہے۔اس گھر میں اگر جامن کا درخت ہے تو اس کے نئے نکلے سات پتے لاؤں۔اب اتفاق سے انوشہ کے گھر جامن کا درخت موجود ہے۔میں وہ پتے لا کر پیر صاحب کو دوں گی ایسا عمل کریں گے کہ علیزا کچے دھاگے سے بندھ کر آئے گی۔آخر اسی گھر میں پلی بڑھی ہے۔ہمارے ٹکڑوں پہ پرورش پائی ہے اور وہ انوشہ مزے سے علیزا کو لے کر چلتی بنی ہے۔پہلا حق تو ہمارا ہے،دیکھتی ہوں کب تک ان منہ بولے رشتے داروں کے گھر رہے گی۔آنا یہیں پڑے گا۔جانور اپنے

مالک کے گھر کھونٹے سے بندھا ہی اچھا لگتا ہے۔ اب تم دیکھتے جاؤ۔ میں کرتی کیا ہوں۔'' وہ اسے بہلاتے ہوئے بولیں تو سجان کی خوشی دو چند ہو گئی۔ مہوش اس کی کمزوری بھانپ گئی تھیں۔ کمزوریاں تو علیزا کی بھی ان کے ہاتھ میں تھیں وہ جب چاہتیں حوالہ دے کر جذباتی بلیک میلنگ تو کر ہی سکتی تھیں۔

◈

مونی اور سنی نے اپنا ہوم ورک مکمل کر لیا تھا۔ انوشہ کی طرف سے کھیلنے کی اجازت مل گئی تھی۔ انہوں نے بے فکری سے ٹہلتی علیزا کو بھی پکار لیا وہ ڈم ڈم کی باڑ پھلانگ کر اس کے پاس آ گئی۔

''آپی! آئیں کچھ کھیلتے ہیں۔'' سنی بولا۔

''میرا جی نہیں چاہ رہا ہے۔''

''آپی پلیز۔'' وہ ٹھنک کر بولا تو علیزا کو اس کے معصوم چہرے پہ ترس آ گیا۔

آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔'' سنی سوچ کر بولا تو اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ اس کی فرمائش رد نہ کر سکی اور ڈوپٹہ آنکھوں پہ باندھ کر ستون کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔

''ایک دو تین......'' وہ گنتی دہرانے لگی۔ مونی اور سنی دونوں چھپ گئے۔ وہ اندھوں کی طرح ٹٹولتی کتنی دیر انہیں پکڑنے کی سعی کرتی رہی۔ وہ ہر بار پھرتی سے اسے ناکام بنا دیتے۔ وہ جھنجلا کر کھیل ختم کرنے والی تھی جب کسی کا بازو پکڑ کر اس نے ''میں جیت گئی'' کا نعرہ مارا اور آنکھوں سے پٹی ہٹا دی۔ مارے شرمندگی کے اس کی نگاہیں جھک گئیں جس کا بازو اس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں سلیمان تھا۔ اس نے بجلی کی تیزی سے اس کا بازو چھوڑا اور بھاگتی ہوئی اندر روپوش ہو گی۔ پیچھے سے مونی اور سنی کی دبی دبی ہنسی ابھر رہی تھی۔ وہ جدید دور کے بچے تھے۔ بے باک اور نڈر۔ دیر تک آپی کی خفت اور حماقت یاد کر کے ہنستے رہے۔ ادھر وہ شرمندہ ہوتی رہی کہ سلیمان کیا سوچتا ہوگا۔

اپنی دونوں کزنز سے وہ خاصی الگ اور مختلف سی تھی۔ وہ پر اعتماد تھیں۔ بحث میں ہر کسی سے بڑھ کر دو بدو دلائل دینے میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا لگتا ہی نہیں تھا۔ علیزا نے ان کے ساتھ ایک ہی گھر میں پرورش پائی ہے۔ پنکی کے نڈر پر اعتماد انداز نے اسے متاثر کیا تھا کیونکہ ایسی بولڈ لڑکیاں اس نے اپنے حلقہ احباب میں کم ہی دیکھی تھیں۔ علیزا تو اس سے بالکل الٹ

تھی۔ اس نے ڈرے سہمے خوفزدہ اعتماد تحفظ سے محروم ماحول میں پرورش پائی تھی جس کی واضح جھلک اس کی شخصیت میں نظر آتی تھی۔ مہوش کی دو رخی اور نمائشی پالیسی نے اس میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ شکل سے ہی ہونق اور احساس کمتری کا شکار نظر آتی تھی۔ یہ سب عدم تحفظ کے احساس کے کرشمے تھے جب سے وہ یہاں آئی تھی سب کے مثبت اور پر خلوص رویے اس کی ٹوٹی پھوٹی شخصیت کو سنوارنے میں بڑے معاون ثابت ہو رہے تھے۔ آہستہ آہستہ نامحسوس انداز میں اس کے اندر تبدیلی رونما ہو رہی تھی جس کا اسے خود سے بھی ادراک نہیں تھا۔

اس روز سلیمان نے اسے غور سے دیکھا تھا۔ انتہائی توجہ سے تو وہ اسے اضافی نمبر دینے پہ تیار ہو گیا تھا۔ پنکی اور سمکی سے وہ فروا کے ذریعے متعارف ہوا تھا پھر ان کے اصرار پہ وہ ان کے گھر بھی گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ انوشہ چچی اپنی جس بیٹی کا ذکر کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتی ہیں وہ یہی علیزا ہو گی۔ وہ محسوس کر رہا تھا اور دیکھ بھی رہا تھا کہ وہ چچی سے کھنچی کھنچی سی رہتی ہے وہ اس سے ہمدردی رکھتا تھا اس لیے بعض اوقات اس کا رویہ سلیمان کو بہت گراں گزرتا تھا مگر ماں بیٹی کے معاملے میں وہ بول نہیں سکتا تھا۔ علیزا کا رویہ باقی سب کے ساتھ ٹھیک تھا ہنستی بولتی خوش اخلاقی سے پیش آتی۔ انوشہ کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اس کی نگاہوں کے سامنے تو تھی۔ علیزا کو اس سے جو بھی شکوے شکایتیں تھیں وہ انہیں کبھی بھی نوک زباں پہ نہیں لائی تھی اگر وہ کچھ بول کر دل کی بھڑاس نکال لیتی تو انوشہ کا احساس جرم بھی کم ہو جاتا۔

◈

''سلیمان! جاتے ہوئے علیزا کو کالج ڈراپ کرتے جانا تمہارا آفس بلکہ تھانہ راستے میں ہی پڑتا ہے۔'' انوشہ دروازے پہ کھڑی اسے امید افزا نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ یونیفارم پہن کر جوتوں کے تسمے باندھ رہا تھا۔ انہیں سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا تو وہ علیزا کو بتانے چلی گئی۔ ویسے تو ہر روز اسے تیمور ڈراپ کرتے اور واپسی میں ڈرائیور لے آتا تھا مگر تیمور پرسوں سے فیصل آباد گئے ہوئے تھے۔ ڈرائیور بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس لیے انوشہ نے سلیمان سے کہا۔ علیزا بیگ اور فائل اٹھائے بالکل تیار تھی۔ سلیمان گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ وہ چادر سنبھال کر انوشہ کو رسمی سے انداز میں خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئی اور بیگ سے کتاب نکال کر سامنے رکھ کر پڑھنے لگی۔ کل جلدی جلدی یاد کیا تھا آج سب بھولا ہوا تھا ویسے بھی ٹیسٹ تھا اس کے بڑبڑانے کی آواز آ رہی تھی سلیمان نے ویو مرر سے اس کی گود میں دھری کھلی کتاب اور ہلتے

لبوں کو دیکھا۔

"چلتی گاڑی میں مطالعہ کرنا آنکھوں کے لیے کوئی سودمند نہیں ہے۔ آپ کے پاس گھر میں اتنا وقت ہوتا ہے۔ وہاں پڑھا کریں اب کیا خاک پلے پڑے گا۔" وہ لطیف سے انداز میں اس پہ چوٹ کر گیا تو علیزا کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ اسے سلیمان کا یوں جتلانا اچھا نہیں لگا جیسے وہ اسے نالائق سمجھ رہا ہو کتاب اس کی گود میں ہی رکھی رہی۔ اس نے دوبارہ نہیں کھولی۔ سلیمان نے کالج گیٹ کے سامنے اسے اتارا۔ گاڑی دوبارہ ریورس کی اور چند منٹ میں ہی تھانے پہنچ گیا۔ اس مقامی تھانے کا وہ انچارج تھا۔ اس کے ماتحتوں نے اسے دیکھتے ہی سیلوٹ مارا وہ سیدھا کمرے میں آ گیا جہاں ڈھیروں شکایتیں اس کی منتظر تھیں۔ واپسی میں پھر اسے علیزا کو پک کرنا پڑا۔

◈

انوشہ پہ شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ اکا بھائی نے بات ہی ایسی کہی تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے ایسا کسی غم یا دکھ کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اس کی یہ حالت خوشی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اکا بھائی نے سلیمان کے لیے علیزا کا ہاتھ مانگا تھا۔

"آپ نے سلیمان سے پوچھا ہے؟" وہ ڈوپٹے سے آنکھیں رگڑتے ہوئے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھ رہی تھی۔

"سلیمان میرا بہت سعادت منداور فرمانبردار بیٹا ہے۔ میرے کسی فیصلے سے وہ انکار نہیں کر سکتا پھر بھی تمہاری تسلی کے لیے میں پوچھ لوں گا۔" وہ اسے شفقت سے دیکھتے ہوئے حوصلہ آمیز انداز میں مسکرائے تو انوشہ کا سیروں خون بڑھ گیا۔ علیزا کے مقدر کا ستارا اتنا تابندہ درخشندہ ہوگا۔ اس کا اندازا اسے آج سے پہلے قطعی نہیں تھا پھر سب سے بڑی بات اب علیزا ہمیشہ اس کے پاس رہے گی۔ اسے اپنی مسرت وشادمانی چھپانی دشوار ہو رہی تھی۔

سلیمان رات سونے سے پہلے جہانگیر کو دیکھنے آیا کہ سو چکے ہیں یا نہیں۔ وہ سونے سے پہلے ایک دوبار ان کے کمرے کا چکر ضرور لگاتا تھا شاید انہیں، کسی چیز کی ضرورت ہو۔ وہ جاگ رہے تھے اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھے اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی۔

"آؤ سلیمان۔"

"آج کیا خاص بات ہے جو ابھی تک جاگ رہے ہیں۔" وہ کونے میں پڑی کرسی

اٹھا کر بیڈ کے پاس رکھ کر بیٹھ گیا۔

"زحمت نہ ہو تو کھڑکی بند کر دو۔ ٹھنڈی ہوا کمرے میں آ رہی ہے۔ میں بوڑھا اب برداشت نہیں کر سکتا۔" اس نے حکم کی تعمیل کی۔ پردے برابر کر کے کھڑکی بند کر کے دوبارہ ان کے پاس آ بیٹھا۔ وہ ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے پھر کافی دیر بعد وہ گویا ہوئے۔

"سلیمان! زری کے مرنے کے بعد میں نے تمہیں اور رمشہ کو ماں بن کر پالا۔ اوپر والے کا شکر ہے کہ تم دونوں ہی بہت سعادت منداور نیک ہو۔ میری بھی یہ خوش قسمتی ہے جو مجھے ایسی فرمانبردار اولاد ملی ہے ورنہ آج کے دور میں تو ہر دوسرا شخص اولاد کی نالائقی کا رونا روتا نظر آتا ہے۔ تم نے مجھے کسی مقام پہ بھی مایوس نہیں کیا ہے۔ رمشہ اپنے گھر میں خوشحال اور مطمئن ہے۔ اس کے لیے میری دل سے دعائیں ہی نکلتی ہیں۔ مجھے امید ہے تم بھی مجھے مایوس نہیں کرو گے والدین جو فیصلہ کرتے ہیں۔ اولاد کی بہتری کے لیے ہی کرتے ہیں۔" سلیمان ان کی طولانی تمہید سے چوکنا ہو گیا۔

میں نے علیزا کو تمہارے لیے پسند کیا ہے" انہوں نے بم بلاسٹ کر ہی دیا۔

"میری برسوں کی تجربہ کار نگاہیں کہتی ہیں کہ وہ بہت اچھی بیوی بیٹی اور بہو ثابت ہوگی وگرنہ لڑکیاں تو اوپر بھی بہت سی تھیں مگر میں نے تمہاری آئندہ زندگی کو پرسکون بنانے کی خاطر علیزا کا انتخاب کیا ہے اس میں ہم سب کی بھلائی ہے کیونکہ وہ بہت بے لوث اور محبت کرنے والی لڑکی ہے بالکل اپنی ماں کی طرح۔" وہ طمانیت سے بولے تو سلیمان دل ہی دل میں ان کے اطمینان سے خائف سا ہو گیا۔

"بالکل اللہ میاں کی گائے ہے۔ ذرا بھی اعتماد نہیں ہے۔" وہ دل میں بولا۔ مگر لبوں پہ قفل لگائے رکھا۔

"میں سوچوں گا۔"

"سوچنا نہیں غور کرنا ہے اور پھر فیصلہ کرنا ہے۔ اپنے حق میں فیصلہ کرانے کے لیے میں تم پہ دباؤ تو ڈال سکتا ہوں ناں۔ اتنا حق ہے مجھے اگر میری پسند کا فیصلہ نہ ہوا تو مجھے قدرتی طور پر دکھ ہوگا، مگر تمہارے لیے یہ بھی منظور ہے۔" آخر میں ان کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ انہوں نے خود کو کمبل میں ملفوف کر لیا جس کا مطلب تھا "اب تم جا سکتے ہو۔" وہ بیڈ روم میں جانے کے

بجائے کچن میں آ گیا۔ الیکٹرک کیتل میں اپنے لیے چائے بنائی اور کنگ سائزمگ میں بھر کر وہیں بیٹھ کر پینے لگا۔

''ساری زندگی انہوں نے ہمارے آرام و آسائش کی تگ و دو میں گزاری ہے کیا ہے اگر میں بھی انہیں ایک خوشی دے دوں۔'' چائے کا مگ رکھ کر وہ نیچے آیا صرف برآمدے کی لائٹ جل رہی تھی اس کا مطلب تھا سب سو رہے ہیں۔ وہ واپس آ گیا۔

سلیمان نے جہانگیر کو فی الحال کوئی جواب نہیں دیا تھا مگر وہ امید تھے اس لیے انوشہ اور تیمور کے ساتھ مل کر اس سلسلے میں ضروری مسائل پہ تبادلہ خیال کرتے۔ انوشہ نے فی الحال اس بات کی بھنک علیزا کیساتھ ساتھ کسی اور کو بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ جہانگیر نے سلیمان کی مسلسل خاموشی کو اس کی رضامندی تصور کیا اور منگنی کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ وہ خود انوشہ کے ساتھ طبیعت کی خرابی کے باوجود بازار گئے۔ علیزا کے لیے کپڑے اور انگوٹھی پسند کی۔ سوٹ انہوں نے آرڈر پہ تیار کرایا۔ ڈائمنڈ کی انگوٹھی پہلے لے آئے۔ انوشہ نے تیمور کے ساتھ جا کر سلیمان کے لیے ضروری چیزیں خریدیں۔ اب کچھ دن بعد منگنی کے کارڈز چھپ کر آ جانے تھے۔ انوشہ شام میں سعد اور حید بھائی کے ہاں جا کر انہیں بھی اپنے اس فیصلے سے مطلع کرنے والی تھی۔ تیمور اور انوشہ شام کی چائے پہ انکے ہاں پہنچے۔ حیدر گھر پر موجود نہیں تھے۔ باقی سب تھے۔ مہوش، سعد اور پنکی بڑی خوشی سے ملے سجان اور سمکی گھر پہ نہیں تھے۔ چائے بڑے پر تکلف ماحول میں پی گئی۔

''انوشہ! علیزا کو بھی لے آتیں پنکی سمکی کے ساتھ سجان بھی اسے بڑا یاد کرتا ہے۔'' انہوں نے سجان پہ خاصا زور دے کر کہا۔ ''بچپن سے یہیں پلی بڑھی ہے ہم تو اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ سجان تو بہت اداس ہے کہتا ہے مما علیزا کو لے آئیں ناں۔'' انہوں نے کسی بچے کی طرح سجان کا دوبارہ ذکر کیا۔ وہ دوسری بار بڑے خاص انداز میں سجان کا حوالہ دے رہی تھیں۔ تیمور تو الجھ سے گئے۔ شروع سے ہی مہوش انہیں خود غرض سفاک اور دوغلی فطرت کی مالک لگی تھیں۔ اس وجہ سے وہ انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ پھر سجان عادات واطوار بھی بہت عجیب سے تھے۔

''رانیہ والے معاملے کا کیا ہوا۔ کچھ بہتری کی امید ہوئی یا نہیں۔'' تیمور نے نامحسوس انداز میں موضوع بدل دیا۔ انہیں اور انوشہ کو درمیان والی کہانی کا علم نہیں تھا۔ مہوش نے اشارتاً بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ رانیہ ہی کو قصوروار ٹھہراتیں۔ سجان میں تو کوئی برائی ہی نہیں تھی گویا۔

''میں نے سجان سے کہا ہے کہ طلاق دے ہی ڈالو اس بدچلن عورت کو۔ میں اپنوں میں کوئی لڑکی دیکھوں کی ایسی لڑکی جو دیکھی بھالی ہو۔'' مہوش بولیں۔ سعد اس تمام عرصے میں خاموش رہے۔ مناہل اور روشی بھی چپ تھیں صرف وہی بول رہی تھیں۔

''یہ تو اچھی بات ہے بھابھی! اپنوں سے بڑھ کر بھلا کون ہو سکتا ہے اس لیے میں نے بھی اکا بھائی کو علیزا کے رشتے کے لیے ہاں کر دی ہے بس کچھ روز پہلے ہی یہ فیصلہ ہوا ہے میں نے سوچا آپ سے بھی مشورہ کر لیا جائے کیوں سعد بھائی! آپ کا کیا خیال ہے ویسے سلیمان ہر لحاظ سے علیزا کے لیے موزوں ہے۔'' مہوش اور پنکی کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ پنکی تو اسی وقت اٹھ کر چلی گئی۔ البتہ روشی اور مناہل کے چہرے پہ اطمینان موجود رہا۔

''یہ تو اچھی خبر سنائی ہے تم نے۔'' سعد واقعی بہت خوش ہوئے روشی نے بھی اس کی تائید کی۔ مہوش تو جل کر راکھ ہو گئیں۔

''ایسا مت کرنا۔ ابھی علیزا کی عمر ہی کیا ہے۔ پڑھنے دو اسے۔ کم از کم تعلیم حاصل کر کے اپنے پیروں پہ تو کھڑی ہو سکے گی۔ شادی کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔ اب بھی وقت ہے۔ اس قصے کو فی الحال یہیں ختم کر دو۔ مونی اور پنکی بھی ابھی پڑھ رہی ہیں۔ کون سا علیزا کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ ابھی اس کے کھیلنے کھانے کے دن ہیں ہو سکتا ہے سلیمان سے بھی اچھا رشتہ اس کے لیے مل جائے مہوش کی ان باتوں پہ تیمور کو بہت غصہ آیا ساتھ سعد جیسے شوہر پر بھی کہ انہوں نے تو جیسے کچھ نہ بولنے کی قسم کھائی تھی۔ مہوش کی لن ترانیاں سن سن کر وہ بمشکل خود پہ ضبط کیے ہوئے تھے۔

''بھابھی! میں چاہتی ہوں۔ علیزا جتنی جلدی اپنے گھر کی ہو جائے اچھا ہے پڑھائی کا کیا ہے پڑھتی رہے گی ویسے بھی کون سا ہم نے اس سے نوکری کرانی ہے۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں خوش رہے گی۔'' انوشہ دبے دبے سے لہجے میں بولی تو مہوش اور بھی شیر ہو گئیں۔

''منہ بولے رشتوں یا سوتیلے رشتوں کا کیا اعتبار۔ بھلا کوئی کب تک پرائی اولاد سے چاہ جتا سکتا ہے یا اپنے گھر میں رکھ سکتا ہے۔ اب علیزا کی مثال لے لو اتنے برس ہمارے سر پر ہی مگر ہم نے احسان نہیں جتایا۔ دیکھا جائے تو علیزا پہ پہلا حق ہمارا بنتا ہے۔'' ان کی تنگ دلی کھل کر سامنے آ گئی انہوں نے براہ راست تیمور پہ چوٹ کی تو وہ تلملا گئے، بہر حال مہوش نے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی۔ تیمور اس کے فوراً بعد معذرت کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تو انوشہ کو

بھی اس کی تقلید کرنا پڑی۔ تیمور نے بمشکل اپنا غصہ پیا تھا۔

مہوش غصے کے عالم میں کمرے میں ٹہل رہی تھیں۔ یہی حال پنکی کا تھا بلکہ رو رو کر اس کی تو آنکھیں ہی سوج گئی تھیں علیزا نے اسے کیسی گہری چوٹ لگائی تھی اگر وہ بیچ میں نہ آتی تو شاید پنکی اسے متاثر کرنے میں کامیاب ہو ہی جاتی۔ خیر یہ تو اس کے اپنے خیالات تھے۔ ادھر مہوش جنہوں نے انوشہ اور تیمور کے سامنے بڑے فخر سے کہا تھا کہ میں نے پنکی اور سمکی کے لیے آئے بہت سے اچھے اچھے رشتوں کو منع کر دیا ہے۔ درحقیت وہ ان کے لیے بہت پریشان تھیں۔ لوگ آتے۔ مہوش کی بڑبولی زبان اور پنکی سمکی کے ناز و انداز دیکھ کر دوبارہ نہ لوٹتے۔ انہیں گھر بسانے والی لڑکی چاہیے تھی شمع محفل نہیں بلکہ ان دونوں بہنوں کے خیالات بہت بلند تھے۔ سمکی کلاسیکی رقص کے میدان میں دھماکہ کرنا چاہتی تھی جبکہ پنکی چاہتی تھی ماڈلنگ کی دنیا میں اس کا شہرہ ہو لڑکوں کے ساتھ ان کی دوستیاں تھیں شریف گھرانوں والے تو توبہ توبہ کرتے تھے کیونکہ دونوں بہنیں مہوش کی چھوٹ اور سعد کی لاپروائی کے باعث بہت آزاد خیال ہو گئی تھیں۔

اب علیزا کو بیٹھے بٹھائے ایسا اچھا رشتہ مل گیا تھا تو ان کے سینے پر سانپ لوٹ گئے تھے۔ ان کے خیال میں وہ اس قابل نہیں تھی۔ بھلا کہاں پنکی اور سمکی جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ اپٹی کیٹس سے بہرہ ور زمانے کے ساتھ چلنے والی اور کہاں علیزا جیسی دبو گھر کی بو بولڑکی۔ انہوں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی کہ علیزا کی شخصیت کہیں بھی نمایاں نہ ہونے پائے۔ دیکھنے والوں کو وہ کسی پہلو سے بھی قابل توجہ نہ لگے۔ یہ تو الٹ ہی ہو گیا تھا یہاں سے نکلتے ہی اس کی تو قسمت ہی بدل گئی تھی۔

اب میں ان ماں بیٹی کو ہرگز نہیں جیتنے دوں گی پہلے شمع اور اب یہ پنکی شکست کھائے ہرگز نہیں۔ میں سجان کو اس کا پسندیدہ کھلونا لے کر ضرور دوں گی۔ میں پیر سائیں کے پاس جاؤں گی سب مسئلے چٹکی بجاتے ہی ختم۔'' مہوش کے ہونٹوں پہ فتح مندانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

⊛

''سلیمان بیٹے کارڈز پہ انوائیٹڈ مہمانوں کے نام لکھ دو۔ کل تک سب کو دینے ہیں۔ ٹائم کم ہے جہانگیر نے کارڈز کے بنڈل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مشورہ دیا تو وہ سر کو اثبات میں ہلا کر رہ گیا۔ وہ نیچے آیا تو علیزا سنی اور موٹی کے ساتھ ٹی وی کے آگے براجمان تھی۔ وہ دونوں بھائی اسے دیکھ کر مسکرانے لگے سنی نے موٹی کو کہنی ماری اور سلیمان کے ہاتھ میں دبے

کارڈز کی طرف اشارہ کیا۔ علیزا ٹی وی میں مگن تھی۔

''سنی! جاؤ ایک پین لے آؤ۔'' سلیمان نے اس کا بازو پکڑ اکر کھڑا کر دیا۔ وہ پین لے کر آ گیا اور اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ سلیمان علیزا کی طرف متوجہ ہوا۔

''زحمت نہ ہو تو اس فہرست پہ لکھے نام ذرا خوشخط انداز میں ان کارڈز پہ لکھ دیں۔ سلیمان نے دونوں چیزیں اس کی طرف بڑھائیں۔ تو اس نے لے لیں۔ پہلے کارڈ کا جائزہ لیا اور اس کا ڈیزائن دیکھا۔ ہلکے سبز اور سلور کلر کے امتزاج سے بنا کارڈ بہت اچھا لگ رہا تھا بعد میں علیزا نے اندر سے کھولا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو مسلا غور سے دیکھا دوبارہ پڑھا۔ یہ تو اس کا اور سلیمان کا نام لکھا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہے۔ میرا اور آپ کا نام۔'' علیزا کی سمجھ میں یہ گورکھ دھندا نہیں آیا تو اس نے مدد طلب نگاہوں سے سلیمان کی طرف دیکھا۔

''شاید غلطی سے چھپ گئے ہیں یا کسی اور کے ہیں۔''

وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ سلیمان نے لکھنا موقوف کر کے اسے دیکھا۔ اس کے تاثرات میں اداکاری کا شائبہ تک نہ تھا'' یہ کس کی منگنی کے کارڈ ہیں؟'' اسے مسلسل اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ بوکھلا گئی اور سوال جڑ دیا۔

''یہ علیزا نوید اور سلیمان جہانگیر کی منگنی کے کارڈز ہیں۔ دعوت نامے ہیں جو مورخہ تیس دسمبر بروز جمعرات کو ہونا قرار پائی ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے بولا تو علیزا کو وہاں بیٹھنا دوبھر ہو گیا۔ وہ کمرے میں آ گئی۔

''میری اور سلیمان کی منگنی مجھے کسی نے بتایا تک نہیں اوہ خدا یہ سب کیا ہے۔'' وہ اپنی اس کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھی ہوئی تھی۔ سلیمان بغیر کسی لحاظ کے اس کے پیچھے آ گیا۔

''لکھ لکھ کر میرے تو ہاتھ ہی درد کرنے لگے ہیں اب آپ لکھیں۔'' سلیمان نے دعوتی کارڈز اس کے قریب صوفے پہ ڈال دیے وہ نروس ہونے لگی۔ پتہ نہیں مما کہاں تھیں۔ سلیمان بھی وہیں بیٹھ گیا اور اسے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے دیکھ کر دوبارہ ڈانٹا تو گڑبڑا کر اس نے پین کی کیپ کھولی ڈرتے ڈرتے جھجک کر پہلے کارڈ پہ سید فراست حسین کا نام لکھا۔ ہاتھ کانپنے کی وجہ سے الفاظ ٹیڑھے میڑھے سے ہو گئے۔

"آپ شاید بی اے آنرز کی اسٹوڈنٹ ہیں مگر لکھائی مونٹیسوری پریپ کے بچوں والی ہے۔" وہ اس کے لکھے نام کا بغور معائنہ کر رہا تھا علیزا شرمندہ سی ہوگئی اور انگلیاں چٹخانے لگی۔ سلیمان کو اس کی گھبراہٹ پہ ہنسی آگئی تو وہ اور بھی پریشان سی ہوگئی۔

تیمور نے منگنی سے فقط ایک روز پہلے اس کی رائے طلب کی تو وہ زمین کو گھورنے لگی۔ اس نے کبھی اس انداز میں سوچا ہی نہیں تھا کہ کبھی اس کی منگنی یا شادی بھی ہوگی جہاں ہر قدم آبلہ پائی کے خوف سے ڈر ڈر کر اٹھانا پڑے وہاں سے پھول کھلنے کی امید رکھنا فضول تھی کچھ ایسی ہی حالت اس وقت علیزا کی ہو رہی تھی۔ وہ قسمت کے فیصلے پہ راضی برضا تھی جو آئندہ اس کے لیے جانے کیا کچھ لے کر آنے والا تھا۔

گھر میں چہل پہل سی ہوگئی تھی تیمور کے رشتہ داروں دوستوں اور ملنے جلنے والوں کی کافی زیادہ تعداد جمع ہوگئی تھی انوشہ نے صرف قریبی لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ قلزا جو سلیمان کی خالہ زاد تھی اس نے علیزا کو تیاری میں مدد دی۔ اس نے ایسا زرق برق لباس پہلی بار پہنا تھا اس لیے عجیب سا لگ رہا تھا۔ جب تایا جان نے اسے اپنے ہاتھوں انگوٹھی پہنا کر دعا دی تو اسے رونا آنے لگا۔ سلیمان نے انوشہ کی پہنائی گئی انگوٹھی اسی وقت اتار کر کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔ وہ پرسکون لگ رہا تھا یہ بات جہانگیر کے لیے طمانیت کا باعث تھی۔

منگنی کی تقریب اختتام کو پہنچی۔ مہمان گھروں کو سدھارے۔ علیزا نے سب سے پہلے کپڑے بدلے اور شکر ادا کیا سب کی نگاہیں اسی پہ مرکوز تھیں اور پوری تقریب میں مرکز نگاہ بنے رہنے پہ وہ نروس رہی تھی اب جان چھوٹی تو شکر ادا کیا۔ مونی اور سنی اسے چھیڑ رہے تھے مگر اسے برا نہیں لگا۔ دل میں ننھی ننھی امیدوں اور خوشیوں کے جگنو چمکنے لگے تھے۔ اپنے معتبر ہونے کا احساس زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ سارا دن کام میں لگے رہنے کے بعد انوشہ بہت تھک گئی تھی یہی حال باقی سب کا تھا۔ جہانگیر کو تو چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ علیزا نے شاید ان کے دل کی آواز سن لی تھی تبھی تو چائے بنا کر لے آئی تھی۔

"خوش رہو ہمیشہ، اس وقت چائے پینے کو بڑا دل کر رہا تھا۔" وہ مگ تھام کر ممنونیت سے بولے۔ اس نے سب کو چائے دی۔ باہر ٹرے لے جانے لگی تو انوشہ نے آواز دی۔

"جی مما!" آج اس کے لہجے میں بیگانگی کے بجائے اپنائیت تھی۔

"علیزا! اوپر سلیمان بھی ہے، اسے چائے دے آؤ مجھ سے تھوڑی دیر پہلے کہہ رہا تھا

کہ چائے بنائیں۔ میرے اپنے سر میں درد ہو رہا تھا سستی کی وجہ سے کچن میں جا ہی نہیں پائی اب تم نے بنا لی ہے تو اسے بھی دے آؤ۔" انوشہ کے حکم پہ اس نے انہیں ہڑبڑا کر دیکھا اس کی حالت نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی ہوگئی۔ بہرحال وہ چھوٹی سی خوبصورت ٹرے میں چائے کی پیالی رکھ کر اوپر لے آئی۔

سلیمان لاؤنج میں آنکھوں پہ بازو رکھے نیم دراز تھا۔ کچھ سیکنڈ دروازے میں کھڑی رہی۔ اندر جائے یا یہیں سے لوٹ جائے۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا تو آہٹ پہ سلیمان نے آنکھیں کھول دیں۔

"یہ چائے مما کہہ رہی تھیں آپ کو دے آؤں۔" وہ بمشکل لبوں تک یہ جملہ لانے میں کامیاب ہوئی اور چائے سلیمان کے آگے رکھی۔

"مجھے دے دیں۔" وہ بولا تو علیزا نے پیالی ٹیبل سے اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔ اس کے سیدھے ہاتھ کی دوسری انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ سلیمان کے نام کی انگوٹھی۔ اس نے چائے کی پیالی لینے کے بجائے نگاہیں علیزا پہ جما دیں۔ مٹے مٹے میک اپ کے آثار منہ اچھی طرح دھونے کے باوجود بھی نمایاں تھے۔ آنکھوں میں پھیلا کاجل پلکوں کی حدود سے باہر آ رہا تھا گلابی لپ اسٹک ہلکی ہلکی سی لبوں کی تراش میں تا حال باقی تھی۔ کپڑے اس نے بدل لیے تھے پھر بھی دیکھنے کی چیز لگ رہی تھی رشتہ بدلا تو احساسات بھی بدل گئے تھے۔

"بیٹھ جائیں علیزا۔" وہ نرمی سے مگر تحکم آمیز انداز پریشان ہوگئی۔

"مجھے بھی بہت ضروری کام ہے بیٹھ جائیں آپ کے بغیر بھی کام ہوتے رہیں گے۔ اور یہ کیا۔ کپڑے اتنے جلدی چینج کر لیے کیا پسند نہیں آئے یا کوئی اور بات تھی۔ ویسے میرے بارے میں کیا خیال ہے ہمارے بڑوں نے جو فیصلہ کیا ہے، اس پہ آپ کیا کہتی ہیں" وہ کتنے مشکل سوال کر رہا تھا اسے سلیمان سے ایسی باتوں کی توقع نہیں تھی۔

"بتائیں ناں میں آپ کو کیسا لگتا ہوں ہمارے ابا جان کے تو آپ نے ڈائریکٹ دل و دماغ پہ قبضہ کر لیا ہے اتنی جلدی منگنی کا فیصلہ کیا ہے پتہ نہیں آپ سے پوچھا ہے بھی یا نہیں؟"
اف تابڑ توڑ سوالات وہ تو گھبرا گئی۔

اچھی لگ رہی تھیں ان کپڑوں میں بلکہ بہت اچھی۔" سلیمان نے اس کی مسلسل خاموشی پہ سیدھے سادے انداز میں تعریف کی تو وہ شرما گئی اور دھڑ دھڑ سیڑھیاں پھلانگتی بڑی

تیزی سے نیچے اتری۔

اک اداس کمرے میں
رات کے اندھیروں میں
سوچ کے دریچوں میں
یاد کے جھروکوں میں
اک دیا سا جلتا ہے
سوچتے ہیں کس طرح
اس نے زندگانی کو
دکھ بھری کہانی کو
معتبر بنایا ہے
مختصر بنایا ہے

چاندنی کھلی کھڑکیوں سے کمرے کے اندر در آئی تھی اور ہر چیز کو روشن کر دیا تھا۔ اچھی خاصی خنکی تھی مگر اسے ٹھنڈ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ جنوری کے پہلے عشرے کا چاند پوری آب و تاب سے ہر طرف اپنی جگمگاہٹیں بکھیر رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے پٹ پہ بازو رکھے باہر جھانک رہی تھی۔ اس انوکھی سرمست کیفیت سے وہ پہلی بار آشنا ہوئی تھی جہاں دل عجیب سی تال پہ دھڑک رہا تھا۔ اس کا اور سلیمان کا نام کارڈ پہ اکٹھا لکھا ہوا تھا۔

''علیزا اور سلیمان۔'' وہ زیر لب کھل کھلائی پھر خود ہی ڈر گئی کہ کسی نے یہ آواز سن تو نہیں لی ہے۔ اسے اپنے انجان سے خدشات پہ ہنسی آگئی۔

''علیزا سلیمان۔'' اس نے دوبارا بے خودی کے عالم میں نام دہرایا اور باہر سڑک پہ نگاہیں جما دیں جہاں دور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹیں نزدیک آتی نظر آ رہی تھیں۔ گاڑی سفید گیٹ کے آگے آ کر رک گئی اور ہارن بجا۔ اپنے کیبن میں کرسی پہ بیٹھے بیٹھے سوتا چوکیدار ہڑبڑا کر جاگا اور پھرتی سے آ کر گیٹ کھولا۔

''اوہ! یہ تو سلیمان کی گاڑی ہے۔'' وہ غور سے دیکھ رہی تھی پورچ میں آ کر گاڑی رکی اور سلیمان کیپ ہاتھ میں پکڑے نیچے اترا۔ ایک ثانیے کے لیے اندرونی داخلی دروازے کی

طرف دیکھا اس کے ساتھ ہی تو علیزا کا کمرا تھا۔

چاندنی میں کھڑکی پہ آگے کی طرف جھکا وجود اسے صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ فوراً پیچھے ہو گئی اور جھٹکے سے پردے برابر کر دیے۔ چاند کی کرنیں ناراض ہو کر باہر ہی رہ گئیں اور دبیز پردوں سے جھانکنے لگیں۔

''یہ اتنا لیٹ آتے ہے مجھے پہلے پتہ نہیں تھا۔ تایا جان سو چکے ہوں گے اب یہ کھانا بھی خود ہی گرم کریں گے کتنی ٹف لائف ہے ان کی ہر وقت بھاگ دوڑ میں لگے رہتے ہیں۔ چہ چہ۔'' اسے افسوس ہوا۔

سلیمان آہستہ آہستہ زینے طے کرتا اپنے پورشن میں آیا اور آہٹ پیدا کیے بغیر دروازہ کھولا تا کہ ابو کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ اللہ داد کی گرفتاری کے بعد اس نے پریس کانفرنس بلوائی تھی۔ صحافیوں کو حقائق سے آگاہ کرتے ان کے تابڑ توڑ چبھتے ہوئے سوالات کا سامنا کرتے اور دوسری کاغذی کارروائیوں میں خاصا وقت صرف ہوا تھا پھر اللہ داد کی گرفتاری کے لیے جو پاپڑ بیلنے پڑے وہ الگ کہانی تھی۔ گزشتہ آٹھ دنوں سے وہ پوری نیند بھی نہیں لے سکا تھا آج تو بھوک کا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا حالانکہ صبح منہ اندھیرے چائے کی پیالی پی کر گیا تھا دوپہر میں اسنیکس لیے تھے اب ذرا بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے دروازہ آہٹ پیدا کیے بغیر کھول کر دیکھا۔ جہانگیر پرسکون نیند سوئے ہوئے تھے۔ وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ نیم گرم پانی سے غسل کرنے کے بعد تازگی کا احساس ہوا ساری تھکن زائل ہو گئی۔ اب چائے پینے کو جی چاہ رہا تھا۔ ساتھ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ وہ کچن میں آ گیا شلف پہ ہاٹ پاٹ دھرا ہوا تھا جس میں یقیناً اس کے لیے کھانا تھا۔ عین اسی وقت ہاتھ میں ٹرے پکڑے علیزا نمودار ہوئی سلیمان کے اوپر جانے کے بعد اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس نے کچھ نہیں کھایا پیا ہے کیونکہ گھر سے باہر وہ کم ہی کھاتا پیتا تھا۔ وہ کچن میں آ گئی آہستہ آہستہ کم سے کم آواز پیدا کیے بغیر روٹی پکائی۔ سالن گرم کیا۔ پانی کا گلاس رکھا اور ہچکچاتے ہوئے اوپر آ گئی۔ اس نے ٹرے ٹیبل پہ رکھی۔

''یہ تو مما نے اتنی دیر پہلے رکھا تھا۔ ہاٹ پاٹ میں ہونے کے باوجود ٹھنڈا ہو چکا ہو گا میں گرم روٹی اور سالن لائی ہوں۔'' اس نے سلیمان کے آگے رکھا ہاٹ پاٹ اٹھا لیا اور ساتھ اپنے عمل کی بھی وضاحت کی۔

"اس وقت اللہ سے کچھ اور بھی مانگتا تو مل جاتا۔" سلیمان کا موڈ ایک دم خوشگوار ہو گیا پل بھر میں اس کی ساری کلفت زائل ہو گئی۔ پھر وہ چھوٹی چھوٹی ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا غیر اہم سی مگر علیزا کو اسے سننا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"اب اگر ایک کپ چائے مل جائے تو۔" اس نے کھانا کھانے کے بعد برتن ایک طرف کر دیے۔ چند منٹ میں گرما گرم بھاپ اڑاتی خوشبودار مہک والی چائے اس کے سامنے تھی۔

"بیٹھ جائیں اگر نیند نہ آ رہی ہو تو۔" وہ چائے کے ہلکے ہلکے سپ لیتے ہوئے بولا۔

"چائے مزیدار بناتی ہیں آپ۔" اس نے بے ساختہ تعریف کی تو علیزا خوش ہو گئی۔

"میں اب جاؤں۔" اس نے چائے والے برتن دھو کر اسٹینڈ میں رکھے اور سارا پھیلاوا سمیٹ دیا۔ کہیں بھی اب بے ترتیبی نہیں تھی۔ سلیمان نے رسٹ واچ آنکھوں کے سامنے کی ایک بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔

"حیرت کی بات ہے آج میں بہت تھکا ہوا ہوں مگر جانے کیوں نیند دور بھاگتی محسوس ہو رہی ہے، بہر حال آپ جائیں رات کافی ہو گئی ہے۔ آئیں میں آپ کو نیچے چھوڑ آتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا تو علیزا نے بھی اس کی تقلید کی اور دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترنے لگی۔ داخلی دروازے سے اندر آ کر اس نے باہر دیکھا سلیمان ہنوز کھڑا تھا۔

"دروازہ لاک کر لیں۔" اس نے مشورہ دیا تو وہ دروازہ بند کرنے لگی مگر اچانک سلیمان نے درمیان میں ہاتھ پھنسا دیا۔

"علیزا! تھینک یو اینڈ گڈ نائٹ۔" وہ بے ساختہ مسکرائی تو سلیمان کو احساس ہوا کہ اس کی مسکراہٹ بہت خوب صورت ہے۔ وہ مسروری اندر چلی آئی اور کمبل اپنے اوپر لپیٹ کر دراز ہو گئی۔ سلیمان کے ساتھ اسے اپنا تعلق بہت پائیدار لگ رہا تھا اور بہت ساری اپنائیت رگ و پے میں خون کے ساتھ گردش کرنے لگی تھی۔ یہ سب سلیمان کے ساتھ تعلق کا اعجاز تھا۔

رانیہ کے والد احمد مقبول نے وکیل کے ساتھ مل کر سجان کو خلع کا نوٹس بھجوانے کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ انہوں نے عالیہ غوری کو رانیہ کے کیس کے لیے وکیل کیا تھا۔ عالیہ غوری بہت قابل وکیل تھی۔

صائمہ کے ساتھ رانیہ بہت دن کے بعد گھر سے نکلی تھی۔ صائمہ نے ہی تو اس کی اداسی

پژمردگی دور کرنے کے لیے شاپنگ کا پروگرام بنایا تھا۔ رانیہ کی گاڑی تو سروس کے لیے آٹو سروس اسٹیشن گئی ہوتی تھی دوسری پیا لے گئے تھے۔ صائمہ نے ہی سڑک سے گزرتی ٹیکسی کو اشارہ کر کے روکا اور دونوں بیٹھ گئیں۔ گاڑی میں بیٹھنے کے کچھ دیر بعد ہی رانیہ کو احساس ہوا جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ٹیکسی کے بالکل پیچھے سجان کی گاڑی آ رہی تھی۔ جسے وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے تو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی حالت ہو گئی۔

"پلیز گاڑی تیز چلائیں۔" وہ ڈرائیور سے روہانسے لہجے میں بولی۔ ڈرائیور کوئی بھلا مانس آدمی تھا اسے اکیلی لڑکیوں پہ رحم آ گیا اور اس نے سوال جواب کیے بغیر گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

"صائمہ! وہ مجھے ہرگز نہیں چھوڑے گا۔"

"پاگل ہوئی ہو۔ کیا کر لے گا وہ۔ ایک انسان سے اتنا خوفزدہ ہو رہی ہو۔" صائمہ اس کا خوف کی شدت سے سفید پڑتا چہرا دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گئی۔ پولیس اسٹیشن دیکھ کر ایک خیال اچانک اس کے ذہن میں آیا۔ اس نے وہیں گاڑی رکوائی۔ رانیہ کے سوچنے سمجھنے سے پیشتر ہی اس نے کرایہ ادا کیا اور اس کا بازو کھینچتی کالے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ اس نے مڑ کر باہر سڑک کی طرف دیکھا۔ سجان گاڑی میں بیٹھا حیرت سے ادھر دیکھ رہا تھا اس کے چہرے پہ جھلاہٹ بڑی واضح تھی۔

برآمدے سے آگے بنے کمروں کی ایک طویل قطار تھی جن کے باہر خوف صورت پودوں کے گملے ترتیب سے سجے ہوئے تھے۔ صائمہ، رانیہ کے ساتھ ایک کمرے میں جھپاک سے داخل ہو گئی۔ سلیمان ان دونوں کی اچانک آمد پہ کھڑا ہو گیا بلکہ وہ رانیہ کو ایک بار کی ملاقات کے باوجود بھی پہچان چکا تھا پنکی اور سمکی کی ویل میرڈ بھابھی اسے اچھی طرح یاد تھی اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اسے اپیل کر گئی تھی ان کے احترام میں وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہوا تھا۔ رانیہ کی یادداشت اتنی کمزور نہیں ہوئی تھی جو وہ اپنی نندوں کے خاص لحاص مہمان کو پہچان نہ پاتی۔ اس نے خوفزدہ اعصاب کو پرسکون کرتے ہوئے سلیمان سے سلام واحوال پوچھا۔

"کہیے کیسے آنا ہوا؟" وہ اردلی کو چائے کا کہہ کر ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"پولیس اور تھانے کس لیے بنائے گئے ہیں۔ عوام کے جان و مال کے تحفظ کے لیے مگر آپ کو شاید اپنے فرائض یاد نہیں ہیں ایک شخص دن رات رانیہ کو خوفناک نتائج اور قتل

کی دھمکیاں دیتا ہے اور آپ کے کانوں پہ جوں تک نہیں رینگتی۔" صائمہ سدا کی جذباتی اور بے صبری تھی سوچے سمجھے بغیر شروع ہوگئی سلیمان کو غصہ تو بہت آیا مگر خاتون ہونے کے ناتے احتراماً کچھ نہیں کہا۔

"خاتون! آپ کی بات بجا ہے۔ پولیس کا ادارہ عوام کے جان و مال کے تحفظ کے لیے بنایا گیا مگر ہمیں الہام تو نہیں ہوتا کہ فلاح شخص کو فلاح آدمی دھمکی دے رہا ہے۔ کیا آپ نے اس سے پہلے پولیس کے پاس آ کر رپورٹ کی ہے؟" سلیمان ہمیشہ کے ٹھنڈے لہجے میں بولا تو صائمہ شرمندہ ہوگئی۔

واقعی اسے کیا خبر تھی۔ وہ تو تھانہ دیکھ کر بنا سوچے سمجھے اندر آگئی تھی اور شروع ہوگئی تھی۔ رانیہ نے اس کی طرف سے سوری کی سلیمان نارمل ہوگیا۔ رانیہ نے کچھ بتایا کچھ چھپایا۔

"آپ اس واقعے کی ایف آئی آر درج کرانا چاہتی ہیں تو میں ہیڈ محرر کو بلواتا ہوں کیونکہ اتفاق سے یہ کیس ہمارے ہی تھانے کی حدود میں آتا ہے اور قابل دخل اندازی پولیس ہے۔ مجھے یقین ہے" معمولی کوشش سے ہی آپ کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔" سلیمان نے بتایا۔

"دراصل میں گھر والوں کی اجازت کے بغیر یہ قدم نہیں اٹھا سکتی۔ صائمہ تو ہمیشہ کی بیوقوف ہے اب ہمیں اجازت دیں۔" وہ صائمہ کو گھورتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اس وقت تو جان نکل رہی تھی۔ یہ ہماری عورتیں ہمیشہ بزدل کی بزدل رہیں گی۔ ایک آدمی انہیں جان سے مارنے کی دھمکی دیتا ہے انہیں سب پتہ بھی ہے پھر بھی فرما رہی ہیں۔ میں گھر والوں کی اجازت کے بغیر ایسا نہیں کرسکتی۔"

وہ بڑبڑاتی رہی۔ رانیہ اسے ٹوکنے کے بجائے خاموش ہوگئی۔ وہ دونوں گھر واپس آگئیں۔

سلیمان احمد مقبول سے بہت اچھی طرح واقف تھا اور دل سے ان کی دیانت کا معترف بھی تھا رانیہ اسی انصاف پسند جج کی بیٹی تھی۔ یہ اعتراف کرنے میں وہ کوئی عار محسوس نہیں کرتا تھا کہ احمد مقبول اس کے آئیڈیل رہے تھے ان کئی مقدمات نے خاصی شہرت پائی تھی جس میں انہوں نے مخالف فریق کی جانب سے دھمکیوں کے باوجود انصاف کا سر نیچا نہیں ہونے دیا تھا۔ اسے ان سے بہت ہمدردی تھی۔ اگر ایک بار اس واقعے کی بھنک پریس والوں کو پڑ جاتی تو پھر اسے مشہور ہونے پہ فائز رہے تھے رانیہ ان کی حسین و جمیل نوجوان اکلوتی بیٹی تھی۔ ان کے

مخالفین کے لیے تو یہ سنہرا موقعہ تھا۔ سلیمان کو خوب اچھی طرح اندازہ تھا اس واقعے کو کون کون سے رنگ دیے جائیں گے۔

سجان علیزا کا ماموں زاد تھا یعنی قریبی رشتہ دار۔ اس لیے سلیمان نے گھر میں کسی سے بھی ذکر نہیں کیا وہ اصولوں پہ سمجھوتے کا قائل نہیں تھا نہ اقربا پروری اسے پسند تھی احمد مقبول سے اس نے زور دے کر کہا تھا کہ اب اگر سجان ایسی ویسی حرکت کرے تو وہ اسے ضرور مطلع کریں' وہ اس کا کوئی نہ کوئی حل سوچ لے گا۔ انہوں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے اپنے ساتھ ڈنر کی دعوت دی تو وہ رد نہ کرسکا۔

عالیہ غوری کے آفس جاتے ہوئے رانیہ نے سلیمان کے ساتھ چلنے کی درخواست کی وہ اسے اپنی گاڑی میں لے گیا۔ پنکی فروا کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے رانیہ اور سلیمان کو اکٹھے گاڑی میں جاتے دیکھا تو مہوش کو بتایا۔ مہوش نے نمک مرچ لگا کر دو کی چار کر کے سجان سے جڑ دیا۔

"وہ اونچی ہواؤں میں اڑنے کی فکر میں ہے میں اس کے پر ہی کاٹ ڈالوں گا دل چاہتا ہے۔ ابھی اس کے گھر جاؤں اور بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لاؤں پھر پوچھوں بتا کس کے ساتھ گاڑی میں جا رہی تھی۔" سجان اتنا تعلیم یافتہ ہوتے کے باوجود اس وقت جاہلوں کو مات دے رہا تھا۔ پنکی بھی اسے بڑھاوا دے رہی تھی رانیہ اور سلیمان کو اکٹھے دیکھ کر اسے آگ لگ گئی تھی۔

"مما! علیزا کو چند روز کے لیے بلوائیں ناں بالکل ہی بھول گئی ہے ہم کو۔" پنکی ماں کے پاس بیٹھ گئی۔

"بلواؤں گی کیوں نہیں۔ بڑی مضبوط حیثیت سے اس گھر میں آئے گی پیر صاحب نے علیزا کو حکم کا غلام بنانے کے لیے جو عمل بتایا ہے اس کے لیے علیزا کا یہاں آنا ویسے بھی ضروری ہے۔" پیر صاحب کے ذکر پہ پنکی نے برا سا منہ بنایا مشکل یہ تھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ یہ پیروں کا زمانہ نہیں ہے ذہانت اور عقل سے شکست دینے کا زمانہ ہے جس کے پاس جتنی عقل اور دھوکہ بازی کے جراثیم موجود ہیں وہ اتنا ہی بڑا پیر ہے۔ مہوش آئے روز جو بھاری بھاری رقومات نذرانوں کے نام پہ پیر صاحبان کی تجوریوں میں منتقل کرتی رہتی تھیں' اس سے بھی پنکی کو سخت اختلاف تھا۔

"مجھے یہ تیمور ایک آنکھ نہیں بھاتا ہے۔ میں سعد سے بات کروں گی کہ انوشہ سے علیزا

کے رشتے کی بات کریں۔ اتنے برس ہم نے اسے کھلایا پلایا ہے۔ اس کے ناز اٹھائے ہیں اور وہ اسے لے کر پھر سے اڑ گئی ہے۔'' ان کے لہجے میں زہر ہی زہر بھرا تھا۔ پھر جانے سعد کو انہوں نے کیا سکھایا پڑھایا۔ کس کس طرح سے سجان کی حالت کے واسطے دیے کہ وہ مان گئے لیکن انہوں نے مہوش کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ وہ مان تو گئے تھے خیر اگر وہ نہ بھی مانتے تو انہوں نے کرنی تو اپنی مرضی ہی تھی۔

وہ بڑے ٹھسے سے انوشہ کہاں مٹھائی لے کر گئیں اور سجان کے لے علیزا کا رشتہ طلب کیا۔ وہاں تیمور اور جہانگیر بھی موجود تھے۔ مہوش کی بدتمیزی کی وجہ سے گرما گرمی ہو گئی۔

''انوشہ! منگنی ہوئی ہے کوئی نکاح تو نہیں ہوا جو ٹوٹ نہیں سکتا۔ پھر علیزا پہ زیادہ حق سجان کا ہے۔ اتنے عرصے ہمارے پاس رہی۔ پلی بڑھی میرا احسان ہے یہ کہہ گی مائیں تک بچوں کو نہیں پوچھتی ہیں۔ انہیں چھوڑ کر دور دیس چلی جاتی ہیں۔ یہ بھی خوب ہے۔ ہمیں عین وقت پہ غیروں کی طرح بتایا گیا کہ جی علیزا کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ آپ آ کر منگنی میں شرکت فرمائیں۔'' مہوش نے انوشہ کی نقل اتاری۔ ساتھ ہی اس پہ چوٹ بھی کی تو وہ تلملا گئی۔ تیمور نے اس موقعہ پہ بے مثال قوت برداشت کا مظاہرہ کیا۔

''آپ کو یہ بات پہلے سوچنی چاہیے تھی۔ اب جب سجان کی شادی ہو چکی ہے اور اس کی اور سجان کی عمروں میں خاصا فرق بھی ہے پھر اب جبکہ علیزا کی منگنی ہو چکی ہے اور شادی کا بھی سوچا جا رہا ہے یہ بات جتانی انتہائی نامناسب اور اخلاق سے گری ہوئی بات ہے۔'' تیمور سدا کے مفاہمانہ لہجے میں بولے تو مہوش کو اور بھی تاؤ آ گیا۔

''یہ سب تو سجان کی قسمت میں لکھا تھا۔ رانیہ کا اس کی زندگی میں آنا پھر یہ جھگڑے۔ سب تقدیر کے چکر ہیں۔ رہی عمر کی بات تو مرد مرد کی عمر کون دیکھتا ہے۔ رانیہ بھی سجان سے اچھی خاصی چھوٹی تھی۔ کم از کم آٹھ نو برس کا فرق تو تھا ہی پھر بھی اس کے گھر والوں نے اعتراض نہیں کیا۔'' مہوش کی ڈھٹائی قابل دید تھی۔ تیمور اور انوشہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ جہانگیر پہلے ہی اٹھ کر جا چکے تھے۔

''سوتیلے رشتوں کا کیا اعتبار۔ علیزا کو دنیا کی سمجھ رہی کہاں ہے۔ میں پھر آؤں گی امید ہے۔ تم میری باتوں پہ غور کر کے فیصلہ میرے حق میں کرو گی کیونکہ علیزا تمہاری بیٹی ہے اس گھر میں کسی اور کو اس پہ کوئی اختیار نہیں ہے۔'' وہ اب جذباتی مار مار رہی تھیں۔ اس کے جانے کے

بعد وہ دونوں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

تیمور خود حیران پریشان تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی خود غرض اور بدفطرت خاتون نہیں دیکھی۔ اس طرح کے لوگ کسی طرح کا بھی نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کرتے۔ انوشہ! اس کے باوجود میں کہتا ہوں اگر تمہیں اپنی بھابھی کا فیصلہ منظور ہے تو ہماری پرواہ مت کرو۔''

''تیمور! آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ میں بھی بھابھی کو کسی حد تک جان چکی ہوتی ہیں علیزا کی جہاں منگنی ہوئی ہے شادی بھی وہیں ہو گی سلیمان سے بڑھ کر مجھے اس کے لیے کوئی اور پسند نہیں ہے۔'' وہ قطعی لہجے میں بولی۔

''بلکہ مہوش بھابھی کے تیور دیکھتے ہوئے میں کچھ اور سوچنے پہ مجبور ہو گئی ہوں میں چاہتی ہوں جلد از جلد علیزا کی شادی کر دوں پھر بھابھی جو دل چاہے کرتی پھریں میں اکا بھائی سے آج ہی بات کروں گی مگر آپ سے ایک درخواست ہے آپ بھابھی کی کسی بات کا تذکرہ سلیمان اور علیزا سے مت کیجئے گا۔'' وہ ملتجی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی تیمور نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ جہانگیر انوشہ کی تجویز سے بہت خوش ہوئے۔

''سلیمان آئے تو اس سے بھی پوچھ لیتے ہیں۔'' تیمور نے کہا تو انوشہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ تیمور نے سلیمان سے بات کی تو وہ بہت فکر مند نظر آنے لگا۔

''چچا جان! ان دنوں میں بہت مصروف ہوں دو تین کیس ایسے ہیں جن پہ میری پیشہ ورانہ مہارت کا انحصار ہے میری پوری توجہ ان پہ مرکوز رہنی ضروری ہے میرے روز شب آپ کے سامنے ہیں رات کو ڈھائی تین بجے بھی اگر کال آ جائے تو مجھے ڈیوٹی پہ جانا پڑتا ہے ایسی صورت میں علیزا کو وہ وقت اور توجہ نہیں مل سکے گی جس کی وہ حقدار ہے اگر آپ لوگ میری مانیں تو شادی کو کچھ عرصے کے لیے موخر کر دیں۔'' تیمور نے جہانگیر تک سلیمان کے خیالات پہنچائے کافی دیر وہ کچھ سوچتے رہے۔

''تیمور! فی الحال نکاح پہ اکتفا کر لیتے ہیں سلیمان فارغ ہو گا تو آگے کی دیکھی جائے گی تب تک علیزا بھی ہم سب کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ لے گی۔'' اب سلیمان کے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا اسے ابو کی تجویز سے اتفاق کرنا پڑا۔ بڑی سادگی سے یہ شرعی تقاضا بھی پورا ہو گیا۔ انوشہ نے خود کو ہلکا پھلکا سا محسوس کیا۔ اب مہوش بھابھی کی کارگزاریوں کا اسے خوف نہ

تھا۔ علیزا مضبوط ہاتھوں میں تھی۔

کسی کی ذات میں جھانکا تھا سبز موسم میں
پھر اس کے بعد پھول کھلے عمر بھر کے لیے
ہزاروں بار کسی اجنبی سی منزل سے
مجھے پیام ملا ہے نئے سفر کے لیے

بڑے عرصے بعد سلیمان کو ایسی مکمل فرصت میسر آئی تھی۔ وہ وہ مونی اور سنی کو آئس کریم کھلانے لے گیا۔ تیمور کے ساتھ بازار جا کر ضروری چیزوں کی خریداری کی۔ واپسی پہ تیمور تازہ مچھلی لائے جو علیزا کو بہت پسند تھی۔

''فوراً سے بیشتر فرائی کر ڈالو ورنہ مزا نہیں رہے گا۔'' انہوں نے شاپر اس کے ہاتھ میں تھمائے اور خود سلیمان کے ساتھ اوپر چلے گئے۔ بڑے دن کے بعد اکا بھائی کے ساتھ محفل جمی تھی۔ پرانے قصے اور باتیں چھڑ گئیں۔

''سلیمان یار! علیزا سے کہو دو کپ چائے بنا دے۔''

تیمور نے سلیمان کو اٹھایا۔ علیزا مچھلی کے قتلے تل تل کر پلیٹ میں بچھے ٹشو پیپر پہ رکھتی تھی۔ سلیمان کچھ دیر دروازے میں کھڑا اسے کام کرتے دیکھتا رہا۔

''یوں ہمارے کچن میں کب آمد ہو گئی۔'' اس کے یوں پیچھے سے اچانک مخاطب کیے جانے پہ علیزا اچھل ہی تو پڑی۔

''تیمور چچا کہہ رہے ہیں، دو کپ چائے چاہئیں۔'' وہ مچھلی کا ٹکڑا ٹماٹر کیچپ میں ڈبو کر کھانے لگا۔

''بہت مزیدار ہیں۔ میرے لیے ایسے مزے مزے کے کھانے کب پکاؤ گی۔'' وہ اب اسے آپ جناب کے تکلف کے بجائے بڑی اپنائیت سے تم کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ وہ اسٹول گھسیٹ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ علیزا کو اس کے معنی خیز سوالوں سے گھبراہٹ ہونے لگی، اس نے ساری توجہ چائے بنانے کی طرف مرکوز کر دی۔

سلیمان کی گہری چمک دار آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

''علیزا! وہ دیکھو، تمہارے پاؤں میں لال بیگ۔'' اس نے شرارت سے کہا۔ علیزا کی

حلق سے زوردار چیخ نکلی۔ چمچہ سیدھا چائے کی کیتلی پر جا گرا۔ وہ الٹ کر علیزا کے پاؤں پر آ رہی۔ اوپر جہانگیر اور تیمور ہانپتے کانپتے اترے کہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ سلیمان کچن سے باہر آ گیا۔ اسے اپنی شامت یقینی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خود کو ملامت کر رہا تھا۔ علیزا کے سامنے نہ جانے کیوں وہ غیر سنجیدہ ہو جاتا تھا۔

''علیزا! کسی ریسٹورنٹ میں جا کر لنچ کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے۔'' تیمور نے پوچھا۔ وہ علیزا کو واپسی میں کالج لینے گئے تھے۔

''نیکی اور پوچھ۔ میں نے تو صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا اب پیٹ میں چوہوں نے ریس لگائی ہوئی ہے۔ مونی اور سنی کے لیے بھی برگر پیک کرا لیں گے۔'' وہ خوش ہو گئی تو تیمور نے گاڑی ایک مشہور ریسٹورنٹ کی طرف موڑ لی جہاں وہ اکثر وبیشتر جاتے رہتے تھے۔

کھانے کے دروازہ علیزا کی نگاہ سامنے والی ٹیبل کے گرد بیٹھے افراد پہ پڑی۔ اس کے بالکل سامنے رانیہ تھی اور رانیہ کے سامنے جس شخص کی پشت تھی۔ وہ اسے آنکھ بند کر کے بھی شناخت کر سکتی تھی وہ سلیمان تھا اس کے ذہن میں کوئی غلط خیال تو نہیں آیا البتہ اس نے یہ ضرور سوچا رانیہ بھابھی یہاں سلیمان کیساتھ کیسے؟ سلیمان نے کبھی گھر میں ذکر ہی نہیں کیا تھا ورنہ وہ حیران نہ ہوتی۔

''تایا جان! میں نے آپ کے لیے بطور خاص یہ کباب بنائے ہیں۔'' اس نے آپ کے لیے بطور خاص پہ زور دے کر کہا۔

''علیزا! بیٹی! تم نے کیوں خوامخواہ تکلیف کی۔'' انہوں نے پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لی۔

''تکلیف کیسی۔ بیٹی ہوں آپ کی۔'' اس نے محبت سے سرشار ہوتے ہوئے اپنے بازو ان کے گلے میں ڈال دیے تو وہ نہال ہو گئے۔

''میں رمشہ کو بیاہ دینے کے بعد اکیلا رہ گیا تھا مگر اللہ کو میری تنہائی پہ رحم آ گیا۔ اس نے ایک اور بیٹی مجھے دے دی۔'' وہ شفقت سے اس کے سر کو سہلاتے ہوئے بولے۔ علیزا نے سامنے بیٹھے سلیمان کو مکمل طور پہ نظر انداز کر رکھا تھا۔

''آؤ تم بھی میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔'' انہوں نے دعوت دی۔ آج وہ کھانا کھانے

نیچے نہیں آئے تھے۔ شدید سردی کی وجہ سے ان کی ٹانگوں میں درد شروع ہو گیا تھا۔ اس لیے علیزا اوپر ہی ان کے لیے کھانا لائی تھی۔ سلیمان کھانا کھا کر آیا تھا۔ علیزا نے اسے کبابوں کی ہوا تک بھی نہیں لگنے دی تھی۔ اسے خبر تھی سلیمان کو کباب بہت پسند ہیں پھر اس نے اسے نہیں پوچھا مزے کی بات انکے لیے دودھ گرم کیا۔ انہوں نے اس کے ساتھ دوا لینی تھی۔ پلیٹ سے ڈھک کر دودھ کا گلاس وہ ان کے کمرے میں رکھ آئی۔

''علیزا! بیٹی! سلیمان کے لیے بھی دودھ گرم کیا ہے یا نہیں۔''

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس کے لیے بھی گرم کر دو۔ سارا دن مصروف رہتا ہے۔ آنے جانے کا کوئی وقت ہی نہیں ہے۔ تمہیں زحمت تو ہو گی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ تو سلیمان نے کتاب رکھ کر اسے دیکھا۔ جہانگیر نے علیزا کو شب بخیر کہا اور سلیمان کو دروازے بند کرنے کا کہہ کر اپنے بیڈ روم میں سونے چلے گئے۔ سلیمان نے ٹیرس اور گیلری کا دروازہ بند کیا۔ علیزا دودھ گرم کر چکی تھی اور گلاس میں ڈال رہی تھی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے میرے لیے تکلیف اٹھانے کی۔ میں اپنے کام خود کر سکتا ہوں۔'' سلیمان کا لہجہ بلا کی اجنبیت اور رکھائی سے بھرپور تھا۔ علیزا کے حلق میں نمکین پانی کا گولہ سا اٹکنے لگا وہ وہیں سے مڑی اور تیزی سے نیچے جانے والے زینے کی طرف بھاگی۔ بمشکل تمام آنسوؤں کے پیچھے دھکیل کر وہ پہلی سیڑھی اتری۔ دوسری پہ پاؤں پھسلتے پھسلتے تیسرے زینے پہ بالآخر سلیمان نے اسے جا لیا اور اپنی طرف کھینچا۔

''بہت غصہ آتا ہے تمہیں۔ ایسا کیا کہہ دیا ہے میں نے۔ کتنی دیر سے میرے سامنے بیٹھ کر مجھے نظر انداز کر رہی ہو۔ تایا جان! یہ کباب میں نے بطور خاص آپ کے لیے بنائے ہیں۔ یہ لیں ناں، وہ لیں ناں۔'' سلیمان نے اس کی نقل اتاری۔ وہ سوں سوں کرتی رہی۔

''مجھے کیا پتہ تھا لال بیگ سے اتنا خوفزدہ ہوتی ہو بس اتنی ہی بہادری ہے ابو جان سے مجھے ڈانٹ پڑوا دی اور معذرت کا ایک لفظ تک نہیں کیا۔'' علیزا کی آنکھیں اس کی ڈھٹائی پہ پھیل گئیں۔

''میں معذرت کروں اس بات کی کہ سب نے ہی مجھ سے پوچھا علیزا اب تمہارے

پاؤں میں جلن یا درد تو نہیں ہوتا۔ ایک آپ تھے منہ اٹھا کر گزر جاتے تھے۔'' وہ بے ساختگی و روانی سے کہتی چلی گئی۔ سلیمان کے چہرے پہ مسکراہٹ نے بسیرا کر لیا۔

''میں معذرت ضرور کروں گا مگر پہلے مجھے کباب بنا کر کھلانے کا وعدہ کرو۔''

''ٹھیک ہے فریزر میں پڑے ہوئے ہیں میں کل ہی فرائی کر دوں گی۔'' وہ ایک دم راضی ہو گئی۔

''وعدہ۔ اپنے ہاتھ سے کھلاؤ گی۔'' سلیمان نے اپنی چوڑی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی ایک ثانیے کے لیے وہ ہچکچائی اس نے الفاظ پہ دھیان نہیں دیا تھا۔

''وعدہ۔'' اس نے اپنا ہاتھ سلیمان کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔

''کس بات کا وعدہ۔'' اس نے علیزا کا نازک ہاتھ اپنے مضبوط مردانہ ہاتھ میں قید کر لیا تھا۔

''یہی کہ میں کل آپ کو کباب تل دوں گی۔'' وہ اپنے چہرے پہ جمی اس کی مقناطیسی نگاہوں اور محسوس ہوئی قربت سے بوکھلا گئی۔ نہ جانے کتنی دیر وہ اسے اپنی پرفسوں نگاہوں سے تکتا رہا۔ علیزا کو یوں لگا جیسے صدیاں گزر گئی ہیں۔ سلیمان نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوتے اس کا گلابی پسینہ آلود ہاتھ چھوڑ دیا۔

''آؤ تمہیں نیچے چھوڑ آؤں۔'' اس کا لہجہ بڑا بھاری اور عجیب لگ رہا تھا۔

''میرے پاؤں میں پھر درد ہو رہا ہے۔'' اسے سچ مچ بہت درد ہو رہا تھا۔

''آؤ اٹھا کر کمرے تک چھوڑ آؤں۔'' سلیمان سابقہ کیفیت کے حصار سے نکل آیا اور سچ مچ بازو اس کی طرف بڑھائے۔

''جی نہیں۔'' وہ فوراً گھبرا کر نیچے اتری اور سنبھل سنبھل کر جانے لگی۔

''کل کا وعدہ یاد رکھنا۔'' سلیمان نے مڑتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

''اگر نہ یاد رکھوں تو......'' سلیمان نے منہ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دھمکی دی تو علیزا نے فوراً اندر کی طرف دوڑ لگا دی۔

موتی اور سنی مری جانے کی ضد کر رہے تھے۔ تیمور فارغ ہی نہیں تھا سلیمان نے چند روز کی چھٹی لے رکھی تھی۔ تیمور نے سلیمان سے کہا کہ موتی سنی کے ساتھ علیزا کو بھی مری

گھمالائے۔سنو فال ہو رہی تھی اس لیے دونوں بھائی بہت پر جوش ہو رہے تھے۔موٹی اور سنی سخت سردی کے عادی نہیں تھے پر وہاں بارشوں کے بعد برف باری نے درجہ حرارت کو نقطہ انجماد سے بھی نیچے گرا دیا تھا۔اس کا احساس اسلام آباد کی حدود سے نکلتے ہی انہیں بخوبی ہو گیا۔طویل سڑک پہ دورویہ درخت مناظر کے حسن کو بڑھا رہے تھے۔وہ دو ڑھائی گھنٹے کے سفر کے بعد وہ اپنے ٹھکانے پہ پہنچ گئے۔چوکیدار کی بیوی کو ان کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔اس نے آتشدان میں ڈھیروں لکڑیاں سلگائی ہوئی تھیں۔علیزا تو آتش دان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

وہ تینوں جانے کہاں چلے گئے تھے۔اسے بہت شدید بھوک لگ رہی تھی وہ سہ پہر کے بعد گھر سے نکلے تھے۔اب چھ بج رہے تھے مارگلہ کی پہاڑیوں پہ رات اتر آئی تھی۔محکمہ موسمیات والوں نے ابھی مزید برف باری کی پیش گوئی کی تھی۔تین فٹ برف پہلے ہی پڑ چکی تھی۔اب تیز ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔موٹی اور سنی اور سلیمان باہر سے آئے تو ان کی جیکٹس اور سر کے بالوں میں سفید ذرات چمک رہے تھے۔

"کہاں چلے گئے تھے تم لوگ۔مجھے اتنی شدید بھوک لگ رہی ہے۔"علیزا کچھ خفا خفا سی نظر آ رہی تھی۔اس نے ان دونوں کے لیے ماسٹر بیڈ روم میں اپنے ساتھ بستر لگوایا تھا۔اس الگ تھلگ سے گھر اور اجنبی جگہ سے اسے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔موٹی اور سنی تھکن اور علیزا کی ڈانٹ کی وجہ سے سو چکے تھے۔زیبو اور شرافت کے کمرے کی لائیٹ بھی بجھ چکی تھی۔سلیمان نے جیکٹ پہنی' جرابیں اور شوز چڑھائے۔

"میں باہر جا رہا ہوں۔"اس نے پریشان بیٹھی علیزا کو مطلع کیا تو وہ چونک گئی۔

"آپ ہمیں اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہیں اس ویران گھر میں۔"وہ شاکی لہجے میں بولی۔

"تو پھر آؤ میرے ساتھ۔"سلیمان نے اشارہ کیا۔

"کم آن علیزا! شرافت ہے ناں موٹی اور سنی سوئے ہوئے ہیں۔"وہ اسے تذبذب میں دیکھ کر بولا۔برآمدے سے آگے سارا راستہ برف سے ڈھک چکا تھا۔چاند کی دودھیا روشنی میں ہر شے نے سفید چادر اوڑھی ہوئی تھی پوری کائنات کا حسن جیسے اس وادی میں سمٹ آیا تھا۔

"امیزنگ۔یوں لگتا ہے جیسے جنت خود زمین پہ اتر آئی ہے۔میں نے اس سے پہلے اتنی خوب صورت چاندنی رات نہیں دیکھی۔دیکھو تو تم نے کبھی چاندنی رات میں برف کی بارش کا نظارہ کیا ہے۔کبھی اس حسن کی نزاکت کو محسوس کیا ہے جس طرح میں کر رہا ہوں۔"علیزا خود

مبہوت ہو کر اس نظارے کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ تو پولیس آفیسر ہیں کمال ہے' آپ کے منہ سے ایسی شاعرانہ نازک باتیں سن کر مجھے حیرانی ہو رہی ہے۔"وہ صاف گوئی سے بولی تو وہ مسکرا کر رہ گیا۔

"میں اندر جا رہی ہوں مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔"علیزا نے اپنے ٹھنڈے برف ہاتھ آپس میں رگڑے۔سردی کی شدت سے اس کے دانت مسلسل بج رہے تھے۔وہ اندر چلی گئی تو سلیمان بھی مڑا۔آتشدان میں کوئلے بجھ کر راکھ بنتے جا رہے تھے۔موٹی اور سنی کے کمرے میں بجلی کا ہیٹر چل رہا تھا۔سلیمان نے بند کر دیا کیونکہ کمرا گرم ہو چکا تھا۔

"ایک کپ چائے پینے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"سلیمان نے اسے آفر کی۔علیزا کو نیند آ رہی تھی پر سلیمان کی آفر کو وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔اس نے چائے خود بنائی۔سلیمان اپنے کمرے میں نیم دراز ٹی وی دیکھ رہا تھا۔جو ٹی وی لاؤنج سے شرافت نے یہاں رکھا تھا۔علیزا نے اس کے دروازے پہ ہلکے سے دستک دی تو وہ بڑا حیران ہوا۔

"آ جاؤ۔آج تو حیران کر رہی ہو۔"اس نے چائے اس کے ہاتھ سے لے لی۔

"گرم بستر میں بیٹھ کر چائے پینے کا لطف ہی کچھ اور ہے خاص طور سے سردیوں میں"

"یہ کیا کہ بندہ سوتے وقت چائے پی لے۔ساری نیند کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔"اس نے اپنی ستواں ناک سکیڑی۔

"میں تو سونے لگی ہوں۔"وہ اٹھی۔

"آؤ ناں۔کچھ دیر اور بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔بڑا سحر آلود سا ماحول ہو رہا ہے۔" اس نے جاتی علیزا کو روک لیا۔عین اسی وقت اس کے موبائل پہ بپ بجنا شروع ہو گئی۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم اسلام سلیمان! اس وقت کیا کر رہے ہیں۔"دوسری طرف رانیہ تھی۔

"رومانس جھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔"علیزا کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو اس نے خفت سے منہ موڑ لیا۔دوسری طرف رانیہ کے اعصاب تن گئے۔

"بھئی آئی ایم ساری۔دراصل موسم اتنا خوب صورت ہو رہا ہے' ایسے میں دل بڑی انہونی انہونی سی خواہشیں کرتا ہے۔"وہ ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے گزشتہ جملے کی وضاحت کرتے

ہوئے بولا۔علیزا چپکے سے موقعہ غنیمت جان کر چلی گئی۔

''کیا ہو رہا تھا۔'' رانیہ کے ساتھ اس کی جو ملاقاتیں ہوئی تھیں انہوں نے اسے کافی اپنائیت بخش دی تھی۔

''ہونا کیا تھا۔ابھی ابھی چائے پی ہے' رہی سہی نیند بھی اڑ گئی ہے جبکہ باقی سب نرم گرم بستروں میں محوخواب ہیں۔''

''کیا آپ کو کوئی خواب نہیں ستاتا۔'' رانیہ نے لہجہ کافی محتاط رکھا تھا پھر بھی وہ اس کے سوال کو سمجھ گیا۔

''اتنا وقت ہی نہیں ملا کہ خواب ستاتے۔میں نے کھلی آنکھوں سے کبھی خواب دیکھنے کی جرات ہی نہیں کی مگر اب دل چاہتا ہے کہ کسی کی آنکھوں سے خواب چرا لوں۔'' وہ بہت دھیمے لہجے میں بولا۔

''بہرحال آپ بتائیں۔آپ کی نیند کیوں اڑ گئی ہے سلیمان۔''

''مری کے برف زاروں میں جب انسان میری طرح اکیلا ہو تو اس کی نیند تو اڑے گی ہی ناں۔''

''اوہ امیزنگ تو آپ مری میں ہیں۔سنا ہے وہاں سنو فال ہو رہی ہے۔مجھے تو یہ سب بہت فیسی نیٹ کرتا ہے۔''

''آپ کو کرتا ہے ورنہ کچھ لوگ تو مارے ڈر کے کمرا بند کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔'' وہ ہنسا۔

''آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا اتنی رات گئے فون کرنے پر۔''

''ارے نہیں نہیں رانیہ! کیسی غیروں جیسی بات کرتی ہیں۔'' اس نے فوراً ٹوکا تو وہ خوش ہو گئی۔کچھ دیر بعد رانیہ نے فون بند کر دیا۔

◉

''سلیمان! کیس عدالت میں چلا گیا ہے۔مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے' جانے سجان کا کیا ری ایکشن ہو۔'' وہ بہت فکرمند تھی۔

''ڈرنے کی کیا بات ہے۔آپ مطمئن رہیں۔ویسے اگر آپ برا نہ مانیں تو میں پوچھ سکتا ہوں ایسی کیا بات جو آپ اب تک اپنے شوہر سے اتنی خوفزدہ رہتی ہے، میں نے نوٹ کیا ہے جونہی سجان کا ذکر آتا ہے۔آپ کا چہرہ زرد پڑ جاتا۔'' رانیہ کے چہرے پہ کرب و اذیت کے

آثار ابھر آئے تھے۔

''ایسی کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔'' رانیہ نے اسے ٹالا۔سلیمان کوئی بچہ تو نہیں تھا جو سمجھ نہ سکتا کہ اسے بہلایا گیا ہے۔

''سلیمان! میں نے اس گھر میں جو دن بھی گزارے ہیں' بہت گھٹ گھٹ کر گزارے ہیں۔اب بھی وہ وقت یاد آنے پہ مجھے تھرتھری آ جاتی ہے سوائے علیزا کے مجھے کسی سے بھی بھلائی کی امید نہیں تھی۔وہ سب سے مختلف تھی سجان کی خودغرض و بے حس مما اور بہنوں سے قطعی الگ تھلگ۔'' وہ بیتے دنوں میں کھو گئی تھی۔

سلیمان اس کے تبصرہ پہ خاموش رہا اور سامنے پڑی کافی کی پیالی اپنے لبوں سے لگا لی۔مقبول ہاؤس کے مکینوں کے نزدیک وہ تقریباً اب گھر کا فرد سا بن گیا تھا۔وہ خود سب سے اپنائیت محسوس کرتا تھا۔رانیہ کی ادھوری باتوں سے اسے الجھن سی ہونے لگی تھی۔دن بھر اس کا واسطہ بھانت بھانت کے لوگوں سے پڑتا تھا جن میں سے ہر ایک کے پاس اپنی ہی الگ کہانی ہوتی تھی۔اس عرصے میں وہ چہرے پڑھنے کا فن کچھ کچھ جان چکا تھا۔مگر رانیہ کا چہرا اسے کوئی پراسرار کہانی سنتا محسوس ہوتا تھا جو اس نے دل کے نہاں خانوں میں محصور کر رکھی تھی۔جانے اس میں رانیہ کی کون سی بہتری یا مصلحت تھی جو وہ اس سے چھپا رہی تھی۔

''اگر سجان سے آپ کو کوئی ایسا دکھ ملا ہے جو آپ کے لیے ناقابل برداشت یا ناقابل بیان ہے تو میں اسے جاننے پہ اصرار نہیں کروں گا مگر اتنا ضرور کہتا ہوں کہ مشکل میں آپ مجھے اپنے ساتھ پائیں گی۔جانے کیوں آپ سے میں بہت ہمدردی محسوس کرنے لگا ہوں۔'' اس نے رانیہ کے ہاتھ پہ تھپکی دی تو اس کے تن بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔اسے کچھ انوکھا سا محسوس ہوا۔سجان کے وحشت انگیز لمس نے کبھی اس کے اندر ایسی سنسنی نہیں پیدا کی تھی۔سلیمان نے بڑی مشکل سے ہمدردی کی جگہ لفظ لگاؤ زبان تک آنے سے روکا تھا۔حقیقت بھی یہی تھی۔رانیہ جیسی شائستہ، مہذب، تعلیم یافتہ، نرم زبان حسین لڑکی کو کون ناپسند کر سکتا تھا۔اس نے مشکل میں سلیمان کو سہارا بنایا تھا۔رفتہ رفتہ یہ ملاقاتیں اس کے اندر کچھ نئے احساسات جگا رہی تھیں۔وہ کبھی کبھی دل میں الجھن محسوس کرتا، جانے اسے رانیہ سے لگاؤ تھا یا صرف ہمدردی۔

''ٹھیک ہے، کبھی بھی مشکل میں میں آپ ہی کو آواز دوں گی۔'' وہ جواباً تشکرانہ انداز میں بولی۔سلیمان اٹھ کھڑا ہوا۔

"کھانا کھا کر جائیے گا۔" وہ اصرار کر رہی تھی مگر اس نے سلیقے سے معذرت کر لی۔
رانیہ گیٹ تک اسے چھوڑنے آئی۔ اس کی گاڑی کو وہ سڑک پہ دور تک جاتا دیکھتی رہی۔

"سجان! اٹھارہ تاریخ، کو عدالت میں پیشی ہے۔ تیار رہنا۔" مہوش نے جلے بھنے انداز میں اسے ایک بار پھر یاددہانی کروائی تو وہ چیخ اُٹھا۔

"کیوں بار بار یاد دلاتی ہیں مجھے۔ میرا جی چاہتا ہے' میں سب کچھ تباہ کر دوں۔" اس کے چہرے کے نقوش غصے کی زیادتی سے بگڑ کر عجیب سے ہو گئے۔ میں رانیہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اسے قتل کر دوں گا۔ قیمہ بنا دوں گا میں علیزا کو بھی مار دوں گا" وہ دیوانہ وار دیوار پہ مکے برسانے لگا۔ وہ ہوش وخرد سے بالکل بیگانہ لگ رہا تھا۔ مہوش کو اس سے خوف سا محسوس ہوا۔

"مما! بلائیں ناں علیزا کو۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔" وہ اسی مجنونانہ انداز میں انکے شانے جھنجھوڑنے لگا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں علیزا کو بہو بنا کر ضرور لاؤں گی چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔ تم بس ذرا صبر اور عقل سے کام لو۔" وہ اسے سمجھانے لگیں۔ سجان کا چہرہ چمک اٹھا۔

❂

"می می! آپ یہاں۔" علیزا چھٹی میں گیٹ سے باہر آئی تو مہوش کو دیکھ کر حیران ہوئی مگر انہوں نے اسے زیادہ حیران ہونے کا موقعہ نہ دیا اور ہاتھ پکڑ کر پاس پارک کی ہوئی اپنی گاڑی میں بٹھالیا۔ وہ ہیں ہیں کرتی کرتی رہ گئی اور مہوش نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"کتنے روز ہو گئے ہیں' میں تو تمہیں دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔ تمہاری ماں بڑی سنگدل ہے۔ ماموں کے گھر جانے پہ پابندی لگادی ہے' اس لیے تو میں آج تمہارے کالج آ گئی ہوں۔ تمہاری صورت دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ آؤ سامنے والے ریسٹورنٹ میں لنچ کریں گے' ساتھ تم سے باتیں بھی ہوں گی۔"

پھر کھانا کھانے کے دوران مہوش نے وہ دل دہلا دینے والے انکشافات اس پہ کیے کہ علیزا کے حلق میں نوالے اٹکنے لگے اور کھانا دوبھر ہو گیا۔ مہوش لوگوں کی پروا کیے بغیر پھکوں پھکوں رو رہی تھیں اور علیزا سدا کی رحمدل خود کو سنبھالتے ہوئے انہیں چپ کروا رہی تھی۔ دل میں غم وغصے کا ایک طوفان امڈ رہا تھا' بظاہر وہ پرسکون تھی۔

"می می پلیز! چپ ہو جائیں۔ لوگ ادھر ہی دیکھ رہے ہیں۔" علیزا نے منت کی تو انہوں نے دوپٹے سے آنسو خشک کیے۔

علیزا! مجھے تو تمہاری فکر کھائے جا رہی ہے۔ بن باپ کی بچی کا کیا بنے گا۔ انوشہ اتنی لالچی اور سنگدل نکلے گی۔ مجھے ہرگز اندازہ نہ تھا۔ لو اپنے ہی کلیجے کے ٹکڑے کو بھینٹ چڑھا دیا اور وہ کمینہ سلیمان کتنی لڑکیوں کو چکر دیے ہوئے ہے۔ رانیہ بھی اس کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے۔ عورت سجان جیسے محبت کرنے والے شوہر سے آزادی مانگ رہی ہے۔ میرے بچے نے کیا کچھ نہیں کیا اس آوارہ کے لیے۔ وہ تو عذاب خداوندی سے بھی نہیں ڈرتی۔ مزے سے اس کے ساتھ گل چھرے اڑا رہی ہے۔ انوشہ نے سراسر گھاٹے کا سودا کیا ہے۔ اسے بن باپ کی بچی کے ساتھ ایسا کرتے ہوئے خوف نہیں آیا۔ تیمور بھی تو برابر کا شریک ہے' تب ہی تو تمہیں بھائی کے آوارہ سپوت کے ساتھ نکاح جیسی زنجیر میں باندھ دیا تا کہ تمہارے باپ کی دولت سے عیش کرے اور کرائے۔ تمہارے باپ نوید کے پاس اللہ اسے غریق رحمت کرے بہت دولت تھی۔ سب کچھ تو تمہارے لیے ہی چھوڑ گیا ہے۔ انوشہ نے بڑے عیش کیے۔ تیمور نے ان ہی پیسوں سے لیدر گارمنٹ کا بزنس شروع کیا تھا اور آج لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔ سلیمان نے نئی گاڑی کس کے پیسوں سے خریدی؟ مونی اور سنی کس کے بل پہ عیش کر رہے ہیں؟ انوشہ نے سب کے ساتھ مل کر اندھیر مچا رکھی ہے۔ اسے تم پہ ترس بھی نہیں آتا۔ جب تم چھوٹی سی تھیں تو میں نے انوشہ سے تمہارے اور سجان کے رشتے کی بات کی تھی۔ اس نے بڑی نخوت سے انکار کر دیا۔ اب بھی مجھ سے اور سعد سے مشورہ کیے بغیر بالا ہی بالا تمہیں اس کرپٹ پولیس آفیسر کے پلے باندھ دیا۔ تم سلیمان کے آگے کیا حیثیت رکھتی ہو۔ اتنی لڑکیاں روزانہ اس کے ہاتھوں سے گزرتی ہیں تمہارا تو کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ ادھر میرا سجان رانیہ کے ہاتھوں تباہ ہو چکا ہے ادھر تم تباہی کے دہانے پہ ہو۔ انوشہ سے شادی کے وقت تمہیں تیمور نے ساتھ رکھنے سے انکار کر دیا۔ خود انوشہ تیمور کی محبت میں اندھی ہو چکی تھی۔ شادی کے بعد تمہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے ماں بن کر تمہیں پالا ہے۔ میں نے بھی تم پہ سختی کی تا کہ تم ماں کی غیر موجودگی میں مثالی لڑکی بنو اور آج ہر شخص تمہاری تعریف کرتا ہے۔ انوشہ کو میری قربانیوں کا کوئی احساس نہیں ہے۔" مہوش کھڑی گاڑی میں زار و رو رہی تھیں۔ علیزا ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھی۔

"آؤ کافی دیر ہو چکی ہے۔ میں تمہیں ڈراپ کر دوں۔ انوشہ کو مت بتانا ورنہ وہ تیمور

کی شہ پہ تمہیں کھڑے کھڑے بے عزت کر کے گھر سے نکال دے گی اور خود کو تمہاری ماں سمجھنے سے ہی انکاری ہو جائے گی۔ میرا موبائل نمبر لکھ لو۔ کوئی بھی مشکل پریشانی یا ایسی ویسی بات ہو تو مجھے اسی وقت کال کر سکتی ہو۔ میرے گھر اور دل کے دروازے ہمیشہ سے تمہارے لیے کھلے ہیں اور کھلے رہیں گے۔" انہوں نے محبت سے اسے گلے لگایا اور الوداعی بوسہ اس کی پیشانی پہ ثبت کیا۔ وہ انہیں جاتا ہوا دیکھتی رہی حتیٰ کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔ انہوں نے علیزا کو ایسا بم بنا کر بھیجا تھا جو بلاسٹ ہونے کی صورت میں تباہی دکھ اور آنسوؤں کی نشانیاں اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے تلافی کی کوئی صورت ہی نہیں نظر آتی۔

داخلی گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی اسے انوشہ کی پریشان صورت نظر آئی تو اس کی نفرت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ دھوکہ لالچ اور خود غرضی جیسے الفاظ اس کے ذہن میں پھرنے لگے۔

"علیزا!! اتنی دیر کیوں لگا دی۔ ڈرائیور بھی خالی واپس آ گیا۔ میں اب گھبرا کر سلیمان کو فون کرنے لگی تھی۔" وہ تقریباً ہانپتی کانپتی اس کے پاس آئی تو علیزا نے سرد نگاہوں سے اسے گھورا اور اپنا بازو چھڑا کر اندر بڑھ گئی۔ دروازہ لاک کرنے کے بعد وہ جی بھر کر روئی پھر بھی دل کی آگ سرد نہیں ہوئی۔ تہس نہس کر دینے کا باغی جذبہ اس کے اندر سے لاوا بن کر پھٹ پڑنے کے لیے بیتاب تھا۔ وہ انوشہ سمیت کسی کی بھی صورت دیکھنے کی روادار نہ تھی تبھی تو انوشہ دروازہ پیٹ پیٹ کر چلی گئی۔ وہ روتی رہی۔ مغرب کی اذان ہوئے کافی وقت گزر گیا تھا جب اس نے کمرے سے باہر قدم رکھا۔ انوشہ پریشان صورت لیے سامنے برآمدے میں مونی اور سنی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں بھی چپ چپ تھے۔ انوشہ اس کی طرف لپکی۔

"علیزا!! بتاؤ تو سہی کیا ہوا ہے۔ میری بیٹی کو کسی نے کچھ کہہ دیا ہے۔" لگ رہا تھا وہ ابھی رو پڑے گی۔

"خبردار جو آپ نے مجھے بیٹی کہا۔ میں کسی کی بھی بیٹی نہیں ہوں۔ تیمور صاحب سے بھی کہہ دیجیے۔ اب مزید ڈرامہ بازی نہیں چلے گی۔ آپ ماں نہیں ڈائن ہیں' آپ اور آپ کا شوہر بے انتہا لالچی اور سنگدل ہیں۔ میرے باپ کے مال سے سب عیش کرتے رہے مگر اب اور نہیں۔ میں زیادہ دن کسی کو فائدہ نہیں اٹھانے دوں گی۔ میری آنکھیں ہی اب کھلی ہیں۔ مجھے ہوش ہی اب آیا ہے "سب نے میرے ساتھ گیم کھلا ہے۔" اس کی آنکھوں سے نفرت کے شعلے لپک رہے تھے جس نے انوشہ کے وجود کو خاکستر کر دیا تھا۔

باہر سے آتے تیمور ایک ایک لفظ سن چکے تھے۔ انوشہ سے زیادہ ان کی حالت خراب تھی۔ وہ تو لڑکھڑاتے قدموں سے علیزا کے آگے سے ہٹ گئی اس کے پیچھے تیمور بھی آ گئے۔

"انوشہ! تمہیں خاموش نہیں رہنا چاہیے تھا۔" علیزا کے منہ میں جس کی زبان بول رہی ہے۔ تم بھی اسے اچھی طرح جانتی ہو اور میں بھی۔ مہوش اس حد تک کر سکتی ہیں۔ مجھے اس کی امید نہ تھی۔ علیزا کے دل و دماغ میں یہ زہر انہوں نے ہی انڈیلا ہے۔ بچپن سے ہی وہ ان کے اشاروں پہ چلتی آئی ہے۔ انوشہ! تصور کرو۔ سوچو تو علیزا تمہارے ساتھ ہم سب کو بھی غلط سمجھ رہی ہے۔ اکا بھائی سنیں گے تو انہیں سب سے زیادہ دکھ ہوگا۔" تیمور اپنی کنپٹیاں مسلتے ہوئے از حد پریشان تھے۔ مونی اور سنی گھر کے ماحول کی وجہ سے الگ سے ہوئے تھے۔

گاڑی کے ہارن کی آواز پہ علیزا نے کھڑکی سے پردہ سرکا کر گلاس ونڈو سے جھانکا۔ سلیمان گاڑی اندر لا رہا تھا۔

"اس رانیہ کو میں کتنا شریف سمجھتی تھی، مجھے اس سے ہمدردی تھی کہ کتنی مظلوم ہے اور وہ کیا سے کیا نکلی اور سلیمان جو بظاہر بہت باکردار اور مضبوط نظر آتا ہے۔ کتنا پست کردار کا فلرٹی شخص ہے۔ میں نے سلیمان کے حوالے سے کتنے خواب دیکھ ڈالے تھے۔ میں سب خوابوں کو آنکھوں سے نوچ ڈالوں گی۔ مگر کیا یہ اتنا آسان ہوگا؟"

وہ سلیمان کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھ رہی تھی اور سسک رہی تھی۔ میں کتنی اکیلی ہوں۔ میرے ارد گرد سب اپنے ہیں مگر کوئی بھی اپنا نہیں ہے۔ سلیمان کو اسی طرف آتا دیکھ کر اس نے پردے برابر کر دیے۔

قرب میسر ہو تو پوچھیں درد ہو یا درماں ہو
دل میں تو آن بسے ہو لیکن مالک ہو یا مہماں ہو
دردی آگ سے دوری بہتر' قربت کا انجام ہے راکھ
آگ کا کام فروزاں ہونا راکھ ضرور پریشاں ہو
سودا عشق کا سودا ہم نے جان کے جی کو لگایا ہے!
عشق پہ صبر و سکوں کا دشمن پیدا ہو یا پنہاں ہو
عشق وہ آگ کہ جس میں تپ کر سونا کندن بنتا ہے
آگ میں تجھ کو کچھ نہیں ہو تو اس آگ میں بریاں ہو

وہ کیا کیا سوچ گی۔ سلیمان کب کا اوپر جا چکا تھا۔ وہ بھٹکی روح کی مانند دوبارہ کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ رات کے سناٹے کو توڑتی فون نمبرز کا خیال آیا۔ وہ بیڈ پہ رکھا موبائل اٹھا کر ممی کا نمبر ملانے لگی۔ دوسری طرف سے مہوش کی غنودگی میں ڈوبی غصیلی آواز آئی تو اس نے بولے بغیر موبائل آف کر دیا۔

⊛

"سلیمان! دو پیشاں گزر چکی ہیں مگر ابھی تک کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔"
کمرہ عدالت سے باہر آتے ہی رانیہ نے سلیمان سے سوال کیا۔ وہ اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔ رانیہ کو ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ عدالتی کارروائیاں کتنی سست ہوتی ہیں۔ سلیمان اسے یہی سمجھا رہا تھا۔

"رانیہ! ابھی تو صرف دو پیشاں گزری ہیں۔ اتنی جلدی کہاں پیش رفت ہو گی۔ یہاں تو سالوں گزر جاتے ہیں کیس کا فیصلہ ہوتے ہوتے۔ آپ جیسے واقعات میں فریقین عدالت سے باہر ہی کچھ دے دلا کر معاملہ ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"سلیمان! عالیہ کہہ رہی تھیں کہ انہیں ایک ایسا گواہ درکار ہے جو سجان کا قریبی رشتہ دار یا دوست ہو اور میرے حق میں گواہی دے۔ اس طرح کیس مضبوط ہو گا۔"

"سجان کا ایسا کون سا رشتہ دار ہے؟ انوشہ چچی کی شادی ہو گئی تھی اور وہ سنگاپورہ چلی گئیں۔ وہ سجان کے کردار کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں کیا جانتی ہوں گی۔ باقی کیا آپ سجان کے والدین اور بہنوں سے یہ توقع رکھتی ہیں کہ وہ عدالت میں آ کر آپ کے موقف کی تائید کریں گی۔ امپاسبل۔" سلیمان نے اسے حقائق سے روشناس کرایا تو وہ مایوس ہو گئی مگر علیزا کا نام ذہن میں کسی تارے کی طرح چمکا اور وہ پرجوش ہو گئی۔

"علیزا۔ ہاں علیزا بچپن سے وہیں پلی بڑھی ہے۔ وہ سب کچھ جانتی ہے۔ وہ ضرور میرے حق میں گواہی دے گی۔"

"رانیہ! سجان اس کا رشتہ دار ہے، وہ سجان کی کزن ہے۔ کیا وہ ایسا کر سکے گی۔ اس طرح تو انکے تعلقات بگڑنے کا خدشہ ہو گا۔ مجھے نہیں امید کہ وہ عدالت تک آئے گی۔ کوئی اور شخص ڈھونڈیں مثلاً سجان کے گھر میں مختلف کام کرنے والے ملازم وغیرہ۔ کیونکہ ملازم مالکوں کے کردار ہر رنگ سے واقف ہوتے ہیں۔ کوئی ایسا شخص ڈھونڈنا پڑے گا جو ان کے گھر کام کر چکا ہو۔" سلیمان بالکل درست پہلوؤں پہ اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔

"مجھے کچھ کچھ یاد تو آ رہا ہے۔ سجان نے ایک بار معمولی سی غلطی پہ گھر میں صفائی کرنے والی زینو سے سخت مار پیٹ کی تھی۔ وہ خود ہی اس کے بعد نوکری چھوڑ کر چلی گئی مجھے اتفاق سے اس کا گھر پتہ ہے اگر وہ اب تک وہیں رہتی ہوئی تو......؟

"دیٹس اے پوائنٹ۔ اس کو گواہی دینے کے لیے راضی کرنا میرا کام ہے۔ میں علیزا کو تمام حقائق سے آگاہ کر دوں گا پھر جو اس کی مرضی ہوئی۔"

"تھینک یو سو مچ سلیمان! آپ تو واقعی میرے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئے ہیں جہاں میرے حوصلوں کی کمزور دیوار گرنے کے قریب ہوتی ہے آپ سہارا دینے آ جاتے ہیں۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتی۔" وہ بہت ممنون نظر آ رہی تھی۔

⊛

سلیمان کو کچھ خبر نہیں تھی۔ گھر میں کتنا بڑا طوفان آیا ہوا ہے۔ اس پورے ہفتے میں وہ بہت مصروف رہا تھا۔ ناکافی نیند اور بھاگ دوڑ نے اسے تھکا ڈالا تھا۔ اس لیے سب کے ساتھ مل بیٹھنے کی خواہش بہت شدید ہو گئی تھی۔

شام کے پانچ بجے کے قریب وہ گھر میں داخل ہوا تو خلاف معمول سناٹا سا محسوس ہوا۔ موئی اور سنی بھی کہیں نظر نہیں آ رہے تھے نہ انوشہ دکھائی دے رہی تھی۔ تیمور بھی ابھی تک نہیں آئے تھے۔

"یہ علیزا ابھی نہیں ہے۔" اس نے خود کلامی کی۔ دروازے سب کھلے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کوئی نہ کوئی گھر میں موجود ہے۔ اس نے لاؤنج کے بعد کچن میں جھانکا اور پھر علیزا کے کمرے کا دروازہ دھکیلا۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اسے اطمینان سا ہوا۔ تھکا ہونے کے باوجود وہ اس کے انتظار میں ہیں بیٹھ گیا حالانکہ دل چاہ رہا تھا۔ نہا کر پہلے فریش ہو جائے۔ دس گیارہ منٹ کے انتظار کے بعد باتھ روم کا دروازہ کھلا اور علیزہ برآمد ہوئی۔ اس نے سلیمان کو نہیں دیکھا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں بال سلجھانے لگی۔ سلیمان کی طبیعت نکھری ستھری علیزا کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

کالے اور سفید رنگ کے امتزاج سے سجے شلوار قمیص میں اس کی اجلی رنگت اور بھی سفید لگ رہی تھی۔ وہ پٹہ بیڈ پہ پڑا ہوا تھا۔ گیلے بالوں نے اس کی پشت کو بھی گیلا کر دیا تھا۔ برش کرنے کے بعد وہ ڈوپٹہ اٹھانے کے لیے بیڈ کی طرف مڑی۔ اس لمحے اس کی نگاہ سلیمان کی

طرف اٹھ گئی۔ پہلے حیرت اور پھر نفرت نے اس کی آنکھوں کا گھیراؤ کیا۔ اسے سلیمان پہ نگاہ پڑتے ہی سب کچھ یاد آ گیا۔

''السلام علیکم۔'' اس نے بڑے خوش گوار موڈ میں کہا۔

''کافی دیر سے بیٹھا ہوا ہوں۔ باقی سب گھر والے کہاں ہیں؟۔''

''معلوم نہیں۔'' اس نے سلیمان کے سلام کا بھی جواب نہ دیا اور انتہائی سرد لہجے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ ڈوپٹہ سر پہ لیا اور باہر کا رخ کیا۔ سلیمان کو اس کا رویہ خلاف معمول سا محسوس ہوا۔ اس کا سبب بھی جان چکا تھا۔ تین روز پہلے ہی تو علیزا کی سالگرہ تھی۔ وہ رانیہ والے کام کے باعث اسے وش نہیں کر سکا تھا نہ گفٹ لیا تھا۔ اس کا خیال تھا' وہ اسی وجہ سے اکھڑی اکھڑی سی ہے۔ آج تھانے سے نکلتے ہی اس نے بازار کا رخ کیا تھا اور علیزا کے لیے گفٹ خریدا تھا۔ اسے علیزا کی خفگی پہ پیار سا آ گیا۔

''علیزا! فٹافٹ چائے بنا کر اوپر ہی لے آؤ۔ تمہارے لیے میرے پاس سرپرائز ہے۔''

''آپ تو خود میرے لیے سراپا سرپرائز ہیں اب اور کون سا سرپرائز رہ گیا ہے اور آئندہ اس انداز میں مجھ پہ حکم مت چلائیے گا۔ میں آپ کی زرخرید نوکرانی یا غلام نہیں ہوں۔'' علیزا کا لہجہ کچھ اور بھی کڑوا اور روکھا سا ہو گیا۔

''اچھا بیوی تو ہو ناں۔ میں نے محبت دے کر تمہیں خریدا ہے اور تم غلام کہاں ہو بلکہ تم تو......'' وہ اس کے کڑوے لہجے کو میٹھے گھونٹ کی طرح پی گیا اور اس کی راہ میں حائل ہو کر اسے شرارت سے تکنے لگا۔

''ہٹ جائیں میرے راستے سے ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گی۔'' علیزا نے اس کے سینے پہ دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے اسے دھکا دیا۔ سلیمان نے کمال اطمینان و جرات سے کام لیتے ہوئے اس کے آتش فشاں بھرے نازک وجود کو بازوؤں کے حصار میں مقید کر لیا۔ آج سے پہلے اس نے کبھی ایسی پیش قدمی نہیں کی تھی۔ شاید تنہائی اور علیزا کے ناراض روپ نے اس جرات پہ اکسایا تھا ورنہ وہ ہمیشہ ایک حد کے اندر رہتا تھا۔

''اتنی ناراضی اور غصہ میری جان! تم پہ بجتا نہیں ہے۔'' سلیمان علیزا کی طرف جھکا۔ اس کے انداز تخاطب اور بے باکی نے علیزا کو گویا بارود کے ڈھیر پہ بٹھا دیا۔ اس نے بمشکل سر کو اٹھاتے ہوئے سلیمان کے بازو میں پوری قوت سے اپنے ناخن گاڑ دیے۔ سلمان نے بازو الگ کر لیے۔

''آئی ایم سوری علیزا! ذرا بہک گیا تھا مگر تم تو آج بارود بنی ہوئی ہو۔'' اس کے انداز میں حیرت کے ساتھ شرارت بھی تھی۔

''آپ کہاں کہاں ذرا بہکتے ہیں۔ مجھے بتا سکیں گے۔'' علیزا نے جلتی سلگتی نگاہوں سے اسے گھورا۔

''علیزا! سچ کہوں ایمانداری سے آج پہلی بار ایسا ہوا ہے تم میری جائز و قانونی منکوحہ ہو' اس وجہ سے خود پہ سے آج ضبط و اختیار کھو دیا۔'' وہ واقعی سچ بول رہا تھا۔ مگر علیزا کی نگاہوں اور عقل پہ نفرت و انتقام کا ایسا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا جس کے پیچھے ہر سچائی روپوش ہی رہتی ہے۔

''تو پھر یہ رانیہ کا کیا چکر ہے جس کے ساتھ آپ دن رات گل چھرے اڑاتے پھر رہے ہیں۔''

''علیزا پلیز' اب آگے ایک لفظ نہ کہنا۔ وہ ایک دکھی لڑکی ہے۔ میں اس کی اخلاقی مدد کر رہا ہوں۔''

''ہاہا! رانیہ اور دکھی لڑکی' اخلاقی مدد۔ ویسے اس طرح کی دکھی لڑکیوں کی آپ کتنی بار مدد کر چکے ہیں۔'' انتہائی طنزیہ انداز اور استہزائیہ لہجہ۔ وہ ہنسی تو سلیمان کے دماغ میں بھی آگ بھر گئی۔

''تم اس وقت بدگمانی کی انتہائی حد پہ کھڑی ہو۔''

''مجھے ہوش ہی اب آیا ہے۔ آپ سب کے لالچی، سنگدل اور بے رحم چہرے صاف طور پر مجھے نظر آ رہے ہیں۔ آپ سب انتہائی گھٹیا اور کمینے......'' اس کی آواز بہت بلند تھی۔ سلیمان کا ہاتھ اٹھا۔ اس سے پہلے کہ وہ علیزا کی طرف بڑھتا' تیمور نے راستے ہی میں اس کے فضا میں معلق اٹھے ہاتھ کو روک لیا۔

''جسٹ کول ڈاؤن سلیمان پلیز کم آن۔'' وہ اسے بمشکل تمام وہاں سے لے جانے میں کامیاب ہوئے۔ وہ آفس سے آئے تو علیزا کے کمرے سے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ تیمور نے بھی سب کچھ سن لیا تھا۔ سلیمان کا غضب آلود چہرا بتا رہا تھا کہ علیزا اس کے کانوں میں بھی زہر انڈیل چکی ہے۔

''بیٹھو یہاں۔ یہ لو پانی پیو۔'' تیمور نے گلاس اس کی طرف بڑھایا جو اس نے اسی وقت پرے اچھال دیا۔ گلاس چکنا چور ہو گیا۔ تیمور نے پوری قوت سے اسے قابو کر رکھا تھا۔ اس کی حالت بپھرے سانڈ کی سی ہو رہی تھی۔

''اس نے ہم سب کو کمینہ لالچی' اور گھٹیا کہاں ہے۔ اسے جرات کیسے ہوئی اتنی بڑی بات کرنے کی۔ اس گھر میں اسے بے پناہ محبت ملی' عزت ملی' اعتماد ملا اور اس نے یہ صلہ دیا ہے۔ اگر ابو جانتے اس کا یہ رویہ دیکھ لیا تو شاید ان کا دل ہی رک جائے۔ ہٹیں آگے سے۔ مجھے اس سے پوچھنے تو دیں۔'' وہ پھر بے قابو ہو گیا۔

''سلیمان پلیز۔ اس وقت ہوش سے کام لو۔ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ علیزا تو کم عقل اور بیوقوف ہے۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں ہے کہ وہ جو الفاظ ادا کر رہی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے اور کون سے سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔''

''وہ کم عقل اور بیوقوف نہیں ہے۔'' سلیمان نے تیمور کو دروازے کے آگے سے ہٹا دیا مگر تیمور فوراً ہی اس کے آڑے آ گئے۔

''تم اس وقت اپنی طاقت کے زعم میں ہو۔ کیا اس پہ ہاتھ اٹھانے سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں اور یہ بھی مت بھولو کہ علیزا تمہاری انوشہ چچی کی لاڈلی بیٹی ہے۔ تم بیٹھو میں' تمہیں بتاتا ہوں۔ ہم کو عقل سے کام لینا ہوگا۔'' تیمور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور رسان سے سمجھایا تو سلیمان ڈھیلا پڑ گیا۔

تیمور آہستہ آہستہ اسے تمام باتیں بتا رہے تھے۔ سلیمان کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔

علیزا کے جی میں جانے کیا سمائی کہ دوسرے روز صبح دس بجے کے قریب سعد ماموں کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ انتظار کرتی رہی اور جب وہ منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے برآمد ہوئی تو انوشہ فوراً کچن میں ناشتہ بنانے چلی گئی۔ باہر نکلی تو علیزا شولڈر بیگ شانے پہ لٹکائے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔

''کہاں جا رہی ہو اس وقت؟'' انوشہ نے ماں کے سے رعب سے سوال کیا مگر اپنے لہجے کے کھوکھلے ہونے کا شدت سے خود ہی احساس ہو گیا۔

''میں آپ کو جواب دہ نہیں ہوں۔'' وہ بدتمیزی سے بولی اور گزرتی ٹیکسی کو اشارے سے روک کر سوار ہو گئی۔ انوشہ جہاں کی تہاں کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

مہوش نے اسے دیکھ کر بے پناہ مسرت کا اظہار کیا اور کرید کرید کر سوال کرتی رہیں۔

''انوشہ کے پاس کوئی سچ ہوتا تو صفائی دیتی ناں۔'' وہ ہاتھ نچا کر بولیں۔ خود علیزا کے دل میں خلش تھی کہ انوشہ سمیت کسی نے بھی اس کی تصدیق یا تردید نہیں کی۔ مہوش نے اسے اور بھی بھڑکایا۔

''علیزا!! اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم سلیمان سے طلاق لے لو۔ اس سے کئی گنا بہتر رشتہ تمہیں مل جائے گا۔ تمہاری قدر اور محبت کرنے والا۔ میں نے تو اڑتی اڑتی سنی ہے کہ سلیمان نے کہا ہے علیزا جیسی ہونق اور اول جلول لڑکی سے کوئی بیوقوف ہی محبت کر سکتا ہے۔ اس نے صرف تمہاری دولت کی وجہ سے تم سے نکاح کیا ہے ورنہ وہ اصل شادی تو کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ماڈرن سی لڑکی سے کرے گا جو زمانے کے ساتھ چلنے والی ہو۔'' وہ تیر چھوڑ کر اب اس کے نشانے پہ بیٹھنے کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔

''میرا خیال ہے کہ انوشہ اور تیمور جلد از جلد تمہاری رخصتی کی بات کریں گے۔ اب کی حقیقت سامنے آ گئی ہے۔ کون چاہے گا سونے کی چڑیا اس کے ہاتھ سے اڑ جائے۔ رخصتی کے بعد سلیمان زبردستی تمہاری جائیداد اپنے نام لکھوا لے گا۔ ظاہر ہے اس وقت تم کیا کر سکو گی علیزا تم اکیلی ہو اور تمہارے مقابلے میں وہ سارے ہیں۔ میں سوچتی ہوں' تمہارا کیا بنے گا۔'' وہ غور سے اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں کہ پنکی بھی آ گئی۔ سہیلی کسی دوست کے گھر گئی ہوئی تھی۔ وہ بھی گفتگو میں شریک ہو گئی۔

''میں نے آج بھی سلیمان کو رانیہ کے ساتھ دیکھا ہے\ دونوں ایک ہوٹل کے فیملی کیبن میں تھے۔ ان کی حالت بتا رہی تھی کہ بے تکلفی کے کئی مراحل طے ہو چکے ہیں۔ ہائے علیزا!! تمہارا کیا ہوگا۔ سجان بھائی سے طلاق کے بعد سلیمان رانیہ سے شادی کر لے گا اور تم بے چاری دیکھتی کی دیکھتی رہ جاؤ گی۔ چہ چہ چہ۔'' وہ مصنوعی رنجیدگی سے بولی تو ہمیشہ کی طرح علیزا کو اپنے آنسو چھپانے مشکل ہو گئے۔ مہوش اسے اپنے ساتھ لگا کر تھپکنے لگیں۔ کانوں کی کچی جذباتی علیزا ہر بات پہ جلد اعتبار کر لیتی تھی۔ شدت پسندی بھی اس کے مزاج میں تھی اور اس وقت وہ جن حالات سے گزر رہی تھی۔ اس میں اسے مہوش اور پنکی کی ہر بات سچ لگ رہی تھی۔

''رانیہ! مبارک ہو۔ آپ کے کیس کا فیصلہ ہونے کے قریب ہے۔ عالیہ غوری نے تو کمال کر دیا۔ مخالف وکیل کے دلائل کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔'' سلیمان اسے مبارکباد دیتے

ہوئے بہت خوش نظر آرہا تھا۔ رانیہ نے اس کی سمت دیکھا۔ گرے شلوار سوٹ میں وہ بہت جاذب نظر لگ رہا تھا۔

"آپ کو بھی مبارک ہو۔ عالیہ کہہ رہی تھیں' اسی پیشی میں فیصلہ ہو جائے گا۔ اسی خوشی میں آج رات کا ڈنر میری طرف سے میر گھر میں ہو گا میں بے چینی سے آپ کا انتظار کروں گی۔ سلیمان! آپ کا بہت بہت شکریہ آپ نے میرے لیے بہت بھاگ دوڑ کی......"

"بس بس۔ آگے ایک لفظ بھی نہیں۔ میں رات کو وقت پہ پہنچ جاؤں گا۔" وہ اٹھ اٹھا کر بولا۔ حسب وعدہ رات کو سلیمان ان کے گھر موجود تھا۔ کھانا کھانے کے بعد قہوہ سرد کیا گیا۔ احمد مقبول اٹھ کر چلے گئے۔ بیگم مقبول اپنے کسی اور مہمان کے ساتھ مصروف ہو گئیں۔

"سلیمان! آپ نے مجھ سے پوچھا تھا ناں۔ سجان کے ساتھ آخر میرے کیا اختلافات تھے جو بات اتنی بڑھی۔ میں نے ہمیشہ ٹال دیا۔ کچھ کچھ آپ کو پتہ چل چکا ہو گا مگر کمرہ عدالت یں میں نے ساری بات نہیں بتائی مگر آج آپ کو بتا رہی ہوں۔ سجان سے ملاقات کے بعد میں بہت جلد اس کی گفتگو اور شخصیت کے سحر میں پھنس گئی' یہاں تک کہ بخوشی اس کا رشتہ منظور کر لیا گیا۔ میں جب اپنے گھر سے رخصت ہو کر سجان کے گھر پہنچی تو میری آنکھوں میں بہت خوبصورت خواب تھے۔ مگر سجان کی وحشت اور بربریت نے میرے سارے خوابوں کو تاراج کر دیا۔ یہ دیکھیں سلیمان۔ سجان کے پیار کی نشانیاں۔" رانیہ نے ڈوپٹہ شانوں سے سرکایا۔ وہ جدید فیشن کی چھوٹی اور تنگ قمیص پہنی ہوئی تھی جو بغیر آستیوں کی تھی۔

"سلیمان! میں بڑے ناز و نعم میں پلی تھی۔ سوئی بھی چبھ جاتی تو آسمان سر پر اٹھا لیتی مگر مگر سلیمان! میں سجان کی دی ہر تکلیف' ہر زخم' ہر دکھ برداشت کر گئی۔" رانیہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کے قطرے سلیمان کے ہاتھوں کی پشت گرے۔

"سلیمان! کیا کوئی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ اس طرح سے بھی پیش آ سکتا ہے۔ میرے جسم کے ساتھ میری روح کو بھی بری طرح روندا کیا ہے۔ میں نے سجان کے بارے میں اس قسم کی تصور تک نہیں کیا تھا۔ وہ بہت ظالم اور انتقام پرور شخص ہے مگر آپ۔ آپ ایسے نہیں ہیں۔ آپ تو بالکل اس سے الٹ ہیں۔" اس نے سلیمان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ یہ حرکت اس سے اضطراری کیفیت میں سرزد ہوئی تھی۔ اس نے بمشکل نگاہوں کا زاویہ بدلا۔ اس نے اپنے دل میں رانیہ کے لیے عجیب سا درد محسوس کیا۔ ایک نامحسوس سی اپنائیت جسے وہ ابھی تک کوئی

نام نہ دے سکا تھا اگر وہ سا بارے میں زیادہ غور کرتا تو علیزا کا تصور مجسم سوالیہ نگاہ بن جاتا تھا۔ اس نے تسلی دینے کے لیے کچھ بولنا چاہا مگر اسے یوں لگا اس کے الفاظ، محض الفاظ رانیہ کے دکھ کا امدادانہ کر پائیں گے۔

سلیمان وہاں سے اٹھا تو اسے اپنے دل و دماغ پہ بے پناہ بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ علیزا بہت ضدی ہو رہی تھی۔ مہوش نے اپنے بتایا تھا۔ تم بہت ساری جائیداد کی مالک ہو۔ سب کچھ تمہارا ہے اب اس گھر میں وہ مالکانہ جذبے کے ساتھ رہ رہی تھی۔

بھولے بھٹکے سے ان دونوں اگر سلیمان کو علیزا نظر آجاتی تو غیظ و غضب سے اس کی مٹھیاں بھنچ جاتیں اور چہرا سرخ ہو جاتا۔ علیزا کے ہاتھوں اپنی توہین یاد آجاتی تو اس کا جی چاہتا' علیزا کو چھٹی کا دودھ یاد کرادے۔

◉

مہوش زور زور سے رو رہی تھیں۔ سعد ان کے سامنے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھے تھے۔ پورا کمرا کسی میدان کارزار کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی روشی مناہل کو لے کر وہاں سے گئی تھی۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ وہ اب مزید اس گھر میں نہیں رہے گی۔ حیدر اور عفان کو پتا چلنے پر جانے اب کون سا طوفان آنا تھا۔

سعد کسی دوست کی طرف گئے ہوئے تھے۔ مہوش اپنے کمرے میں بلیڈ پریشر کی دوا کھا کر لیٹی ہوئی تھیں۔

پنکی اور سمکی دونوں بہنیں روما کی برتھ ڈے پر مدعو تھیں۔ مناہل کو اس کا علم نہیں تھا' ویسے بھی وہ کم ہی انکی تفریحات میں شریک ہوتی تھی۔ مناہل کو پنکی سے کوئی کام تھا' اس لیے وہ ان کی طرف آئی تھی' بدقسمتی سے پہلا سامنا ہی سجان سے ہوا' اس کی نگاہیں مناہل کو جیسے اندر تک ٹٹول رہی تھیں۔ بڑا تنگ پائنچوں والی ٹراوزر نما شلوار اور اس کے ساتھ کی سبز اور کالی پرنٹڈ ہاف سلیوز قمیض میں مناہل ایک ہلکا سا اسکارف گلے میں لپیٹے بے باکی کا مکمل نمونہ لگ رہی تھی۔ پنکی اور سمکی بھی اسی حلیے میں رہتی تھیں' کوئی روک ٹوک نہ تھی۔

"سجان بھائی! پنکی کہاں ہے؟" وہ متلاشی نگاہوں سے کمرے میں جھانک رہی تھی' ادھر سجان کی طلب جاگ اٹھی تھی۔ مناہل کو اس نے اس نظریے سے پہلی بار دیکھا تھا اور وہ واقعی دیکھنے کی چیز لگ رہی تھی گلابی رنگ میں ایک ہلکا سا داغ دھبہ تک نہ تھا۔

"اندر میرے کمرے میں ہے۔" وہ لاپروائی سے بولا۔ مناہل آگے اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ دبے قدموں اس کی پشت پر جا پہنچا۔ مناہل کو پہلو میں کھڑے خطرے کا احساس ہو گیا اور اس نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ عین اس وقت مہوش آ گئیں' روشی بھی بھاگتی آئی' بدقسمتی سے سعد بھی اسی وقت گھر پہنچے۔ سجان اتنے سارے افراد کو دیکھ کر راہ فرار اختیار کر گیا۔ روشی نے بے نقط سنائیں۔

"مہوش! میں اب سجان کو گھر میں گھسنے نہیں دوں گا' اس کے کسی قول و فعل کا میں ذمہ دار نہیں' تم ضرور ہو، اس کی ذہنی واخلاقی بیماری اتنی بڑھ چکی ہے کہ کل کو پنکی اور سمکی بھی اس کا نشانہ بن سکتی ہیں۔ کاش تم بہت پہلے میری بات سن لیتیں۔ اگر ہم اسے کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کو دکھاتے تو شاید اس کی ذہنی ٹیڑھ دور ہو جاتی۔ تشدد پر مبنی فلمیں دیکھ دیکھ کر وہ خود کو بھی ان کا ایک کردار محسوس کرنے لگا' ہماری لاپروائی و بے نیازی اور قصداً نظر انداز کرنے کی عادت نے یہ دن دکھائے۔ رانیہ جیسی بے ضرر دبے بہا لڑکی کو اس نے تقریباً تباہ کر ہی دیا ہے۔ کتنی اور شکایتیں آئیں مگر تم نے تو میری حسیات کو مفلوج کر دیا تھا۔ جانے تمہارے پاس کون ساگر تھا۔ میں تمہارے کانوں سے سنتا' تمہاری آنکھوں سے دیکھتا اور تمہاری زبان سے بولتا۔ کاش میں ایسا نہ کرتا۔ سجان ذہنی وجسمانی اذیت دینے والے نشے کی لت میں پڑ گیا ہے' اس سے چھٹکارا پانا تقریباً ناممکن نظر آتا ہے۔ میری بات سن تو' سجان کا انجام بہت برا ہو گا۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے میرے بڑھاپے کا سہارا' میرا دایاں بازو اور وہ بھی.....' سعد کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح گر رہے تھے' وہ بچوں کی طرح رو رہے تھے۔

۞

کمرہ عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سعد کے گھر سمیت رانیہ کے عزیز رشتہ دار بھی فیصلہ سننے جمع تھے۔ آج اس کے کیس کی آخری پیشی اور فیصلے کی تاریخ تھی۔ صحافی پریس فوٹو گرافر اور دوسرے اخباری نمائندے بھی موجود تھے۔ رانیہ سجان کے کیس کو آخری چند پیشیوں سے شہرت ملی تھی۔

"ابھی تک سلیمان نہیں آئے؟" رانیہ بار بار بے چینی کا اظہار کر رہی تھی۔

"آ رہے ہوں گے' آخر کا معروف زندگی ہے اور تم اتنی پریشان مت ہو' تمہاری زندگی میں تو وہ آ ہی چکے ہیں بہار بن کر بلکہ روح افزا ٹھنڈک بن کر۔"

صائمہ کے مزاحیہ انداز پر اسے صورت حال کے کشیدہ ہونے کے باوجود ہنسی آ گئی۔ ہنستے ہوئے اس کی نگاہ سامنے اٹھی تو وہ اچانک چپ ہو گئی' دور کھڑا سجان اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ رانیہ کو تھرتھری سی آ گئی۔ وہ صائمہ کی اوٹ میں ہو گئی۔ جج آیا تو عدالتی کارروائی شروع ہو گئی۔ علیزا نے خاموشی سے بھرے کمرے کا جائزہ لیا اور ایک کونے میں جگہ بنا کر کھڑی ہو گئی۔ رانیہ اور سلیمان ساتھ ساتھ تھے۔ علیزا کو فیصلہ سننے سے خوف آ رہا تھا' وہ دعا کر رہی تھی کہ فیصلہ رانیہ کے حق میں نہ ہو۔

رانیہ کی تو ہتھیلیاں تک پسیج رہی تھیں اور دل معمول کی رفتار سے ہٹ کر دھڑک رہا تھا' جج نے فیصلہ سنایا تو رانیہ کے آنسو نکل آئے۔ سجان کا چہرہ سیاہ ہو گیا۔

"مبارک ہو۔" صائمہ رانیہ کے کان میں چیخی۔ باقی سب بھی اس کے قریب آ رہے تھے۔ صحافی حضرات سوالوں کی بوچھاڑ کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ سجان کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے نامحسوس انداز میں لوگوں کی بھیڑ چیرتا رانیہ کی طرف بڑھنے لگا' وہ سمٹ کر ایک طرف ہو گئی تاکہ اسے باہر جانے کے لیے راستہ دے۔ سجان کا دایاں ہاتھ کوٹ کی جیب سے باہر آیا۔ عین اسی وقت کیمرے کی فلیش لائٹ چمکی' وہ ڈیلی فریڈم کا فوٹو گرافر تھا' اس کا خیال تھا اس آخری لمحے سجان اور رانیہ کے تاثرات کی تصویر کشی اس کے اخبار کی اشاعت کو بڑھا دے گی۔ ایک کی آنکھوں میں خوف تھا اور دوسرے کی آنکھ میں غصہ' اپنی شکست و بیچارگی اور سب کچھ ہار دینے کا غصہ۔ احمد مقبول بیٹی کی یہ خوفزدہ حالت دیکھ کر اس کی طرف بڑھے' کئی کیمروں کی فلیش لائٹیں ایک ساتھ چمکیں۔ اچانک بجلی کی سی تیزی سے سجان نے اپنے دائیں ہاتھ کا رخ رانیہ کی طرف کیا' بہت ساری چیخیں ایک ساتھ ابھری تھیں۔ ٹھائیں ٹھائیں کی آواز میں باقی سب آوازیں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ رانیہ کے ماتھے اور سینے سے بڑی تیزی سے خون نکل رہا تھا۔ شدت تکلیف سے اس کے منہ سے ہائے ہی نکلا اور یہ آخری لفظ تھا جو اس کے چاہنے والوں نے اس کے منہ سے سنا' اس کے بعد وہ دنیا سے بے گانہ ہو گئی سجان مسلسل کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی کنپٹی پر ٹرائیگر رکھ کر دبا پا۔ یہ سارا عمل سکینڈوں میں مکمل ہوا۔

۞

سجان تین دن زندگی اور موت کے درمیان لٹکے رہنے کے بعد موت کے سپرد ہو گیا' زندگی ہار گئی' وحشت ہار گئی' اذیت ہار گئی۔ ڈاکٹرز کی کوئی کوشش مہوش اور سعد کی کوئی دعا بار آور نہیں

ہوئی۔ سجان مرنے سے پہلے ایک بار ہوش میں آیا' اس کے لبوں پر رانیہ کا ہی نام تھا۔

رانیہ اس سے تین دن پہلے ہی یہ دنیا چھوڑ چکی تھی' وہ اپنے پیچھے ایک ایسی المناک داستان چھوڑ گئی تھی جس کا ورق ورق آنسوؤں سے دھلا ہوا تھا۔ سلیمان تعزیت کے لیے انوشہ اور تیمور کے ہمراہ رانیہ کے گھر گیا۔ احمد مقبول مرد ہوتے ہوئے بھی بالکل بچوں کی طرح رو رہے تھے۔

سجان کی موت نے مہوش کو تھرا دیا تھا اور رانیہ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس نے مہوش جیسی مضبوط اعصاب کی مالک کو بھی رلا دیا تھا۔ اس آہ و زاری کے دوران ان کے منہ سے بہت سی باتیں از خود نکل گئی تھیں' ایسے سچ جن سے مہوش کی شخصیت پرت در پرت سامنے آ کر کھل گئی تھی انوشہ کو بھابی سے نفرت کے ساتھ ان پر ترس بھی آیا۔ اتنے برسوں سے وہ شطرنج کی بساط پہ جو مہرے کھیل رہی تھیں وہ اب آ کر پٹ گئے تھے' علیزا نے انکا اعتراف نامہ بغور سنا تھا اور پھر اس کا جی چاہا تھا۔ کاش زمین پھٹے اور وہ اپنی شرمندگیوں سمیت اس میں سما جائے۔ اس نے کتنے محبت کرنے والے لوگوں کا دل توڑا تھا جو اسے بنا کسی غرض کے چاہے چلے جا رہے تھے۔ انہیں کسی ستائش و صلے کی تمنا نہ تھی۔

وہ انہیں غاصب و جابر اور ڈاکو سمجھتی رہی۔ یہ تصور کرتی رہی کہ وہ اس کے باپ کی دولت پہ عیش کر رہے ہیں۔ اب یہ عقدہ کھلا تھا کہ اس کا باپ اس کے لیے ایک پیسہ نہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد انوشہ کو ایک پھوٹی کوڑی تک نہ ملی تھی۔ وہ تن کے کپڑوں میں اسے لے کر بھائیوں کے پاس آئی تھی جہاں بھابی نے اسے کولہو کا بیل بنا دیا۔ وہ تو خوش قسمتی سے اسے تیمور جیسا ہمسفر مل گیا ورنہ دکھوں کی طویل رات کبھی ختم ہوتی نظر نہ آ رہی تھی۔

پھر مہوش نے انوشہ سے اپنی شکست کا انتقام لینے کے لیے علیزا جیسی معصوم بچی کا سہارا لیا۔ اس کی خوب برین واشنگ کی اور سائیں چن مہ سے الٹے سیدھے تعویز لا کر پلاتی رہیں وہ ماں کو ماں سمجھنے سے ہی انکاری ہو گئی اور اس کے ساتھ جانے سے ہی انکار کر دیا۔

ماں کے بعد مہوش نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا' وہ اعتماد و اعتبار سے محروم شخصیت بن کر رہ گئی۔ سجان نے اسے اپنی ماں کا دیا دل پسند کھلونا سمجھا۔ یہ علیزا کی خوش قسمتی ہی تھی وہ سجان جیسے دراز دست شخص سے بے عزت ہونے سے محفوظ رہی تھی انوشہ کس کس کا غم کرتی۔ پہلے علیزا کے رویے پھر رانیہ کے دل خراش قتل اور پھر سجان کی حسرت ناک موت۔ اب مہوش کی نقاب کشائی۔ اسے تو یہاں ٹھہرنا دوبھر ہو گیا۔

وہ سوئم کے بعد بوجھل دل کے ساتھ اپنے گوشہ عافیت میں واپس آ گئی۔ سجان کی شخصیت سے قطع نظر اس کی خودکشی اور موت نے اسے بہت دکھی کیا تھا۔ وہ اس کے بھائی کا سہارا تھا۔ سعد کی تو حالت دیکھی ہی نہ جاتی تھی۔

سنی اسے کھانے کے لیے بلانے آیا تھا۔ وہ دروازے سے ہی کہہ کر پلٹ گیا جیسے یہ ڈر ہو کہ علیزا آئی اسے مار کر یا ڈانٹ کر کمرے سے نکال دیں گی۔ وہ اپنی پلیٹ پہ جھکی بے دلی سے کھانا زہر مار کر رہی تھی حالانکہ آج اسی کی پسندیدہ ڈشز تھیں۔ چکن بریانی' مٹن کوفتہ اور میٹھے میں زعفرانی کھیر۔ مگر اسے کوئی چیز بھی مزانہ دے رہی تھی۔ جہانگیر کسی کاروباری سلسلے میں باہر گئے تھے سلیمان' جہانگیر کی غیر موجودگی میں ان کے ساتھ ہی روز کھانا کھاتا تھا۔ علیزا کی طرح وہ بھی بے دلی سے لقمے توڑ رہا تھا۔ رانیہ کی موت کو کافی دن گزرنے کے باوجود اب تک وہ افسردہ اور دل گرفتہ تھا۔

علیزا کو بھی رانیہ کی بے وقت موت کا بہت زیادہ افسوس تھا۔ وہ کئی بار بند کمرے میں اس کے لیے روئی تھی۔ مگر سلیمان کا اتنا اثر لینا اسے ذرا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کھانے کے بعد سجان اور رانیہ کا ذکر چھڑ گیا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا، رانیہ میرے لیے اتنی اہم کیوں ہو گئی تھی۔'' سلیمان کہہ رہا تھا ''اس کے لیے اپنے احساسات میں بیان نہیں کر سکتا۔''

علیزا کی ساری حسات کان بن گئیں۔

''سلیمان! رانیہ تھی ہی بہت اچھی اور چاہت کے قابل۔ مجھ سے تو اس کے والدین کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔'' شدت جذبات سے انوشہ کی آواز بھرا گئی تو تیمور نے اسے تھپکی دی۔

ماحول پہ عجیب سی سوگواری چھا گئی تھی۔ علیزا نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے کرسی پرے کی اور تقریباً وہاں سے بھاگتی ہوئی نکلی۔

سلیمان رانیہ کی خاموش محبت کی شوریدہ سری سے ڈر گیا تھا۔ اس نے رانیہ سے علیزا کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں کہا تھا۔ بعد میں اس کی موت اور علیزا کی بدگمانی نے اسے بہت افسردہ کر دیا تھا۔ وہ چاہنے کے باوجود اپنے دل کو علیزا کی طرف مائل نہ کر سکا تھا۔

سلیمان اب جہانگیر کو بہت مس کرنے لگا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ باقی سب بھی ان کی کمی محسوس کر رہے تھے تقریباً تین ماہ ہو گئے تھے ان کو گئے ہوئے۔

دوسرے روزے کے دن وہ اچانک واپس آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی علیزا کا پوچھا۔ وہ تین روز سے بخار میں پھنک رہی تھی۔ جہانگیر اسی وقت اس کے پاس پہنچ گئے۔ علیزا ان کے سینے لگ کر اس طرح روئی کہ خود ان کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

"میں نے تمہیں وہاں بہت مس کیا۔ دیکھو تو تمہارے لیے میں نے کتنی ڈھیر ساری شاپنگ کی ہے۔"

"تایا جان! مجھے کچھ نہیں چاہیے آپ واپس آ گئے ہیں۔ یہی کافی ہے میں آپ کے بغیر بہت تنہا اور اکیلی رہ گئی تھی۔ بھیڑ میں گم ہو جانے والے بچے کی طرح۔" وہ ان کے پر شفقت سینے سے لپٹی جانے کیا کچھ کہتی رہی۔ جہانگیر نے اسے بخار کا اثر سمجھا۔ باہر سلیمان ان کے کمرے سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈھائی گھنٹے ہو چکے تھے انہیں علیزا کی دلداری و ناز اٹھاتے ہوئے۔ وہ تن فن کرتا ان کے پیچھے ہی چلا آیا اور وہیں ٹھٹک گیا۔ جہانگیر نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آہستہ سے علیزا کے پاس سے اٹھے تاکہ اس کی نیند خراب نہ ہو۔ وہ اس حد درجہ احتیاط و محبت پہ سلگ کر رہ گیا۔ وہ کہاں اسے انمول جذبوں کے قابل تھی' خود غرض لڑکی۔

سونے سے پہلے علیزا کو دیکھنے انوشہ اور تیمور آئے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ تیمور نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بخار کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

"انوشہ! جاؤ تم سو جاؤ۔ میں علیزا کے پاس ہوں۔ علیزا کو دوا بھی دینی ہے۔ تم نے نوٹ کیا ہے کتنی حساس ہو گئی ہے یہ۔ ذرا ذرا سی بات پہ رو پڑتی ہے۔ دوا بھی نہیں پیتی خود سے۔"

تیمور کے ہر ہر انداز سے اس کے لیے محبت عیاں تھی۔ پہلے وہ اسے ڈرامہ اور لالچ ہی کہتی تھی۔ وہ اچانک اٹھ بیٹھی۔ وہ دونوں اسے سوتا سمجھ رہے تھے جبکہ وہ جاگ رہی تھی اور ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ بھی سن چکی تھی۔

"آئی ایم ساری تیمور انکل! میں بہت بری ہوں جو آپ سب کو غلط سمجھا۔" وہ واقعی شرمندہ تھی۔ پل بھر میں ماحول بدل گیا۔ تیمور اسے سینے سے لگائے اس کے بال سہلائے رہے تھے۔

"تم میری بیٹی ہو اور بس اس کے علاوہ کچھ مت سوچو۔"

جہانگیر جوڑوں کے درد کی وجہ سے بار بار سیڑھیاں چڑھ اتر نہیں سکتے تھے رات کا کھانا سب ان کے ساتھ اوپر ہی کھاتے تھے۔ انوشہ اور علیزا مل کر یہ اہتمام کرتی تھیں اور کھانا پکانے کا سارا کام ادھر ہی ہوتا تھا۔

"علیزا بیٹی! بار بار اوپر نیچے بھاگ دوڑ میں لگی رہتی ہو۔ جی چاہتا ہے اب تمہیں مستقل طور پہ ہی اوپر لے آؤں تاکہ ان بار بار کے چکروں سے تمہاری جان چھوٹے۔" وہ ابھی ابھی نیچے سے ہاٹ پاٹ لائی تھی۔

جہانگیر نے شرارت سے جملہ کسا۔ سب دسترخوان پہ موجود تھے۔ وہ جھینپ گئی اور کچن میں آ گئی۔ مونی کھانسنے لگا۔ سنی نے شریر نگاہوں سے سلیمان کو دیکھا۔

"انوشہ اور تیمور اعشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں تم دونوں کا انتظار کروں گا۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"جی اچھا ابا بھائی۔" دونوں بیک وقت سعادت مندی سے بولے تو انکا دل خوشی سے معمور ہو گیا۔

مغرب کی نماز کے بعد سب نے مل کر کھانا کھایا بعد میں چائے کا دور چلا۔ علیزا نے ہی چائے بنائی سب ابھی تک دسترخوان پر ہی موجود تھے سوائے سلیمان کے۔ انوشہ نے چائے کا مگ علیزا کو دیتے ہوئے کہا کہ سلیمان اپنے کمرے میں ہے وہ اسے وہیں چائے دے آئے۔ وہ ہچکچاتی۔ انکار بھی نہ کر سکتی تھی۔

علیزا نے ہلکے سے دروازہ بجایا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ سلیمان فون رکھ کر پلیٹ رہا تھا۔

"یہ لیں چائے۔" اس نے خاصی ہمت سے کام لیا اور کپ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ کپ تھامنے کے بجائے سرد نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا اور اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

"پلیز اپنی چائے سمیت یہاں سے تشریف لے جائیں۔" اس کا لہجہ اجنبی اور روکھا تھا۔ تیور خوفناک تھے۔ یوں لگ رہا تھا اگر اس نے ذرا بھی ہٹ دھری دکھائی تو وہ اسے باہر نکال دے گا۔ وہ وہیں سے واپس آ گئی۔ صد شکر کہ سب اپنی اپنی باتوں میں مگن تھے کسی نے اس کی متغیر رنگت کو نہیں دیکھا۔

"علیزا بی بی! دل دکھانے کی اتنی سزا تو تمہیں ملنی چاہیے۔" وہ خود سے بولی۔

مونی اور سنی اس دور کے بچے تھے۔ سلیمان کی ناراضی ان سے پوشیدہ نہیں تھی۔

انوشہ سلیمان سے کیسے کہتی کہ علیزا سے ناراضی ختم کرو۔ تیمور نے البتہ سلیمان کو اکیلے میں بہت سمجھایا تھا۔

"سلیمان! علیزا تمہاری منکوحہ ہے۔ اکا بھائی کی عزیز از جان ہستی اگر ان کے علم میں یہ سب آ گیا تو بہت برا ہوگا۔ میں رانیہ کے لیے تمہارے خصوصی جذبات سے اچھی طرح واقف ہوں مگر ذرا سوچو تو تم اپنے ساتھ علیزا سے بھی زیادتی کر رہے ہو۔ میں اپنی بیٹی کے سلسلے میں کوئی زیادتی برداشت نہیں کر سکتا۔" تیمور کا لہجہ دوٹوک تھا۔ سلیمان بڑی طرح گڑبڑایا۔

"چچا جان! بات وہ نہیں ہے جو آپ سوچ رہے ہیں۔ میں اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں کہ علیزا میری بیوی ہے مگر رانیہ کی حیثیت کا تعین میں ابھی تک نہیں کر سکا ہوں نہ جانے وہ میرے لیے کیا تھی۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے دل میں دکھ کی لہری اٹھتی ہے۔ وہ مدد لینے کے لیے میری طرف بڑھی تھی۔ میں اس کے بارے میں کچھ اور طرح سے سوچنے لگا تھا مگر اس میں کہیں بھی بری نیت کو دخل نہیں تھا۔ میرے دل میں خلش سی ہے میں نے ایک بار بھی اسے اپنے اور علیزا کے تعلق کے بارے میں نہیں بتایا نہ جانے میں نے ایسا کیوں کیا۔" اندرونی اضطراب اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔

"سلیمان! کوئی بھی موسم ہمیشہ نہیں رہتا۔ وقت آتے جاتے موسموں کا نام ہے۔ رانیہ بھی اک ایسا ہی موسم تھا غیر یقینی' جبکہ علیزا تمہاری مستقل ہم سفر ہے۔ اس نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ مجھے اس کے لیے بٹا ہوا سلیمان نہیں بلکہ پورا سلیمان چاہیے ورنہ تمہارے پاس ایک دوسرا راستہ بھی ہے۔ علیحدگی کا راستہ۔" وہ سنگ دلی سے بولے تو سلیمان لحہ بھر کے لیے حیران سا ہوا۔

"چچا جان! آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں اس حد تک گر بھی سکتا ہوں علیزا کو میں اپنی زندگی سے نکال نہیں سکتا۔ وہ صرف ابا جان کی ہی نہیں میری بھی خواہش ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے ناں' رانیہ کے لیے سوچتے ہوئے میں الجھ سا جاتا ہوں۔"

"تو جو چیز شک میں ڈالے اسے چھوڑ دو۔"

"اسی کوشش میں ہوں۔"

"اب علیزا سے کوئی جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"چچا جان! آپ بھی حد کرتے ہیں۔" وہ اسی قدر کہہ سکا۔ بہرحال تیمور سے بات

کرنے کے بعد اس کی ذہنی کشیدگی ختم ہو گئی تھی

علیزا جہانگیر کے ساتھ بیٹھی ان سے نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کر رہی تھی۔

"سلیمان! میرے کمرے سے وہ کالا شاپر اٹھا کر لانا۔" وہ ذرا دیر کے لیے سلیمان کی طرف مڑے۔ وہ سعادت مندی سے سر کو جنبش دے کر اٹھا اور فوراً تعمیل کی۔ انہوں نے علیزا کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟"

"کھول کر دیکھو۔ میں نے سلیمان سے کہا تھا۔ تمہارے لیے کپڑے لے آئے۔ ساتھ کچھ اور چیزیں ہیں۔ دیکھو تو کیسی ہیں۔" اس نے اشتیاق سے بیگ میں جھانکا۔ اندر سے فیروزی اور ڈیپ بلو کلر کا خوب صورت سا سوٹ برآمد ہوا۔

"یہ تو بڑا قیمتی اور اسٹائلش سا ہے۔ کون سے بوتیک سے لیا ہے۔ میرے ناپ کا ہے بالکل۔" جہانگیر اس کے بے ساختہ انداز پہ مسکرائے۔

"تم سے زیادہ قیمتی اور انمول کون ہوگا۔ رہ گیا بوتیک تو سلیمان کو پتہ ہوگا وہی لایا ہے اگر تمہیں اس بوتیک سے اور کپڑے لینے ہوں تو سلیمان کے ساتھ چلی جانا۔ میں آج بہت خوش ہوں۔ میرا انتخاب لاجواب ہے میرے نگاہیں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتی۔ علیزا سچ مچ ہیرا ہے۔ نیک اور شائستہ بچی۔" وہ مڑ کر سلیمان سے مخاطب ہوئے تو وہ خاموش رہا جیسے چپ کی زبان میں تائید کر رہا ہو۔

"تایا ابو! سلیمان بھائی آپی سے ناراض ہیں۔ ہم نے شرط لگائی ہوئی ہے کہ صلح کرائیں گے۔" مونی کی اس غیر متوقع بات پہ سچ مچ علیزا کے پسینے چھوٹ گئے۔ اسے ہرگز اندازہ نہ تھا وہ ان کے سامنے ہی بھانڈا پھوڑ دے گا۔

"سلیمان! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔" وہ کڑک کر بولے تو سلیمان نے علیزا کو گھورا مگر وہ اس کی طرف کہاں دیکھ رہی تھی۔ وہ تو نظریں زمین میں گاڑے اپنی شامت کا انتظار کر رہی تھی۔

"چلو فوراً ناراضی ختم کرو۔ علیزا سے ہاتھ ملاؤ۔" وہ سر پہ کھڑے تھے چاروناچار ان کے حکم پہ عمل کرنا پڑا۔ اس نے علیزا کا ہاتھ زور سے دبایا اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ سلیمان نے جانے کب کا بدلہ چکایا تھا۔

"ہاں اب ٹھیک ہے۔ آئندہ مجھے ناراضی کی خبر نہیں ملنی چاہیے۔ سلیمان جاؤ علیزا کو

بازار لے جاؤ۔" جہانگیر کے انداز میں اس کے لیے ایک ننھے بچے کی سی محبت رچی ہوئی تھی۔

سلیمان منہ سے کچھ نہیں بولا گاڑی کی چابی لے آیا۔ علیزا پل بھر میں چادر اوڑھ کر آ گئی۔

بازار میں بہت رونق تھی۔ دکانیں روشنیوں سے منور تھیں۔ لوگ بے فکری سے خریداری کر رہے تھے۔ سلیمان نے پہلے ان دونوں بھائیوں کو ان کی مطلوبہ اشیاء دلائیں۔ علیزا چوڑیاں پسند کر رہی تھی۔ اس نے فیروزی کپڑوں کے ساتھ میچ کرتے دو سیٹ لیے اور پھر تین سیٹ اور خریدے۔ مہندی کے ساتھ کچھ اور چیزیں لیں۔ ایک جگہ اسے کریم اور سلور رنگ کی چوڑیاں پسند آ گئیں۔

"پہنا دوں۔" دکاندار چوڑیاں ہاتھ میں پکڑے علیزا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"جی نہیں۔ آپ پیک کر دیں۔" سلیمان بولا۔ سلیمان نے ادائیگی کی۔ خلاف توقع بہت جلدی وہ گھر آ گئے۔ مونی اور سنی تھکے ہوئے تھے آتے ہی سو گئے۔

"چائے پئیں گے۔" علیزا نے اوپر بڑھتے سلیمان سے کہا۔

"جی نہیں۔" اس کے لہجے میں بہت سرد مہری اور رکھائی سی تھی۔ اس نے بمشکل، خود کو رونے سے باز رکھا۔ علیزا اپنی غلط فہمیوں پہ نادم تھی۔ وہ شاپر رکھ کر اندر آئی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔

"اس وقت کس کا فون آ گیا۔ اس نے سوچتے ہوئے فون اٹھایا۔ دوسری طرف رمشہ تھی۔ سلیمان کی اکلوتی بہن۔ علیزا کی اور اس کی فون پہ اکثر بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی تصویریں بھی دیکھ رکھی تھیں۔

"تمہارے لیے میرے پاس ایک خوشی کی خبر ہے۔"

"کون سی بھئی؟"

"شادی کی......"

"کس کی شادی کی......"

"تمہاری شادی کی اور کس کی۔ اب بنو تو مت۔ ابو جان نے کل مجھے فون کر کے بتایا تھا کہ ایک ہفتے بعد تم مایوں بیٹھ رہی ہو۔" علیزا کے لیے یہ انکشاف ہی تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش سی ہو گئی۔

"آپ کب آ رہی ہیں؟"

"میں کل رات پہنچ رہی ہوں۔ میرے اکلوتے بھائی کی شادی ہے۔ تمہیں روبرو دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ تصویروں میں تو بہت پیاری ہو۔ ابو جان تمہاری بہت تعریف کرتے ہیں۔ کہتے ہیں میری ایک نہیں دو بیٹیاں ہیں اور سلیمان پتہ ہے کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے میں علیزا سے کبھی کبھی جیلسی فیل کرنے لگتا ہوں۔' ابو اسے اتنی توجہ دیتے ہیں۔ اس کے آنے کے بعد مجھے تو وہ سوتیلی اولاد سمجھنے لگے ہیں۔'"

رمشہ مزے سے بولی۔ علیزا ایک بار بھی درمیان میں نہیں بولی ویسے بھی رمشہ بہت باتونی تھی۔ خود ہی سوال کرتی۔ خود ہی جواب دیتی۔ اس نے فون بند کیا تو سوچوں میں گھر گئی۔ اسے کسی نے بتایا تک نہ تھا اور سلیمان ابھی تک منہ بنائے پھر رہا تھا۔ انوشہ رات اس کے کمرے میں آئی تو علیزا جاگ رہی تھی۔ اس نے بڑی محبت سے اسے گلے سے لگا لیا۔

"اب سو جاؤ۔ صبح سویرے اٹھنا ہے بہت کام ہے۔ کل سے ٹھیک ٹھاک پریڈ ہوا کرے گی میری اور تم خوامخواہ کچھ مت سوچو۔ میں چاہتی ہوں میرے بیٹے کی شادی کے دن دنیا کی حسین ترین دلہن نظر آئے۔" علیزا اداس ہو گئی اور ان کے کمرے سے نکل آئی۔ اسے اب کہاں نیند آئی تھی۔ اس نے بک شیلف سے ایک شعری مجموعہ نکالا۔ اپنی پسندیدہ غزل کو پڑھتے ہوئے اسے پہلی بار یوں لگا جیسے اس کا دل قطرہ قطرہ کر کے پگھل رہا ہو۔

ہجر میں خون رلاتے ہو کہاں ہوتے ہو
لوٹ کر کیوں نہیں آتے کہاں ہوتے ہو
سرد راتوں میں کیسے تمہیں بھلا سکتا ہوں
آگ سی دل میں لگاتے ہو کہاں ہوتے ہوں
شہر کے لوگ بھی یہی سوال کرتے ہیں!
اس بہت کم نظر آتے ہو کہاں ہوت ہو

اس نے کتاب تکیے پر اوندھی کر دی۔

"پتہ نہیں سلیمان صاحب کیا کر رہے ہوں گے۔ اپنی ناکام محبت کا سوگ منا رہے ہوں گے۔" وہ بدگمانیوں کے سمندر میں تہہ در تہہ اترنے لگی۔

صبح بہت ہنگامہ خیز تھی۔ انوشہ اکیلی ہی سب کچھ کر رہی تھی علیزا کا کمرے سے نکلنے

کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا مگر مما کی مصروفیت دیکھ کر اس ترس آ گیا۔ آہستہ آہستہ مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔

''جاؤ علیزا! کپڑے بدل لو۔ کتنا رف سا حلیہ ہو رہا ہے۔ شام کو مایوں بیٹھو گی نا۔ ابھی جاؤں چینج کرو۔'' انوشہ نے سہولت سے اسے ٹوکا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔ اس کی نگاہ انتخاب اسی فیروزی اور بلیو کلر کے سوٹ پہ جا رکی جو سلیمان لایا تھا۔ مناہل اور روشی بھی آ چکی تھیں۔ روشی انوشہ کے ساتھ مصروف تھی۔ مناہل علیزا کے کمرے میں ہی آ گئی۔

''خوب جچ رہی ہو اس سوٹ میں۔'' اس نے تعریف کی۔ سلیمان اور تیمور دوپہر میں لوٹے۔ آج تو جہانگیر بھی نیچے ہی تھے۔ آتی جاتی علیزا کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے۔

''علیز! تمہارے سسر کتنے اچھے ہیں۔'' مناہل نے رشک سے اُن کی طرف دیکھا۔ علیزا جہانگیر کی دوائی لینے اوپر آئی جوان کے کمرے میں سائیڈ ٹیبل پہ پڑی ہوئی تھی۔ سلیمان کی کزنز اوپر وہیں چھوٹے موٹے کام سرانجام دے رہی تھیں۔ ساتھ سلیمان سے چھیڑ چھاڑ اور ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

''علیز! سلیمان سے ناراضی تو نہیں چل رہی ہے جو یوں بیگانوں کی طرح پاس سے گزر گئی ہو۔''

نوال خاصی منہ پھٹ سی تھی۔ اس نے سلیمان کا بھی لحاظ نہیں کیا تھا۔ منہ پکا کر کے اتنے آرام سے بولی کہ علیزا جیسی محتاط لڑکی بھی گڑبڑا گئی۔

''ہاں بھئی۔ سلیمان پولیس آفیسر ہیں۔ یہ نہ ہو اس پر بھی کوئی دفعہ لگا دیں۔''

سونیا بولی تو لاؤنج قہقہوں سے گونج اٹھا۔ علیزا ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھی نیچے اتر آئی۔ حاضر جواب، بذلہ سنج لوگوں میں بیٹھتے ہوئے اسے ہمیشہ ایک قسم کا احساس کمتری لاحق رہتا۔ وہ اس طرح سے کسی پہ بھی جملے نہیں کس سکتی تھی۔

شام کے بعد اصل چہل پہل شروع ہوئی۔ سلیمان کے دوست، رشتہ دار کزنز خال ٹیل، سب آ گئے۔ علیزا کمرہ نشین ہو گی۔ تیسرے دن اس کی رخصتی تھی۔

موٹی اور سنی میوزک کی تال پہ بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ علیزا کی مہندی کا فنکشن جاری تھا۔ رمشہ بھی پہنچ چکی تھی۔

رات گئے تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ جب اچانک جہانگیر کی طبیعت بگڑ گئی۔ سلیمان،

تیمور اور رضا نہیں لے کر فوراً ہاسپٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ رمشہ اور انوشہ بھی ان کے پیچھے چلی گئیں۔ اب وہ اکیلی گھر میں تھی کیونکہ باقی جو رہ گئے تھے۔ وہ بھی پریشان ہو کر ایک ایک کر کے ہاسپٹل چلے گئے تھے کیونکہ جہانگیر کی حالت خاصی سیریس تھی۔ اس کے پاس صرف مناہل تھی جو برابر اسے تسلی دے رہی تھی کیونکہ علیزا مسلسل رو رہی تھی۔

''مجھے لگتا ہے، کچھ ہونے والا ہے۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ سے بہتری کی امید رکھو۔ تم تو ان سے اتنی محبت کرتی ہو محبت کرنے والوں کی دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں۔''

وہ مسلسل اس کی ہمت بندھا رہی تھی۔ علیزا کے ہاتھ بے اختیار دعا کے انداز میں پھیل گئے۔ وہ گیٹ کے آس پاس چکر کاٹ رہی تھی کہ شاید ہاسپٹل سے کوئی آ جائے اور جہانگیر کے بارے میں پتہ لگے۔

وہ رات بھر نہیں سوئی۔ اب صبح صادق کے آثار نمایاں ہو رہے تھے جب جانی پہچانی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ چوکیدار نے جونہی گیٹ کھولا۔ وہ بے تابی سے تقریباً بھاگ کر آگے آئی۔ آنے والا سلیمان تھا۔

''کیا ہوا؟ تایا جان ٹھیک تو ہیں ناں؟ انہیں کچھ ہوا تو نہیں ہے ناں؟ ان کی حالت زیادہ سیریس تو نہیں ہے۔'' ایک ہی سوال مختلف رنگ میں تھا۔ سلیمان دنے اس کی طرف دیکھا۔ شدت گریہ سے ابھی تک اس کی آنکھیں سوجی سوجی اور سرخ نظر آ رہی تھیں۔ کلائیوں میں گیندے اور موتیے کے پھول مرجھائے مرجھائے سے تھے زرد ملگجے کپڑوں میں وہ خود بھی زرد سی لگ رہی تھی۔

''ابو جان پہلے سے بہت بہتر ہیں۔ معمولی سا ہارٹ پین تھا۔''

''میں بھی ہاسپٹل جاؤں گی۔'' وہ مچل گئی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب وہ ٹھیک ہیں پہلے ہی ہاسپٹل میں سب جمع ہیں۔ خوامخواہ بات کا بتنگڑ بنے گا۔ شام میں شادی کا فنکشن ہے اور یہ ہاسپٹل جانے کے لیے بے قرار ہیں، وہاں جا کر رونا دھونا شروع ہوگا۔ ابو جان کی طبیعت جو سنبھل رہی ہے پھر خراب ہو جائے گی۔'' سلیمان ڈپٹ کر بولا تو اسے شدت سے رونا آیا۔ اسے سلیمان کی باتوں کا ذرا بھی یقین نہ تھا کہ تایا جان بالکل ٹھیک ہیں۔

وہ سب واپس آ گئے۔ اب سلیمان ان کے پاس تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جہانگیر کو ڈسچارج کر دیا گیا۔ وہ واپس آئے تو علیزا نے بمشکل خود کو رونے سے باز رکھا کیونکہ سلیمان کی باتوں کا اثر جو تھا۔

"تایا جان! میں بہت پریشان تھی۔ میں نے اتنی دعائیں مانگیں۔"

"مجھے معلوم تھا۔ میری بیٹی بہت پریشان ہوگی۔ اس لیے تو میں ٹھیک ٹھاک ہو کر واپس آ گیا ہوں۔" وہ اب بھی نقاہت زدہ دکھائی دے رہے تھے۔

"سچ بتائیں۔ آپ بالکل ٹھیک ہیں ناں؟"

ہاں بھئی۔ میں سو فی صد فٹ اور صحت مند ہوں۔" وہ اس کی محبت کا خیال کر کے آسودہ سے ہو گئے۔ پھر شادی کی پوری تقریب کے دوران وہ ہشاش بشاش رہے۔ کھانے کے بعد علیزا کی رخصتی اس طرح ہوئی کہ جہانگیر اسے تھام کر بڑے فخر اور مان سے اوپر لائے۔ آج خوشی ان کے روم روم پھوٹی پڑ رہی تھی۔ انہوں نے علیزا کو سلامی اور منہ دکھائی میں سونے کے کنگن اور کیش رقم دی۔ رمشہ نے وائیٹ گولڈ کا سیٹ دیا۔ نوال، سمیعہ، رمشہ اور سلیمان کی دیگر کزنز کچھ دیر علیزا کے پاس بیٹھی رہی پھر وہ بھی چلی گئیں۔ رمشہ بھی نیچے آ گئی۔

سلیمان دوستوں کو رخصت کر رہا تھا۔ علیزا جہانگیر کے پاس تھی۔ انہیں سانس کی تکلیف ہوئی تو وہ بے پناہ گھبرا گئی۔

"کہاں ہیں آپ ٹھیک۔ جھوٹ بولا مجھ سے۔"

"اب تم آ گئی ہو ناں۔ وعدہ۔ میں بالکل ٹھیک رہوں گا یہ چھوٹی موٹی تکلیفیں تو مجھے کافی عرصے سے لاحق ہیں۔ ان سے کیا ڈرنا۔" انہوں نے شفقت سے اسے دیکھا۔ اتنے میں سلیمان بھی وہیں چلا آیا۔

"آپ نے دوا کھالی ہے؟"

"ہاں کھالی ہے۔ علیزا نے کھلائی ہے بلکہ مجھے کچن سے پانی بھی لا کر دیا ہے۔ دیکھو! میری بیٹی کتنی اچھی ہے۔" انہوں نے بڑے فخر سے اسے دیکھتے ہوئے سلیمان سے جتانے والے انداز میں کہا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

"سلیمان! مجھے علیزا کی طرف سے تمہاری کوئی شکایت نہیں ملنی چاہیے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ علیزا کے خوشیوں کا خیال رکھنا تمہارا فرض ہے۔"

"ٹھیک ہے ابا جان۔" وہ سر جھکا کر سعادت مندی سے بولا۔

"اب جاؤ آرام کرو۔ تم دونوں کی نئی زندگی کی شروعات پہ میرے پاس دعا ہیں ہیں۔ ہمیشہ خوش اور سکھی رہو! میں بھی اب سوؤں گا۔" وہ دراز ہو چکے تھے۔ علیزا آہستہ آہستہ اٹھی۔ کلائیوں میں بجی چوڑیوں اور چھن چھن کرتی پائل سے پرسکون رات کے سناٹے کو مجروح سا کر دیا۔ وہ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ پاؤں صوفے پہ رکھ کر اس نے دونوں پاؤں سے بھاری پازیب اتاری۔

"کیا لاؤنج میں بیٹھ کر تمام رات یہ شغل جاری رکھنے کا ارادہ ہے۔" یہ مسلسل اضطراری و میکانکی عمل میں بار بار ہاتھوں کی انگلیوں سے انگوٹھیاں اتار اور پہن رہی تھی۔ سلیمان کا اشارہ اسی جانب تھا۔ اس کی نگاہیں ٹیبل پہ دھرے علیزا کے پاؤں پہ مرکوز تھیں جو مہندی کے خوب صورت گل بوٹوں سے سجا ہوا تھا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی جانے کیا بات تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ذرا بھی خوش نہیں ہے حالانکہ اصولی طور پہ اسے خوش ہونا چاہیے تھا۔ سلیمان اس کی خوشی، اس کا خواب، اس کی آرزو تھا۔ اسے پا کر آج اسے نازاں ہونا چاہیے تھا مگر وہ بہت پژمردہ لگ رہی تھی۔

"اٹھو یہاں سے۔ میں لائیٹ بند کرنے لگا ہوں۔" اسے یونہی جمے دیکھ کر وہ دوبارہ زور دے کر بولا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ لاؤنج سے سلیمان کے کمرے تک کا فاصلہ اسے بہت دشوار گزار اور پیچیدہ محسوس ہوا۔ وہ پہلے بھی اس کمرے میں آتی رہی تھی مگر آج اس کی حیثیت بدل چکی تھی اور اسی بدلی ہوئی حیثیت کا تعین اسے مشکل لگ رہا تھا۔ کسی حل نہ ہونے والے سوال کی طرح۔

سلیمان دس پندرہ منٹ کے بعد آیا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کے مگ تھے۔

"تمہیں پتہ ہے، اس وقت مجھے چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ صبح سے کسی نے پوچھا ہی نہیں۔ سب ہاسپٹل میں جو تھے۔ میں نے جلدی میں بنائی ہے۔ پتہ نہیں کیسی ہے لو تم بھی۔ تم بہت اچھے چائے بناتی ہو مگر اس وقت تمہیں زحمت دینے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ آفٹر آل نئی نویلی دلہن ہو کچھ دن تک تو تمہارے ناز اٹھانے ہی پڑیں گے۔" سلیمان نے چائے کا مگ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے خاموشی و آہستگی سے لے لیا۔

"بہت ٹھنڈ ہے آج۔ ہماری منگنی کے دن بھی ایسی ہی ٹھنڈک تھی اور آج بھی سردی ہے۔ ایسے موسم میں چائے بہت اچھی اور سکون بخش لگتی ہے۔" وہ اس کی خاموشی مسلسل کر رہا تھا۔

علیزا نے چائے کا مگ وہیں پیئے بغیر رکھ دیا جبکہ سلیمان اپنی چائے پی کر ختم کر چکا تھا۔

"علیزا! کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری۔" وہ اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔ اس کی بند پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں جن پہ ننھے منے تارے چمک رہے تھے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھے ادھوری خوشیاں اور بٹے ہوئے لوگ ہی کیوں ملتے ہیں۔ غیر تقسیم شدہ محبت' مکمل اور خالص محبت میری قسمت میں نہیں ہے کیا۔؟"

سلیمان سن سا ہو گیا۔ اسے علیزا سے اس سوال کی امید نہیں تھی۔ وہ اضطراری انداز میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ سگریٹ اس کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا جسے وہ وقفے وقفے سے کش لگا رہا تھا۔

"علیزا! تمہیں مری میں گزارے گئے وہ چند دن شاید یاد نہ ہوں مگر مجھے یاد ہیں۔ میں تمہارے سامنے ہمیشہ ایک حد میں رہتا تھا مگر اس رات کی خوابناکی پوری طرح مجھ پر چھاتی جا رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا۔ تم میرے سامنے رہو۔ ایک دو بار میرا نفس کڑکڑایا مگر تم اپنے کمرے میں مونی اور سنی کے پاس چلی گئیں۔ عین اسی وقت جب میں بہت تنہائی اور تمہاری کمی محسوس کر رہا تھا۔ رانیہ کا فون آ گیا۔"

اس کی آواز دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ علیزا کو رانیہ کا ذکر سن کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سلیمان ذہنی طور پہ اسے ٹارچر کرنا چاہتا ہو ورنہ اس وقت رانیہ کا قصہ کیا معنی رکھتا تھا۔

"رانیہ کے فون سے مجھے بہت خوشی ہوئی' اس رات مجھے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ اس نے کافی دیر مجھ سے باتیں کیں۔ یہیں سے میں نے رانیہ کی ذات کے بارے میں گہرائی سے سوچنا شروع کیا۔ وہ ایک کمزور اور پست حوصلہ لڑکی تھی جو قدم قدم پہ دوسروں کے سہارے کی محتاج تھی۔ اسے لاڈ میں پالا گیا تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات مجھ سے شیئر کرتی اور مشورہ چاہتی۔ وہ کلی طور پہ اپنے تمام معاملات میں مجھ پر انحصار اور اعتبار کرنے لگی۔ وہ کہتی کہ میری موجودگی میں اسے بڑا تحفظ ملتا ہے۔ اس اعتراف سے میری مردانہ انا کو بڑی تسکین ملی"۔

علیزا کا تمام چہرا آنسوؤں سے بھیگ چلا تھا۔ سلیمان کا اعتراف محبت اس کے وجود کو جیسے آگ میں جھونک رہا تھا اس کی من میں ڈھڑا دھڑ بھانبھڑ جل رہے تھے۔

"میں خلوص دل سے اس کی مدد کر رہا تھا۔ روز روز کی ملاقاتیں' ملنا ملانا۔ رانیہ کے ساتھ اکیلے آنا جانا۔ ان سب نے مجھے رانیہ کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جو یقیناً میرے

لیے ایک نیا رخ تھا۔ علیزا! ہو سکتا ہے میری سوچ آگے پرواز نہ کرتی مگر تمہارے جھگڑے اور الزامات نے مجھے بھی خلفشار میں مبتلا کر دیا۔ میں تمہیں جلاتے۔"

"بس کریں۔ خدا کا واسطہ ہے چپ ہو جائیں۔ میں نہیں سن سکتی۔ چپ ہو جائیں۔" گھٹی گھٹی آواز میں وہ چیخ پڑی۔

"آپ مجھے ذہنی اذیت اور رانیہ کے حوالے سے شکست کا احساس دلا رہے ہیں تو پلیز چپ ہو جائیں۔ میں نہیں سن سکتی۔ مجھ میں اتنی اعلیٰ ظرفی اور ذہنی وسعت نہیں ہے جو آپ کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام بھی سن سکوں۔" اس کا نازک وجود جل رہا تھا۔

"پلیز علیزا! چند منٹ سکون سے میری بات سن لو ورنہ ساری زندگی بے سکون رہو گی۔ میں جب رانیہ کے ساتھ ہوتا تھا تو تب بھی تمہارا تصور میرے ہمراہ ہوتا۔ یہ تم ہی تو تھیں جس نے مجھے رانیہ کے ساتھ بہت دور تک سوچنے کے بارے میں تقریباً محدود اور باندھ کر رکھ دیا تھا۔ علیزا آئی سوئیر' تم اس دوران ایک سیکنڈ بھی میرے ذہن سے اوجھل نہیں ہوتی تھیں۔ تم میری زندگی میں' میری سوچوں پہ قابض ہونے والی پہلی لڑکی ہو۔ بہر حال رانیہ کے لیے میرے وہ جذبات نہیں تھے جو تمہارے بارے میں تھے اور ہیں۔ مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ رانیہ کے بارے میں تصور کرتے ہوئے میں ہمیشہ ابہام کا شکار ہو جاتا تھا۔ شاید اس لیے کہ میرا تمہارے ساتھ نکاح ہو چکا تھا اور وہ سجان کے نکاح میں تھی۔ سجان کے آخری الفاظ سے لگتا ہے جیسے وہ سچ مچ رانیہ سے محبت کرتا تھا مگر اس کی محبت کتنی سفاک اور اذیت ناک تھی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ علیزا! میرا اعتبار کرلو...... میں نے تمہاری طرح سے کسی اور کے بارے میں نہیں سوچا۔"

محبت طاق دل پہ
جلنے والا
وہ چراغ آخر شب ہے
کہ اس کی لو
اگر مدھم بھی پڑ جائے
تو اندر کا اجالا
کم نہیں ہوتا
محبت کرنے والوں کو خبر ہے

کچھ دن یونہی بے خواب و بے خواہش
اسیری کاٹ سکتی ہے
ہمیشہ کے لیے لیکن
یہ محور سے نہیں ہٹتی
محبت
ایسا راستہ ہے
کہ جس پہ
واپسی ممکن نہیں ہوتی

"علیزا! میری کمٹمنٹ تمہارے ساتھ تھی محبت میں نے صرف تم سے کی ہے۔ آج تمام تر حقیقت تمہارے سامنے کھول کر رکھ دی ہے۔ تمہاری مرضی ہے تم مانو نہ مانو۔ علیزا! اگر میں تمہیں ذہنی طور پر اذیت دینا چاہتا یا یہ میرا مطمع نظر ہوتا تو میں تمہیں ہرگز یہ سب نہ بتاتا۔ میں نئی زندگی کا آغاز وسوسوں اور شک سے آزاد ہو کر کرنا چاہتا ہوں تاکہ بدگمانی تمہارے دل میں جگہ نہ بنا سکے۔ علیزا! تم عورتیں سچ مچ بڑی جذباتی ہوتی ہو۔ مرد پہ کسی دوسری عورت کا سایہ بھی پڑ جائے تو تم سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں۔"

سلیمان نے جوتے کی ٹو سے سگریٹ کا ٹکڑا مسلا۔ وہ اس سے دور صوفے پہ بیٹھا ہوا تھا۔ علیزا نے گھٹنوں پہ رکھا سر اٹھایا رونے سے اس کی آنکھیں گلابی گلابی سی ہو رہی تھیں۔ اس کے سینے سے ایک آسودہ سانس برآمد ہوئی۔ مسکراہٹ کرن بن کر اس کے لبوں کی تراش میں چمکی۔

سلیمان نے اس کے چہرے پہ پھیلتی خوشی فوراً محسوس کر لی۔

"معاف کرنا علیزا! ابا جان کی اچانک بیماری کی وجہ سے میں تمہارے لیے کوئی گفٹ نہیں لے سکا ہوں' ویسے رونمائی کے طور پر اگر تم مجھے قبول کر لو تو کیا کہنے یا پھر گملے میں لگا کوئی پھول توڑ کر لے آؤں۔"

علیزا نے بھاری دوپٹے سے آہستہ سے اپنا چہرہ صاف کیا۔ سلیمان اس کے قریب تھا۔ آف وائیٹ و میرون کامبی نیشن کے بھاری جو جوڑے میں ملبوس زیورات و پھولوں سے آراستہ مہندی' پرفیوم اور ابٹن کی خوشبو میں بسی سولہ سنگار کیے سامنے تھی۔

"شادی مبارک ہو بھئی۔" وہ مسکراہٹ لبوں میں دبا کر بولا۔

"بڑی جلدی آپ کو مبارک باد دینی یاد آئی ہے۔" علیزا کو ابھی تک اس بات کا غم تھا۔

"آپ نے مجھے رونمائی بھی نہیں دی۔ اتنے کنجوس ہیں آپ۔"

"صلح کر لو تو سب مل جائے گا۔"

"اچھا پھر ٹھیک ہے دوستی۔" علیزا مسکرائی۔

"یوں نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ دو عدد مسلمان ایسے تو صلح نہیں کرتے جو تم سوکھے انداز میں کہہ رہی ہو۔ صلح کرنے کے اصول بھی پورے کرنا چاہئیں۔ وہ قوال بھی کچھ یہی کہہ رہی تھی ناں......"

سدا کا سنجیدہ سلیمان اس وقت بہت شوخ ہو رہا تھا" آج ہماری صلح ہوئی ہے اسی خوشی میں......" سلیمان کی ادھوری بات کا مطلب وہ بخوبی جان چکی تھی۔

"تمہیں پتہ ہے۔ میری رہی سہی خفگی بھی ختم ہو گئی۔ ابو جان کی بات پہ یقین آ گیا ہے۔ واقعی ابو کا انتخاب لاجواب ہے۔ مجھے تم جیسی نرم دل لڑکی ہی چاہیے جو میری آئندہ نسلوں کو بھی سنوار سکے۔ کبھی روٹھے' کبھی مان جائے اور جب خفا ہو تو چوری چوری مجھے کھڑکی سے دیکھے' المیہ شاعری پڑھے۔ غمگین گانے سن کر روئے اور مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرے۔" سلیمان کا لہجہ شریر ہو گیا تو وہ جھینپ گئی۔

چاند اپنا سفر طے کر کے جانے کی تیاریوں میں تھا۔ آسمان پہ پو پھٹ رہی تھی۔ ہر رات کے بعد ایک روشن سویرا ہوتا ہے۔ علیزا کی زندگی میں بھی یہ روشن سویرا طلوع ہو چکا تھا۔ اسے یقین تھا۔ سلیمان کی ہمراہی میں اس کی آئندہ آنے والے تمام دن خوب صورت ہوں گے۔

زرد رُتوں کا آخری پھول

اسپورٹس چینل سے خواتین کی ریسلنگ دکھائی جا رہی تھی۔ اسریٰ کشن بازوؤں میں دبوچے پوری دلچسپی سے نگاہیں اسکرین پہ جمائے بیٹھی تھی۔ رابعہ نے دروازے سے اندر جھانک کر بغور اس کی سرگرمی ملاحظہ کی اور وہیں کھڑے کھڑے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

''یہ لڑتی بھڑتی عورتوں کو اتنے انہماک سے دیکھ رہی ہے، اپنی ہی صنف کی بے وقعتی۔ چہ چہ۔''

اسریٰ کو پتا تھا، اب آپی کی توپوں کا رخ یقیناً اس کی پڑھائی کی طرف ہوگا۔ اس نے فوراً چینل بدل دیا۔ وہاں ایک ماڈل گرل اپنے زریں خیالات کا اظہار کر رہی تھی۔

''پاکستان میں ماڈلنگ کے شعبے میں اب بہت ترقی ہو رہی ہے۔ ہماری ماڈل گرلز کسی طرح بھی دوسرے ملک کی ماڈلز سے پیچھے نہیں ہیں۔''

''اس کا لباس دیکھ کر ہی ''ترقی'' کا اظہار ہو رہا ہے۔'' رابعہ اندر آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اسریٰ نے جھنجلا کر ٹی وی بند کر دیا۔

''پتا ہے، آج شام کو بڑے ابا گاؤں سے آ رہے ہیں۔''

''سچ!'' اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''میں کیوں جھوٹ بولوں گی، ابو کہہ رہے تھے کہ رات کے کھانے پہ اہتمام کر لینا۔ اب اٹھو، فوراً میرے ساتھ کچن میں آؤ اور ہیلپ کراؤ۔ تین چار ڈشز اضافی ہوں گی۔ تم مجھے پیاز کاٹ دینا، سویٹ ڈش کی ڈریسنگ کر دینا، سبزیاں اور گوشت دھو دینا۔ تمہارا یہی احسان عظیم

ہوگا مجھ ناچیز پہ۔''

''مستقبل کی عظیم اور نامور ڈاکٹر کی یہ بے عزتی، اس سے کچن میں کام کروایا جا رہا ہے۔'' مصنوعی تاسف سے منہ بسورنے لگی۔

رابعہ چھوٹے موٹے کام کرتے ہوئے اس سے باتیں بھی کرتی رہی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں اس کی مطلوبہ ڈشز تیار ہو گئیں۔

''گڈ! اب پلاؤ رائتہ اور سلاد رہتا ہے۔ وہ رات کو بنا لیں گے۔ کباب بھی رات میں تلیں گے۔'' رابعہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

''پتا ہے، مجھے بڑے ابا بہت اچھے لگتے ہیں۔ میرا دل کرتا ہے، کاش دادو امی بھی زندہ ہوتیں۔ میں گاؤں جاتی، ان کے پاس رہتی، رات کو ان کے پاس سوتی اور پرانے وقتوں کے قصے سنتی۔ جب آسمان ہر طرح کی آلودگی سے پاک، صاف شفاف اور نیلا ہوتا تھا اور جب نیکی کی پریاں چھم سے ہر گھر میں اترا کرتیں۔ وہ آنکھیں موندے بولتی جا رہی تھی۔''

''اسریٰ! کبھی کبھی تو تم مجھے ڈاکٹر کے بجائے شاعرہ لگتی ہو۔ یوں لگتا ہے تم صدیوں پہلے کے ماحول اور دنیا میں رہتی ہو۔ تمہاری روح ماضی کے کھنڈروں میں بھٹکتی رہتی ہے۔ میری جان! نیکی کی پریاں تو صرف قصے کہانیوں میں ہوتی ہیں۔''

''تو کیا ہوا، میں ان سے ماضی کی کہانیاں اور قصے ہی سن لیتی۔'' اس کا لہجہ ابھی تک خوابناک سا تھا۔

اسریٰ! تم حد سے زیادہ تصوراتی ہو، حساس ہو۔ تمہارے خیالات اتنے نرم و نازک ہیں کہ چھوتے ہی لگتا ہے، حقیقت کی گرم بے رحم فضا میں جھلس جائیں گے۔

تم جاذب و جمیل سہی
زندگی جاذب و جمیل نہیں

حقیقت کی دنیا میں رہنا سیکھ لیا تو آئندہ تمہیں کوئی محرومی تنگ نہیں کر سکے گی۔ مجھے پتا ہے، تمہاری ان تمام باتوں کے پس پردہ کیا کچھ ہے۔''

رابعہ کا لہجہ از خود بھاری سا ہو گیا تو اسریٰ فوراً سابقہ کیفیت کے حصار سے نکلی۔

''چھوڑیں بھی، میں نے تو یونہی ایک عام سی بات کی تھی۔ آپ نہ جانے کہاں پہنچ گئیں۔ میں تو سوچ رہی ہوں کہ بڑے ابا کے آنے پہ کتنا مزا آئے گا نا۔ میں جونہی ایگزام سے

فارغ ہوئی تو گاؤں جاؤں گی اور مزے سے گھوموں پھروں گی۔" رابعہ مسکرا دی۔ اسریٰ کی پل پل بدلنے والی فطرت کبھی کبھی اسے بے انتہا مضطرب کر دیتی تھی۔

بڑے ابا سے وہ اتنے والہانہ انداز میں ملی کہ ایک ثانیے کے لیے وہ خود بھی حیران رہ گئی۔ بڑے ابا حسب معمول اپنے پروقار اور لیے دیئے سے انداز میں ملے۔ رابعہ کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا، وہ ابھی تک ان کے دائیں بازو کے گھیرے میں تھی۔ رابعہ سلام دعا اور سب کی خیریت دریافت کرنے کے بعد کچن میں چلی آئی جب اسریٰ ابھی تک بڑے ابا کے پاس بیٹھی باتیں بگھار رہی تھی۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ بڑے ابا اور ہاشم گیلانی دونوں آہستہ آواز میں باتیں کر رہے تھے اسریٰ دو بار جھانک چکی تھی۔ رابعہ کچن کا پھیلاوا سمیٹنے میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے آواز دے کر اسریٰ کو اپنے پاس بلایا تو وہ بدمزا سی ہوگئی۔

"بتائیں، کیا کام ہے؟" ناگواری اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ پہلے ہی بڑے ابا اور ابو کی وجہ سے جو آہستہ آواز میں باتیں کر رہے تھے، چند الفاظ اس کے کان میں بھی پڑے تھے۔ وہ کچھ پریشان سی ہوگئی تھی کیونکہ بڑے ابا کا لہجہ بہت تلخ سا تھا۔ اسے باہر سے گزرتے دیکھ کر دروازہ بند کرلیا گیا تو وہ الجھ سی گئی۔ اسی اثناء میں رابعہ کی آواز اس کے کان میں آئی تو کوشش کے باوجود وہ اپنا غصہ چھپا نہ سکی۔

"کیا بات ہے، صورت شریف پہ بارہ کیوں بجے ہیں؟"

"آپ نے کیوں بلوایا ہے؟" وہ اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔

رابعہ نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا اور رسان سے بولی۔ "میں نے سارا کام ختم کرلیا ہے۔ آؤ اب دونوں واک کر آتے ہیں۔" اس نے اتنے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا کہ اسریٰ شرمندہ سی ہوگئی۔ ڈرائنگ روم سے آتی آوازیں قدرے بلند ہوئیں تو رابعہ گھبرا گئی۔

"اسریٰ! آج چاند کی بارہ تاریخ ہے مگر اس کی چاندنی اور ٹھنڈک تو دیکھو۔ تمہیں چاند بہت پسند ہے نا۔"

"ہاں آپی! مجھے تنہا چاند بہت اچھا لگتا ہے۔" اسریٰ کے لہجے سے دبی دبی حسرت جھلک رہی تھی۔ رابعہ ٹھٹک گئی۔

"کم ان اسریٰ! یوں مت کہا کرو، اتنی قنوطی ہوتی جارہی ہو۔ ایک مزے کی بات

بتاؤں۔" وہ قصداً سسپنس پھیلا رہی تھی۔

"بتائیں نا، میں سن رہی ہوں۔"

"وہ کل خاور کا فون آیا تھا۔ ان کی پیر کو سالگرہ ہے، ہم دونوں کو انوائٹ کرنا چاہ رہے ہیں۔"

"ہائے سچ! مگر مجھے کس خوشی میں کباب میں ہڈی بنا رہے ہیں۔" رابعہ کا چہرہ گلگوں ہوگیا۔ اسریٰ نے ایکدم موڈ بدلا تھا۔ اس نے شکر کا سانس لیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں واپس آئیں تو بڑے ابا اپنی گرے جیپ میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے نظر آئے۔ جو گیٹ کے پاس متفکر سے کھڑے تھے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے گاڑی دھول اڑاتی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ شہباز گیلانی نے جاتے ہوئے اسریٰ اور رابعہ کو خدا حافظ کہنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ حالانکہ وہ ان دونوں کو دیکھ چکے تھے۔

"ابو جان! کیا بات ہے۔ یہ بڑے ابا اس وقت کیوں چلے گئے، آپ نے روکا کیوں نہیں؟ پورے دو ڈھائی گھنٹے کا راستہ ہے، اتنی دیر سے پہنچیں گے۔"

رابعہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تو ہاشم زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پہ سجاتے ہوئے بولے۔

"وہ دیہاتی ماحول کے عادی ہیں۔ میں نے بہت کہا رات کو رک جائیں مگر نہیں مانے۔"

رابعہ آسانی سے بہلنے والی نہیں تھی مگر مصلحتاً خاموش ہوگئی کیونکہ اسریٰ اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اس کے سامنے سوال جواب مناسب نہیں تھے۔

◉

اس مقامی ہاسپٹل میں آج اسریٰ کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔ اس نے ہاسپٹل پہنچتے ہی گھر فون کیا۔ رابعہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ بہن کا فون سننے کے بعد وہ مطمئن سی ہوگئی۔ ابو اسٹڈی روم میں تھے۔ باقی کا ڈرامہ اس نے پوری دلچسپی سے دیکھا۔

وہ ٹی وی بند کرکے اٹھنے لگی تھی جب بڑے ابا کا فون آیا۔

ہاشم دھواں دھواں چہرے کے ساتھ ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ سن رہے تھے۔

"ہاشم! میں آخری بار کہہ رہا ہوں اسکے بعد میں سمجھوں گا تم میرے لیے مرچکے ہو۔" وہ اتنی سفاکی سے کہہ رہے تھے کہ ہاشم کو اپنا سانس سینے میں رکتا محسوس ہوا۔ دوسری طرف سے فون بند ہوچکا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے وہیں ڈھے سے گئے۔ دل کی

بیماری انہیں تین چار برسوں سے لاحق تھی، مگر اس وقت رابعہ سے ان کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ سینے کو بری طرح مسل رہے تھے اور کھانس رہے تھے۔ انہوں نے اشارے سے رابعہ کو اپنی دوائی لانے کو کہا۔ وہ واپس آئی تو ان کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا اور آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ رابعہ نے جلدی سے ابو کے قریبی دوست جواد لطیف کو فون کر کے ان کی حالت سے آگاہ کیا۔ وہ پندرہ منٹ کے اندر اندر ڈاکٹر کے ساتھ آئے۔ ڈاکٹر نے فوراً ہاسپٹل لے جانے کا مشورہ دیا۔

رابعہ نے اسریٰ کو اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر بہت زیادہ پریشان ہو جاتی تھی اور پھر امی کے بعد وہ ابو کے لیے بہت حساس ہو گئی تھی۔ گھر سے قریبی ہاسپٹل میں ہاشم گیلانی کو جواد لطیف نے وقت ضائع کیے بغیر ایڈمٹ کروا دیا تھا۔ رابعہ صبح تک وہیں رہی۔ گھر، ملازم اور چوکیدار کے حوالے تھا جو بڑے ابا نے گاؤں سے بھیجے تھے۔ بے حد قابل اعتماد اور وفادار۔ درحقیقت ملازم رحیم اور چوکیدار فیض بخش، شہباز گیلانی کے ایک طرح سے جاسوس ہی تھے۔ تین برس پہلے انہوں نے ضد کر کے خدمت کے بہانے ہاشم کے پاس رکھوائے تھے۔ انہوں نے احترام کی وجہ سے چپ سادھ لی، ورنہ کہہ سکتے تھے شہر میں ملازمین کی کمی تو نہیں ہے۔ گھر کے اکثر کام رابعہ نے اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ ہاشم فارن سروس میں تھے، ملکوں ملکوں گھومنے کی وجہ سے ان سب کو اپنا کام خود کرنے کی عادت تھی۔ رابعہ نے ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں ڈپلوما لے رکھا تھا۔ چھ ماہ پہلے ہاشم نے جواد لطیف کے بیٹے خاور سے اس کی منگنی کر دی تھی۔ اس رشتے پہ ان کے خاندان میں سے کوئی بھی خوش نہیں تھا۔ شہباز گیلانی کئی بار اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر چکے تھے۔

صبح ہی صبح ہاشم گیلانی کے گھر کے آگے تین گاڑیاں آ کر رکیں۔ یہ سب گاؤں سے آئے تھے۔ رابعہ کو خاور نے بڑی مشکل سے گھر بھیجا تھا وہ خود ہاسپٹل میں تھا۔ بڑے ابا کے ساتھ دونوں چچا، ان کی بیٹیاں اور تین بیٹے بھی تھے۔ بڑے ابا کی بیٹی زرین بھی آئی تھی رابعہ نے ان کی خاطر مدارات کرنے کی کوشش کی مگر بڑے ابا نے اسے روک دیا۔

''یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ ہم سب ہاسپٹل جا رہے ہیں۔ عورتیں یہیں رکیں گی۔ اگر ہاشم کی طبیعت میں بہتری کے آثار دکھائی نہ دیئے تو پھر یہ بھی آئیں گی اور تم فکر مت کرنا۔'' دل خراش الفاظ سے انہوں نے تو جیسے اس کا سینہ چیر دیا۔ کتنے آرام سے کہہ دیا طبیعت

میں بہتری کے آثار دکھائی نہ دیئے تو......

''اللہ نہ کرے جو ابو کو کچھ ہو۔'' اس کا رواں رواں دعا گو تھا۔ کبھی کبھی بڑے ابا اسے سنگ دلی کی انتہاؤں کو چھوتے نظر آتے تھے۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں۔

اس نے اسریٰ کو بتایا تھا۔ وہ فوراً ہی گھر آ گئی تھی۔

زرین اسریٰ کو بڑے غور سے تولتی اور کھوجتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ''یہ تو چادر سر پہ لیتی ہے۔'' اس نے سلطانہ خاتون سے سرگوشی کی۔ وہ بھی بغور اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسریٰ کپڑے بدلنے چلی گئی۔ رابعہ، خاور سے مسلسل رابطے میں تھی۔

''آپی! میں ہاسپٹل جا رہی ہوں۔'' اس نے متفکر سی بیٹھی رابعہ کو بتایا اور ان سب کی طرف آئی۔ ''آپ لوگ آپی کی میزبانی سے فیض یاب ہوں، کسی قسم کے تکلف کی ضرورت نہیں ہے، آپ کا اپنا گھر ہے۔'' وہ جس طرح آئی تھی، اس طرح عجلت میں چلی گئی۔

دو دن بعد ہاشم گیلانی کو ہاسپٹل سے فارغ کر دیا گیا۔

اس دوران بڑے ابو، دونوں چچا اور ان کے بیٹے وہیں رہے تھے۔ زرین اور دوسری خواتین گاؤں واپس چلی گئی تھیں۔

اسریٰ، ہاشم صاحب کے لیے سوپ لے کر آ رہی تھی کہ بڑے ابا کی تیز آواز نے اس کے قدم روک دیئے۔

''ہاشم! مجھے جلد از جلد جواب چاہیے۔'' اسریٰ اندر داخل ہوئی تو شہباز گیلانی کے چہرے کی سلوٹیں فوراً دور ہو گئیں۔ وہ اسے دیکھ شفقت سے مسکرائے۔ اسریٰ، ابو کے سرہانے بیٹھ گئی، ان کی آنکھیں بند اور سر نڈھال سے انداز میں تکیے پہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے ابو کے ماتھے پہ اپنا ہاتھ رکھا تو انہوں نے فوراً اپنی آنکھیں کھول دیں۔

''ابو! سوپ پی لیں۔'' وہ آہستگی سے بولی۔ بیڈ کے دوسرے سرے پہ شہباز بھی ہاشم کے پاس بیٹھ گئے اور اسریٰ کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا۔

''تم ہٹو، میں خود پلاتا ہوں۔'' اس نے بڑے ابا کی طرف دیکھا۔ کتنی جلدی وہ تیور بدل لیتے تھے۔

ہاشم نے آدھا پیالہ پینے کے بعد ہاتھ سے پیالہ ہٹا دیا۔

شہباز ٹشو پیپر سے ان کے ہونٹ اور منہ صاف کرتے ہوئے بولے۔ ''جلدی سے

ٹھیک ہو جاؤ، ہم سب کو تمہاری تندرستی کی ضرورت ہے۔ کیوں اسریٰ بیٹی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔ یہ ٹھیک ہو جائے تو میں پھر بابر کی شادی کی تاریخ رکھوں اور تم تو ایک مہینہ پہلے آؤ گی، خوب اچھی طرح گھوم پھر کر گاؤں بھی دیکھ لینا اور ہم لوگوں کا رہن سہن بھی۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ جب تم ہاؤس جاب مکمل کر لو تو ادھر گاؤں کے ہاسپٹل میں ہی آ جاؤ۔ وہاں تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔"

اسریٰ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

شہباز گیلانی کچھ دیر بعد چلے گئے۔

رابعہ اور اسریٰ دونوں ہاشم صاحب کے پاس بیٹھ گئیں۔

"اب آپ مکمل ریسٹ کریں گے، اگر کہیں کوتاہی ہوئی تو میں آپ سے بولنا چھوڑ دوں گی۔" اسریٰ نے دھمکی دی۔ وہ مسکرا دیے اور اس کا سر اپنے ساتھ لگا لیا۔

وہ رفتہ رفتہ پہلے کی طرح تندرست نظر آنے کی پوری کوشش کر رہے تھے، انہیں احساس تھا کہ اسریٰ اور رابعہ ان کی وجہ سے کتنی پریشان رہتی ہیں۔

وہ ڈیوٹی روم میں ساتھی ڈاکٹرز شہلا اور صدف کے ساتھ چائے پی رہی تھی، تب ہی وہاں ڈاکٹر حمزہ بھی آ گئے۔

"مجھے پتا تھا یہاں چائے ہی پی جا رہی ہے چوری چھپے۔" انہوں نے بڑے آرام سے چوتھا کپ اٹھا لیا جو ڈاکٹر صبیحہ کے لیے تھا۔ چائے ختم کر کے اسریٰ اٹھ کھڑی ہوئی تو ڈاکٹر حمزہ سمیت ان دونوں نے بھی اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"میں ذرا وی آئی پی وارڈ میں جھانک آؤں روم نمبر نائن کی پیشنٹ مجھ سے بہت مانوس ہو گئی ہیں جاتے جاتے دیکھ لوں۔" وہ سر پہ سیاہ اسکارف درست کرتی ڈیوٹی روم سے باہر نکلی۔

اس کی نرم دلی اور ہمدرد فطرت کے باعث اکثر کولیگ اسے پسند کرتے تھے۔ ڈاکٹر حمزہ کو تو وہ اور ہی رنگ میں بھانے لگی تھی، اپنی اپنی سی لگنے لگی تھی۔

وارڈ میں مریضوں کو دیکھنے کے بعد وہ راہداری میں بنے آخری کمرے کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی۔ یہ روم نمبر بائیس تھا۔ اسریٰ کے ساتھ دو نرسیں بھی تھیں۔

"ہاں بھئی، کیسے ہیں آپ؟ کچھ امپروومنٹ محسوس کر رہے ہیں؟"

اسریٰ نے مریض کے سرہانے کھڑے ہوتے ہوئے خوش اخلاقی سے پوچھا اور پھر

اس کی کیس فائل کا جائزہ لینے لگی۔ دوسری طرف دنیا جہان کا شوق آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔

"پہلے تو نہیں مگر اب کافی بہتر محسوس ہونے لگا ہے۔" زیاد آرام سے بولا۔ اسریٰ نرس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کی بات کو دھیان سے نہ سن سکی۔ "فریحہ! آپ ان کی ڈریسنگ دوبارہ کریں، اس میں سستی نہیں ہونی چاہیے۔" پھر اس نے خود زیاد کے ٹوٹے بازو اور پسلیوں کا جائزہ لیا۔

"آپ تو بہت باحوصلہ اور مضبوط ہیں۔ سرجن افتخار احمد آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔" اسریٰ نے اس کے پٹیوں میں جکڑے جسم کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

تین دن پہلے وہ شدید زخمی حالت میں یہاں آیا تھا۔ اس کی تین پسلیاں اور بایاں بازو ٹوٹ چکا تھا۔ گردن کے آس پاس کا نازک حصہ بھی زخمی تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے سب سے پہلے اسریٰ کو دیکھا تھا۔ اسے وہی اٹینڈ کر رہی تھی۔ کوئی کوئی لمحہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اچھا بھلا انسان ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ شدید زخمی حالت میں ہونے کے باوجود زیاد چوہدری کی زندگی میں بھی یہ لمحہ آ چکا تھا۔ اسے ڈاکٹر اسریٰ کی مسیحائی اچھی لگی تھی۔ زیاد نے آنکھوں سے چھلکتی وارفتگی چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

اسریٰ کی آج پھر نائٹ ڈیوٹی تھی۔ گزشتہ تین چار روز سے روم نمبر بائیس کے مریض نے اسے عاجز کر کے رکھ دیا تھا۔ نرسیں اور دیگر اسٹاف دبی دبی آواز میں اسی کے بارے میں گفتگو کرتے نظر آتے۔ آج اس کا پکا ارادہ تھا، کسی صورت میں بھی روم نمبر بائیس کے قریب بھی نہیں پھٹکے گی۔ اس شخص کے بیباک جملے اور نگاہیں کم از کم اب اس کے لیے ناقابل برداشت تھے۔ رات ڈیوٹی کے دوران وہ اپنے ارادے کے مطابق روم نمبر بائیس میں نہیں گئی اور اس کا نتیجہ دوسرے روز بڑے تلخ انداز میں نکلا۔

سینئر ڈاکٹر افتخار اور سرجن نصیر خان نے اسے سخت انداز میں ڈانٹا۔

"ڈاکٹر اسریٰ! آپ تو مسیحائی کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ مریض کیا ہے، کون ہے، کیسا ہے، اس سے قطع نظر آپ کو صرف اپنے فرض سے مطلب ہونا چاہیے۔ آئندہ میں کوئی شکایت نہ سنوں۔" اسریٰ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔

ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو ایک نرس نے ڈاکٹرز کی موجودگی میں اسریٰ سے کہا تھا۔

"ڈاکٹر صاحبہ! نمبر بائیس کا پیشنٹ بہت شور کر رہا ہے، اس نے انجکشن بھی نہیں لگوایا اور دوا لینے سے بھی انکار کر رہا ہے اور ہماری ہدایات پہ کوئی عمل نہیں کر رہا ہے۔ اس بے احتیاطی

سے اسے نقصان ہی پہنچے گا۔ وہ کہہ رہا کہ ڈاکٹر اسریٰ ہی مجھے اٹینڈ کریں۔" شہلا اور صدف کے چہرے پہ دبی دبی مسکراہٹ تھی۔

"اسریٰ! بڑا ہینڈسم بندہ ہے، کسی اچھی خاندان کا لگتا ہے۔ اس کا کمرہ ملاقاتیوں سے بھرا رہتا ہے اور نرس رخشندہ بتا رہی تھی کہ مہنگی مہنگی گاڑیوں میں لوگ اس کی عیادت کرنے آتے ہیں اور چھوٹے ملک صاحب، چوہدری صاحب کہتے ان کا منہ سوکھتا ہے۔"

صدف کے انداز میں شرارت صاف محسوس کی جاسکتی تھی مگر اسریٰ کو بہت برا لگا۔

وہ غصہ ضبط کرتی اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اسے دیکھتے ہی زیاد کے لب مسکرا اٹھے۔

"کیا تکلیف ہے آپ کو؟" اس نے اندرونی طیش چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

"آپ کل کیوں نہیں آئیں اسریٰ!" اس نے لفظ "اسریٰ" خاصی بے تکلفی سے ادا کیا۔ ڈاکٹر کا سابقہ اس نے گول کر دیا تھا۔

"آپ ہوتے کون ہیں مجھ سے یہ سوال کرنے والے۔ آپ کو پتا ہے کہ آپ کے اس غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل کی وجہ سے میں کتنا عجیب محسوس کر رہی ہوں۔" وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا پھر اس نے بڑی شرافت سے اسریٰ کی موجودگی میں نرس سے انجکشن لگوایا اور میڈیسن لی۔

خلافِ توقع اس کے ردِعمل کو دیکھ کر اسریٰ بہت حیران ہوئی، کیونکہ اپنے تیور اور مزاج کی بدولت وہ اتنی جلدی پیچھا چھوڑنے والوں میں سے نہیں لگ رہا تھا۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا، اس نے سکون کا سانس لیا۔ چند روز بعد وہ ڈسچارج ہو کر چلا گیا۔

بڑے ابا پھر آئے ہوئے تھے۔ اب کی بار ان کے ساتھ بڑی امی بھی تھیں۔ اسریٰ آج گھر پہ ہی تھی۔ رابعہ حسبِ معمول کچن میں تھی۔ اسریٰ اس کے پاس چلی آئی۔

"ہاشم! تم نے کہیں نہ کہیں بیٹیوں کی شادی کرنی ہی ہے پھر تمہیں اپنے جانے پہچانے لوگوں میں شادی کرنے پہ کیا اعتراض ہے۔ اس طرح تم اپنے پرکھوں کی روایات سے قریب تر رہو گے۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں، بڑا بھائی ہوں۔ تمہارے باپ کی جگہ ہوں، غلط نہیں سوچوں گا۔ تم خود بیمار رہتے ہو۔ ٹھنڈے دل سے سوچو، تمہارے بعد رابعہ اور اسریٰ کا کیا بنے گا، کون ان کے سر پہ ہاتھ رکھے گا۔" شہباز انہیں نفسیاتی ہتھکنڈوں سے پرچانے کی کوششیں

کر رہے تھے..... ان کی توقع کے عین مطابق ہاشم صاحب کے چہرے پر تذبذب کے اثرات واضح ہونے لگے تھے۔

"بھائی جان! رابعہ کی منگنی ہو چکی ہے اور اسریٰ کا ہاؤس جاب ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے۔ میں ابھی اس بارے میں سوچنے سے معذور ہوں۔" انہوں نے رک رک کر جیسے اپنی مجبوری بیان کی مگر وہ ذرہ بھر بھی خاطر میں نہیں لائے......

"تو کیا ہوا، منگنی ٹوٹ بھی سکتی ہے۔" وہ کمال اطمینان سے بولے ہاشم صاحب نے انہیں زخمی نگاہوں سے دیکھا۔

"ہم زبان دے کر پھرتے نہیں ہیں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولے تو شہباز ان کی طرف جھک آئے۔

"میں بھی زبان دے کر پھروں گا نہیں۔ رابعہ نہ سہی، اسریٰ ہی سہی۔" ان کے لبوں سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ پہ تحکم کی مہر لگی ہوئی تھی۔

"ہاں ہاشم! یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" سلطانہ خاتون نے شوہر کی حمایت ضروری سمجھی۔ وہ خود کو اس محاذ پہ بالکل تنہا محسوس کر رہے تھے۔ سینے میں بائیں طرف پھر انہیں درد اور گھٹن کے ساتھ بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔

"اسریٰ! آج فارغ ہونے کے بعد میرے ساتھ چائے پینے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" ڈاکٹر حمزہ نے اچانک ہی اس سے سوال کیا وہ چونک گئی۔ ڈیوٹی روم میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ڈاکٹر حمزہ واحد شخص تھے، جنہوں نے روم نمبر بائیس کے مریض کے معاملے میں اس کی حمایت کی تھی۔ اسریٰ ان کی ممنون تھی، بلکہ اس نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ ڈاکٹر حمزہ نامحسوس انداز میں اس کی چھوٹی موٹی کئی مشکلات حل کر چکے تھے۔ مریضوں کے ساتھ بھی ان کا رویہ بہت ہمدردانہ ہوتا تھا۔

پھر چائے پینے کے دوران ڈاکٹر حمزہ نے حیران کن سوال کیا۔

"اسریٰ! اگر میں اپنے گھر والوں کو آپ کے گھر بھجواؤں تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟" وہ چائے پینا بھول کر پوری آنکھیں کھولے انہیں دیکھتی گئی۔ حمزہ مسکرائے تو اس نے ہڑبڑا کر نظریں جھکا لیں اور ٹیبل کی سطح خوامخواہ ناخنوں سے کھرچنے کی کوشش کرنے لگی۔

"آپ نے جواب نہیں دیا؟" حمزہ اس کی اس کیفیت سے حظ اٹھا رہے تھے۔

"جواب میرے ابو دیں گے۔" یہ کہہ کر وہاں رکی نہیں۔ حمزہ طمانیت سے مسکرائے۔

جاب کرتے ہوئے انہیں سات سال گزر چکے تھے۔ گھر والوں کی طرف سے ان پہ شادی کر لینے کے لیے بہت دباؤ تھا۔

حمزہ نے بارہا اس سے حالِ دل کہنے کا ارادہ کیا مگر پھر اسریٰ کا لیا دیا رویہ آڑے آ گیا۔ آج ہمت کر کے انہوں نے یہ مشکل مرحلہ بھی طے کر لیا تھا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ اسریٰ کے والد اس کے پروپوزل کو رد نہیں کریں گے۔ وہ اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو شرافت و نجابت میں مثالی سمجھا جاتا تھا۔

حمزہ کے والدین نے بڑی خوبصورتی سے اپنا مدعا ہاشم گیلانی کے روبرو گوش گزار کیا۔ انہوں نے رسماً سوچنے کی مہلت مانگی۔ وگرنہ دل سے وہ مکمل طور پہ راضی تھے۔ ڈاکٹر حمزہ سے تین چار بار پہلے بھی ان کی ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ ان کی شرافت اور مضبوط کردار کے مداح تھے۔ درحقیقت وہ اسریٰ کے لیے ایسے ہی شریکِ سفر کے متمنی تھے۔ بیٹھے بٹھائے ان کی آرزو پوری ہو رہی تھی۔ جلد از جلد وہ رابعہ اور اسریٰ کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہ رہے تھے کیونکہ شہباز گیلانی کے ارادے انہیں کچھ اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ سارا خاندان شہباز کا ہم نوا تھا، وہ کہاں تک اکیلے سب کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

اسریٰ نے ان کی خواہش پہ سر جھکا دیا تھا۔ حمزہ ایک آئیڈیل مرد تھے۔ پُروقار، اعلیٰ تعلیم یافتہ، اچھے اخلاق و کردار کے مالک۔ جب دھیمے لہجے میں بولتے تو بے اختیار جی چاہتا، بس وہی بولتے رہیں اور باقی آوازیں معدوم ہو جائیں۔

حمزہ نے اس رات پہلی بار اسریٰ سے ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ وہ ڈنر پہ ان کے گھر مدعو تھے۔

"اسریٰ بیٹی! حمزہ کو گھر دکھاؤ۔" ہاشم نے کہا تو وہ حمزہ کو لے کر باہر لان میں آ گئی۔

"یہ تمام پودے میں نے لگائے ہیں۔ یہ بوگن ویلیا اور سدا بہار کی باڑ کی دیکھ بھال صرف اور صرف میرا کمال ہے۔ یہ رنگ برنگے گلاب کے پھولوں کے پودے میں نے آپی کے ساتھ شہر بھر کی نرسریاں چھاننے کے بعد خریدے تھے۔ گملوں پہ پینٹ رابعہ آپی نے کیا ہے اور یہ جامن کا پیڑ آپ دیکھ رہے ہیں نا، یہ ابا نے چھ سال پہلے لگایا تھا۔ اب اس میں بور آ رہا ہے۔ انشاء اللہ

پھل بھی لگے گا۔"

وہ سادہ سے لہجے میں یہ سب بتا رہی تھی۔ حمزہ یک ٹک اسے دیکھے گئے تو وہ جھینپ گئی۔

"کوئی بات ہے تم میں، میں ایسے ہی تو نہیں مرمٹا ہوں۔" وہ سنگی ستون سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے بدستور اسے دیکھے گئے۔

"آئیں، اندر چلتے ہیں۔" اسریٰ کو کوئی جائے فرار نظر نہیں آ رہی تھی۔ سو اس نے اندر جانا چاہا۔ حمزہ مسکرانے لگے۔

"بہار کا موسم، ٹھنڈی میٹھی چاندنی سی رات ہو اور ایک دلربا کا ساتھ ہو تو کون کافر ہے جو اندر جانا پسند کرے گا۔"

حمزہ نے پہلی بار اس کے ہاتھ کو چھوا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پتھر کی بینچ پہ وہ حمزہ سے قدرے فاصلے پہ ٹک گئی۔ وہ دونوں کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ حمزہ نے اسے اپنی بہت ساری پسندیدہ اور ناپسندیدہ چیزوں کے بارے میں بتایا۔

"مجھے چاند سے چاندنی راتوں سے، بارش کی آواز سے، جاتی بہاروں کے موسم میں کھلنے والے جنگلی پھولوں سے عشق ہے۔ ہاں سردیوں کی بارش جانے کیوں مجھے اداس سا کر دیتی ہے۔ کچھ بکھری کٹی یادوں کے در وا کر دیتی ہے۔ ایسے میں اکثر اپنے کمرے میں بیٹھا کھڑکیاں کھول کر میں بارش کی ٹپ ٹپ میں بہت کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے اقبال بانو کی غزل داغ دل ہم کو یاد آنے لگے اور نیرہ نور کی آواز میں گائی گئی یہ نظم "عشق ہمیں برباد نہ کر" بہت پسند ہیں۔ ریلیکس موڈ میں، میں اکثر غلام علی، اور اے نیر کو سنتا ہوں۔ فیض احمد فیض کی نسخہ ہائے وفا مجھے ازبر ہو چکی ہے۔ منشا یاد کے افسانے میرے دل کو چھو جاتے ہیں۔ بنیادی طور پہ مجھے اپنی مٹی اور یہاں بسنے والوں سے عشق ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں کہیں بھی مروں، مجھے اپنی مٹی میں ہی دفنا جائے اور اب تم اپنے بارے میں بتاؤ۔"

حمزہ دھیمی سی مسکراہٹ سے اسے دیکھتے ہوئے بولے تو وہ ہڑبڑا کر حمزہ کی آواز کے سحر سے باہر نکلی۔

"آپ کی آواز بہت خوبصورت ہے اور آپ کی پسند، ناپسند شاعروں اور ادیبوں والی ہیں۔ اس وقت کہیں سے بھی نہیں لگ رہا ہے کہ آپ ڈاکٹر ہیں۔"

وہ یکدم چپ ہو گئے۔ چہرے پہ پھیلی مسکراہٹ بھی معدوم ہو گئی۔

''وہ بھی یہی کہتی تھی۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولے اسریٰ نے الجھ کر حمزہ کو دیکھا۔

''وہ...... وہ میرا دوست تھا۔ وہ بھی بالکل یہی کہتا تھا۔'' ان کا لہجہ بہت کھوکھلا سا تھا مگر انہوں نے بہت جلد خود کو نارمل کر لیا۔

''اسریٰ! تم بھی تو کچھ بولو، اپنے بارے میں بتاؤ۔'' اسے ہنوز خاموش دیکھ کر حمزہ نے اصرار کیا اسریٰ نے اپنی صاف شفاف بے ریا آنکھیں اٹھا کر ذرا کی ذرا ان کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھری۔

''آپی اور میں چھوٹے چھوٹے تھے۔ جب امی نے دائمی جدائی ہمیں بخشی۔ ابو بتاتے ہیں کہ میں اس وقت ڈھائی سال کی تھی پھر ابو نے جی جان سے...... ہمارا خیال رکھا۔ ان کے ساتھ ہم نے بہت سے ملکوں کی سیر کی۔ گزشتہ چھ سال سے ہم اب مستقل پاکستان میں ہیں۔ تین سال قبل ابو نے ریٹائرمنٹ لے لی اور تب ہی یہ گھر تعمیر کروایا۔ طرز تعمیر کے متعلق آپی اور میں نے ابو کو بہت اوٹ پٹانگ سے مشورے دیئے۔ اگر ان پہ عمل درآمد ہوتا تو ہمارا گھر اتنا خوبصورت نہ لگتا جتنا اب ہے۔ البتہ فرنیچر، کلر اسکیم، کارپٹ پردے ڈیکوریشن سب ہماری پسند کے ہیں۔''

جھکی جھکی پلکوں سمیت وہ سیدھی حمزہ کے دل میں اتری جا رہی تھی۔

''ہمارے گھر میں بھی تمہاری پسند کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔'' گزشتہ آدھے گھنٹے سے وہ اسریٰ کو آپ کے بجائے تم کہہ کر مخاطب کر رہے تھے جو اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''اسریٰ! مجھے لڑکیوں اور عورتوں میں چالاکی بالکل بھی اچھی نہیں لگتی۔ ہاں میں ان کی سمجھداری کی قدر کرتا ہوں۔ مجھے چالاکی اور ہوشیاری منفی صفت لگتی ہے۔ میرا خیال ہے لائف پارٹنر قدرے سادہ اور تھوڑی احمق ہو تو اچھی گزرتی ہے۔ دو اور دو چار کرنے والی بیویاں زہر لگتی ہیں۔ مجھے۔ تم بھی تو بہت سادہ مزاج ہو اس لیے دل کو چھو گئی ہو اور جو چیز میرے دل کو چھو لے، میں ہمیشہ کے لیے اسے دل میں بند کر لیتا ہوں، اس قید پہ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟''

اسریٰ نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔

حمزہ نے رسٹ واچ میں ٹائم دیکھا۔ ''اوہ گاڈ! ساڑھے دس بجنے والے ہیں، باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ میں اب انکل سے اجازت لے کر چلوں گا۔ حمزہ اٹھ کھڑے ہوئے تو اسریٰ نے بھی ان کی تقلید میں اندر کی جانب قدم بڑھائے۔

رابعہ نے صبح سے خوامخواہ سسپنس پھیلایا ہوا تھا۔ پہلے اکیلی بازار گئی اور واپس آتے ہی کچن میں گھس گئی۔ اسریٰ کو اس نے کمرے تک محدود کر دیا تھا۔ کوریئر سے سرخ گلابوں کا بکے اور کارڈ رابعہ نے وصول کیا تھا۔ تبھی گیٹ سے حمزہ کی گرے ٹویوٹا اندر داخل ہوئی۔ وہ تلے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ رابعہ انہیں لیکر اسریٰ کے کمرے میں آ گئی۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو اسریٰ! اب رابعہ کا پھیلایا ہوا سسپنس اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ اس نے اسریٰ کو سرپرائز دینے کے لیے چکر میں حمزہ کو بھی انوائٹ کر لیا تھا۔ اسریٰ نے بے تابی سے ریپر پھاڑ کر حمزہ کے دیئے گفٹ کو کھولا۔

حمزہ نے اسے اس کے پسندیدہ شاعر ابن انشاء کی کتابوں کا سیٹ اور ایک سی ڈی دی تھی جس میں ابن انشاء کا کلام مختلف گلوکاروں نے گایا تھا۔

رابعہ نے اسے پھولوں کا بکے اور کارڈ تھمایا تو اس نے کارڈ کھولا۔ اندر خوبصورت اور صاف لکھائی میں نیک تمنائیں لکھی ہوئی تھی۔ آخر میں بھیجنے والے کے نام کی جگہ Only for you لکھا تھا۔ سرخ گلاب بھلا اسے کون بھیج سکتا تھا۔

''شاید صدف اور شہلا میں سے کسی نے سرپرائزنگ گفٹ بھیجا ہے مجھے۔'' اس نے اندازہ لگایا اور پھول فوراً گلدان میں سجا دیئے۔ حمزہ دلچسپی سے اس کی سرگرمیاں دیکھ رہے تھے۔ اسریٰ نے سی ڈی پلیئر آن کر کے حمزہ کی دی ہوئی سی ڈی لگائی۔

''اس میں تو سارے گانے ہی میرے فیورٹ ہیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

سچ مچ وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ رابعہ نے ٹیبل سیٹ کر کے اسے بلایا تو وہ باہر آ گئی۔ کیک کاٹنے کے بعد اس نے سب سے پہلے ابو کے منہ میں چھوٹا سا پیس ڈالا۔ وہ کچھ دیر کے بعد معذرت کر کے چلے گئے۔ وہ تینوں بیٹھے کافی دیر گپ شپ کرتے رہے، چھوٹی چھوٹی سی بے معنی باتیں۔ اسریٰ کے بچپن کے قصے، امی سے بچھڑنے کا دکھ، ابو کی بیماری، خاور سے رابعہ کی منگنی اسریٰ کی ہاؤس جاب اس کی عادات، متلون مزاجی، حساس فطرت، سب کچھ ہی تو زیر بحث آیا تھا۔

دوسرے روز اسریٰ نے صدف اور شہلا سے پوچھا۔

''مجھے پھول اور کارڈ کس نے بھجوایا تھا؟'' ان دونوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ پریشان ہو گئی۔ بھلا سرخ گلاب اور کون بھجوا سکتا ہے؟ سرخ گلاب جو بھیجنے والے کی شدت اور

محبت کا اظہار کر رہے تھے، اس نے بڑی مشکل سے سوالوں کو ذہن سے جھٹکا تھا۔

کچھ کہنا چاہیں تم سے
ڈرتے ہیں برا نہ مانو
ہم ملنا چاہیں تم سے
ڈرتے ہیں بچھڑ نہ جاؤ
تو ہے ہر گھڑی سپنا میرا
تو ہے ہر گھڑی اپنا میرا
میری دھڑکنیں سنگیت ہیں
تیری چاہت تیرے پیار میں
بس ایک بار اوہ میرے یار
دل رکھنے کو کہہ دے پیار

اسریٰ کو آج پھر کوریئر نے ریپر میں لپٹا چھوٹا سا پیکٹ دیا تھا۔ فیصل لطیف کے گانوں کے ساتھ ایک کارڈ بھی تھا جس پہ خوبصورت لکھائی میں پہلے کی طرح only for you لکھا ہوا تھا۔

پوری کیسٹ میں یہی ایک گانا ریکارڈ تھا۔ اب کے وہ سچ مچ تجسس اور پریشان تھی۔ رابعہ کو بھی اس نے بتا دیا تو وہ آرام سے بولی۔

''حمزہ بھائی ہی یہ ڈرامہ کر رہے ہوں گے تاکہ جلد از جلد تم ان کے آنگن میں جلوہ افروز ہو سکو۔'' اسریٰ کے گال گلابی سے سرخ ہو گئے۔ وہ کچھ دیر پہلے کی الجھن اور تجسس فراموش کر گئی جو کوریئر سے پیکٹ وصول کرتے ہوئے اسے لاحق تھا۔

''تم خوامخواہ اتنا پریشان ہو رہی ہو، مجھے سو فیصد یقین ہے یہ حرکت حمزہ بھائی کی ہے۔ ابو کل جواد انکل سے کہہ رہے تھے کہ بہت جلد وہ تمہارے بارے میں اچھی طرح چھان بین کر لیں مگر انہوں نے اس بات کو یہ کہہ کر اہمیت نہیں دی کہ حمزہ بہت اچھا شخص ہے۔ مجھے واثق امید ہے کہ میری رخصتی پہ تمہارا معاملہ بھی نمٹ جائے گا۔''

''مگر ابھی تو میرا ہاؤس جاب بھی مکمل نہیں ہوا ہے۔'' وہ منمنائی۔

''اسریٰ! ابو ہماری طرف سے بہت پریشان ہیں۔ جانے کیا بات ہے بڑا ابا۔'' رابعہ نے یکدم خیال آنے پر زبان دانتوں تلے دبا کر باقی الفاظ کا گلا گھونٹ دیا اور کمرے سے باہر

چلی گئی۔ تب ہی اسریٰ کا موبائل بج اٹھا۔ دوسری طرف حمزہ تھے۔ سلام دعا کے بعد کہنے لگے۔

''امی اور بھابھی تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں۔ ہمارے گھر کا وزٹ کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے یا ایک بار ہی آنے کا ارادہ ہے؟'' وہ جان بوجھ کر اسے نروس کرنے کے لیے کبھی کبھار اچانک شوخ ہو جاتے تھے۔ اسریٰ نظر انداز کر گئی۔ اچانک رابعہ کی بات اسے یاد آ گئی۔ اس نے فوراً پوچھ ڈالا۔

''آپ نے میری برتھ ڈے والے دن سرخ گلاب بھجوائے تھے؟''

''ارے نہیں بھئی، مجھے بھجوانے کی کیا ضرورت تھی۔ خود جو یہ نفس نفیس آ گیا تھا۔ ویسے بات کیا ہے؟

حمزہ کا لہجہ سچائی و سادگی لیے ہوئے تھا وہ پھر الجھنوں میں گھر گئی۔ ''بھئی ویسے ہی کہہ رہی تھی مذاق کر رہی تھی۔'' اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔

حمزہ نے بھی زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا فون بند کر دیا۔

◉

ہاشم گیلانی نے رابعہ کی شادی کی تاریخ کا اعلان کر دیا تھا۔ اسریٰ آتے جاتے اسے چھیڑتی تو وہ رونے لگتی تھی۔ خوشی اور غم کا کیسا ملاپ تھا جو آنکھیں نم کیے جا رہا تھا۔ رابعہ کی مہندی پہ اس کے سارے ددھیال والے جمع تھے ہاشم صاحب نے بڑی جرات سے کام لیتے ہوئے شہباز کو حمزہ کے پروپوزل کے بارے میں بتایا۔

''بھائی جان! میں چاہتا ہوں کہ رابعہ کی رخصتی پہ اسریٰ اور حمزہ کے رشتے کا اعلان کر دوں۔'' شہباز نے بڑی مشکل سے دل و دماغ سے امنڈتے غصے و خفگی کے سیلاب پہ بند باندھا تھا۔

''یار! اتنی جلدی کیوں ہے تمہیں۔ ویسے میں تم سے بہت ناراض ہوں، تم نے ہوا تک نہیں لگنے دی۔ بالا ہی بالا تمام انتظامات مکمل کر لیے ہیں اور کہہ رہے ہو رشتے کا اعلان کر دوں۔ اسریٰ میری بیٹی ہے، اتنی عجلت کیوں کر رہے ہو۔ خوب دھوم دھام سے منگنی ہوگی اسریٰ کی۔ ابھی چند ہفتے ٹھہر جاؤ۔''

ہاشم صاحب انہیں دیکھتے رہ گئے۔ شہباز نے انہیں بولنے کے قابل چھوڑا ہی نہیں تھا۔

دولہا والوں کی آؤ بھگت کا انتظام ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ اسریٰ الگ بوکھلائی ہوئی تھی۔ اتنے سارے لوگوں سے نمٹنے کا تجربہ اس کے لیے یکسر نیا تھا۔

رابعہ کو بیوٹیشن گھر پہ تیار کرنے آئی تھی۔ میک اپ کا مرحلہ تمام ہونے کے بعد اسریٰ، شہلا اور صدف کے ساتھ رابعہ کو ہوٹل لے کر آئی تو پتا چلا کہ رابعہ کے عروسی سوٹ سے میچ کرتا پاؤچ گھر پہ ہی رہ گیا ہے۔ وہ روٹھکی ہوگئی گزشتہ چھ سات دنوں میں اسے ایک پل بھی آرام کے لیے نہیں ملا تھا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ہوٹل کے اندرونی گیٹ سے باہر آئی۔ ہائی ہیل کی جوتی میں وہ بھاگنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ زیاد کے قدم اسے دیکھ کر وہیں رک سے گئے گہرے نیلے اور فیروزی مقیش لگے سوٹ میں ملبوس تک سک سے تیار وہ بڑی دل آویز لگ رہی تھی۔ اسریٰ کو کسی کی نگاہوں کی تپش کا احساس ہوا۔ سر جھٹک کر وہ پارکنگ لاٹ سے گاڑی نکالنے لگی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد واپسی ہوئی۔ پاؤچ رابعہ کے ہاتھ میں تھما کر اسے قدرے سکون کا احساس ہوا۔ حمزہ اپنی پوری فیملی سمیت آئے تھے۔ صدف اور شہلا بھی مہمانوں کی صف میں بیٹھی میزبانی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

رخصتی کے وقت رابعہ اور اسریٰ ایک دوسرے سے لپٹ کر خوب روئیں۔ ہاشم صاحب، شہباز اور دوسرے بھائیوں کی فیملی کے ساتھ گھر آ گئے۔ اسریٰ ابھی تک ایک طرف یاسیت و اداسی کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ ہاشم صاحب بڑے ابا کے ساتھ اندر چلے گئے۔

''بھائی جان! آج میں نے آپ کے مشورے کو اولیت دی ہے اور اسریٰ کی حمزہ کے ساتھ منگنی وقتی طور پر ملتوی کر دی ہے۔ اب اپ بتائیں کہ کب یہ نیک فریضہ سرانجام دیا جائے کیونکہ میں نکاح بھی ساتھ کر دینا چاہتا ہوں۔ رخصتی اسریٰ کی ہاؤس جاب کے بعد ہو جائے گی۔''

انہوں نے چائے کی پیالی شہباز کی طرف بڑھائی مگر انہوں نے نہیں لی اور سرد و جامد نگاہوں سے ہاشم صاحب کو دیکھے گئے۔

''اسریٰ کی منگنی نہیں ہوگی۔ نکاح ہوگا، نکاح۔ وہ بھی حمزہ کے ساتھ نہیں، یہ خواب دیکھنا چھوڑ دو۔ رابعہ کی بار تو میں خاموش ہو گیا تھا مگر اس بار نہیں۔ میں پچھلے حساب بھی برابر کر دوں گا۔ یہ نہ ہو کہ صبح کا سورج اس خبر کے ساتھ طلوع ہو کہ ہاشم گیلانی کا داماد خاور جواد شادی کی صبح پراسرار طور پہ اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا اور اس قتل میں خاور جواد کی بیوہ رابعہ گیلانی کا ہاتھ ہے جس نے اپنے آشنا کے ساتھ مل کر ایک شب کے دولہا کو زندگی کے محروم کر دیا۔''

شہباز گیلانی اس وقت ایک درندے کے روپ میں نظر آ رہے تھے۔

''بھائی جان! آپ ایسا نہیں کر سکتے، نہیں کر سکتے۔'' ہاشم کی زبان سے بمشکل تمام اٹک اٹک کر ایک جملہ ادا ہوا۔ سینے کو مسلتے وہ وہیں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ گھٹی گھٹی چیخیں غیر ارادی طور پہ ان کے حلق سے نکل رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ چیخیں معدوم ہو گئیں۔ ان کے لبوں پہ صرف تھرتھراہٹ تھی۔

شہباز نے وہیں سے اسریٰ کو آواز دی۔ اسریٰ بھاگتی ہوئی آئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے قدم جامد ہو گئے۔

پہلی نگاہ میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے جو معمولی نوعیت کا نہیں تھا۔

اگلی صبح ہاشم گیلانی کی روح دنیا کے تمام جھمیلوں سے آزاد ہو گئی۔ ایک کرب مسلسل جو کئی برس تک ان کا ساتھی رہا تھا، جسم سے جان کا رشتہ منقطع ہونے کے بعد ان کا پیچھا چھوڑا تھا۔

ہاشم گیلانی کے سرہانے بیٹھی دیوانگی کے عالم میں وہ ان کے بے جان نقوش کو دل میں اتار رہی تھی۔ وہ رات سے اسی جگہ اسی پوزیشن میں بیٹھی۔ رابعہ صدمے سے نیم جان سی ہو رہی تھی۔

اسریٰ جسے رابعہ ہمیشہ سے کم ہمت اور بزدل کہتی آئی تھی، حیرت انگیز طور پہ خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ حمزہ کا دل خود دکھ سے بوجھل سا تھا۔ جب جنازہ اٹھایا گیا تو رابعہ نڈھال ہو کر فرشی دری پہ گر گئی۔

اسریٰ نے بہن کا سر اٹھا کر اپنے زانو پہ رکھا۔ چند سیکنڈ کی کوشش سے وہ ہوش میں آ گئی۔ اسریٰ کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی وہ پھر بلک بلک کر رونے لگی۔

''آپی! اب آپ چپ ہو جائیں، ہمیں خود ہی نمٹنا ہے۔ گھنی چھاؤں ہمارے سروں سے ہٹ چکی ہے۔ ہم بے رحم دھوپ کے سپرد ہیں'' حیرت انگیز طور پہ اس کا لہجہ بہت سرد اور پرسکون سا تھا۔

حمزہ نے اسریٰ کی نگاہوں میں مچلتے سیل رواں کو دیکھا۔

شہباز گیلانی نے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مل کر ہاشم کے جسد خاکی کو قبر میں اتارا۔

''خاور نے ہاشم انکل کی ناگہانی وفات کی وجہ سے سیٹ کینسل کروا دی تھی۔ وہ کویت میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا تھا۔ اس کے ساتھ رابعہ کو بھی جانا تھا۔ جواد لطیف نے اسے سمجھا

دیا تھا کہ مہینے ڈیڑھ مہینے بعد وہ رابعہ کو اس کے پاس بھجوا دیں گے ابھی اس کا جانا مناسب نہیں ہے۔

اسریٰ نے کوشش کی کہ رابعہ بھی خاور کے ساتھ جائے مگر وہ کسی طور راضی نہیں ہو رہی تھی۔

''میں چلی گئی تو تم کیا کروں گی، تم اکیلی رہ گئی ہو اسریٰ! اکیلی۔ بالکل تنہا۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔'' وہ جذباتی کیفیت میں بولی۔ اسریٰ نے اپنے سارے آنسو دل میں اتار لیے اگر وہ اس موقع پر ذرا بھی کمزوری دکھاتی تو رابعہ کی ہمت بھی ٹوٹ جاتی۔

''رابعہ! میں اکیلی تو نہیں ہوں۔ بڑے ابا ہیں۔ چچا ہیں۔ میرا پورا خاندان ہے پھر حمزہ بھی تو ہیں۔'' رابعہ نے اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔

بڑے ابا اور دونوں چچا ابھی تک یہیں تھے سوئم کے بعد شہباز گیلانی نے ان دونوں بہنوں سے بات کی۔

''تم میرے ساتھ گاؤں چلو، وہاں تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ وہ سب تم سے ملنا چاہتے ہیں تمہارے دکھوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔'' شہباز نے رابعہ اور اسریٰ کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔

''بھلا یہاں اب کیا رکھا ہے۔ ہاشم تو ہم سے بچھڑ گیا ہے۔ وہ اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا کبھی بھی نہیں۔'' ان کے ساتھ رابعہ بھی پھر رونے لگی۔ مگر اسریٰ نے بے دردی سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

''بڑے ابا! اگر میں گاؤں چلی گئی تو میرے ہاؤس جاب کا کیا بنے گا ویسے بھی اب صرف تین ماہ رہ گئے ہیں۔ میں نے پہلے کافی چھٹیاں کر لی ہے۔'' اس کا لہجہ بے تاثر مگر پر اعتماد تھا۔

''تمہاری بات بھی ٹھیک ہے۔ چلو ایسے کرو۔ دو تین دن کے لیے گاؤں آ ؤ۔ پھر واپس چلی آنا۔ چالیسویں تک چھٹی کے دن آتی جاتی رہنا۔ یہاں میں تمہارے پاس زرین اور ایک ملازم کو چھوڑے جا رہا ہوں۔ ایک اضافی چوکیدار میں گاؤں سے بھجوا دوں گا تا کہ تمہیں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔'' ان کا بھاری ہاتھ ابھی تک اسریٰ کے سر پر دھرا تھا۔ اس نے ان کی کسی بات سے بھی اختلاف نہیں کیا تھا۔

رابعہ ان کے ساتھ گاؤں چلی گئی۔ شہباز نے اپنے وعدے کے مطابق ایک چوکیدار، ملازمہ اور زرین کے ساتھ ایک بے حد قابل اعتماد اور وفادار معتمد خاص سفیان کو بھیجا

تھا جو اسریٰ کی حفاظت اور گھر کی دیکھ بھال پہ مامور تھا۔ بقول شہباز کے کہ ایسا اسریٰ کی تنہائی کے خیال سے کیا گیا تھا۔

وہ سب کو اس گھر میں برداشت کرنے پہ مجبور تھی۔ زرین ہر وقت اس کے ساتھ ساتھ رہتی جونہی وہ ہاسپٹل سے آتی۔ زرین اسے گھیر کر بیٹھ جاتی۔ اپنی کچھ خامیوں کے باوجود اس کو وہ اچھی لگی تھی۔

زرین نے اسے حویلی، گاؤں اپنے رشتہ داروں اور اپنی والدہ کے بارے میں ڈھیروں باتیں بتائیں تھی۔ زرین کا خالص انداز اسریٰ کو اچھا لگا تھا بلکہ اس نے تو اسریٰ کو اپنے ایک بہت ہی خاص راز میں بھی شریک کر لیا تھا۔

''اسریٰ! وہ بہت اچھا ہے۔ قدرے ضدی اور خود سر سا۔ پتا ہے سفید حویلی والے جلد ہی ہمارے خاندان سے ایک نیا رشتہ جوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں شاید اس طرح دونوں خاندانوں کے مابین دشمنی کی فصیل گرائی جا سکے جو برس ہا برس سے بہت بلند ہو رہی ہے اگر ایسا ہو جائے تو شاید میری آرزو بھی پوری ہو جائے کیونکہ وہ دو بار اپنے بڑوں کے ساتھ ہمارے حویلی آ چکا ہے۔ ہمارے مرد بھی اس کی عیادت کو گئے تھے۔ چند ماہ پہلے اس کا بہت سیریس ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔''

''وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی لگ رہی تھی۔ اسریٰ بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی۔

''اگر وہ تمہیں نہ ملے تو پھر تم کیا کرو گی۔ مثال کے طور پہ اگر دونوں خاندانوں کی صلح نہ ہوئی تو پھر؟''

''ایسے نہ کہو کیونکہ ابا جان کو صلح کرنی ہی پڑے گی۔ اگر اس کے لیے مجھے اپنی جائیداد بھی چھوڑنی پڑی تو میں چھوڑ دوں گی۔ ویسے آج کل اسی بارے میں بحث چل رہی ہے چچا جان کا خیال ہے کہ اگر ہم نے اپنی بیٹی ملکوں کو دے دی تو اس میں توہین کا پہلو ہے۔ مجھے تو اس میں توہین کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا مجھے یہ خوامخواہ کی خود ساختہ پابندیاں پسند نہیں ہیں۔'' زرین کے انداز سے بغاوت ظاہر ہو رہی تھی۔

''تم میں حوصلہ ہے ان پابندیوں سے ٹکرانے کا؟'' اسریٰ نے یونہی پوچھا تو وہ جواب میں پھٹ پڑی اور ایک لمبی سی تقریر جھاڑ دی۔

حمزہ روز باقاعدگی سے اسریٰ کو فون کرتے تھے چاہے ہاسپٹل آئے یا نہ آئے مگر دو

روز سے نہ وہ ہاسپٹل آ رہے تھے اور نہ فون کر رہے تھے۔ ان کا موبائل بھی بند تھا۔ رات اس نے تین چار بار حمزہ کو فون کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ زرین خلاف توقع جلدی سو گئی تھی وہ تھکن کے باوجود کافی دیر تک جاگتی رہی۔

چالیسواں ہو چکا تھا۔ رابعہ دکھتے دل اور برستی آنکھوں کے ساتھ روانگی کی تیاری کر رہی تھی۔

''اسریٰ جونہی تمہارا ہاؤس جاب مکمل ہوا۔ میں خاور سے کہہ سن کر پاکستان کا چکر لگانے کی کوشش کروں گی۔ واپس آ کر میں حمزہ بھائی کے گھر والوں سے بات کروں گی۔ اب اس کام میں تاخیر مناسب نہیں۔ جانے کیوں میرا دل جانے کو نہیں چاہ رہا، یوں لگتا ہے جیسے کچھ ہو جائے گا مگر بڑے ابا نے مجھے بہت تسلی دی ہے۔ وہ تمہاری خبر گیری کرتے رہیں گے۔ اور بڑی امی کو ادھر ہی چھوڑ دیں گے تمہارے پاس۔ مگر اس کے باوجود کوئی بات مجھے کھٹک رہی ہے۔ اسریٰ! کوئی بھی پریشانی کی بات ہو تو فوراً مجھ سے رابطہ کر لینا۔ بس دو ڈھائی ماہ کی بات ہے۔ یوں چٹکی بجاتے گزر جائیں گے۔ اسے کمزور لہجے میں تسلی دے رہی تھی۔

''آپی! کچھ بھی نہیں ہوگا۔ آپ بالکل پریشان مت ہوں اور یہ رونی صورت بنا کر خاور بھائی کے پاس مت جائیے گا۔ خوامخواہ ڈر جائیں گے۔'' اسریٰ نے اس کے پیٹ میں گدگدی کی تو رابعہ آنسوؤں کے بیچ مسکرانے لگی۔

''اسریٰ! تم بہت بدل گئی ہو، اچانک ذمہ دار اور بڑی بڑی سے لگنے لگی ہو۔ مضبوط اور باہمت سی ورنہ میں تو یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہتی کہ تمہارا کیا بنے گا۔

''بھلا کیا بنتا؟ اب فضول سوچوں میں مت سر کھپایئے۔ جائیں اچھی طرح ڈریس اپ ہو کر میک اپ کریں۔ سات بجے فلائٹ ہے۔''

اسریٰ نے ماحول خوشگوار کرنے کی جو کوشش کی تھی۔ وہ کامیاب رہی۔ رابعہ کپڑے بدلنے چلی گئی۔ وہ تیار ہو کر کمرے سے باہر آئی تو اسریٰ نے محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''اب لگ رہی ہیں نا میری آپی۔ بجلیاں گرا رہی ہیں۔'' رابعہ جھینپ سے گئی۔ اتنے میں فیض نے حمزہ اور اس کے گھر والوں کے آنے کی اطلاع دی تو اسریٰ رابعہ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

''کیسی ہیں آنٹی آپ؟'' اسریٰ، حمزہ کی والدہ کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''بس ٹھیک ہوں، اللہ کا شکر ہے۔'' وہ خوشگوار لہجے میں بولیں۔ رابعہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور دھیمی آواز میں اسریٰ اور حمزہ کی شادی کے بارے میں بات کرنے لگی۔

''میں اسریٰ کے ہاؤس جاب کے بعد آؤں گی، تب تک آپ بھی تیاری مکمل رکھیں۔'' اس نے سامنے صوفے پر بیٹھے حمزہ کی طرف دیکھا۔ رابعہ کو محسوس ہوا جیسے وہ مضطرب سے ہو رہے ہیں۔ اسریٰ اٹھ کر باہر آ گئی۔

''رابعہ! دراصل میں اگلے ماہ میں انگلینڈ جا رہا ہوں وہاں سے واپسی پہ سوچوں گا۔'' ان کے لہجے میں لاتعلقی تھی۔

''آپ کب تک آئیں گے؟''

''پتا نہیں۔'' انہوں نے کمال بے نیازی سے کہا تھا۔ رابعہ کو ان کا یہ انداز بہت برا لگا۔ حمزہ کی والدہ اس دوران بالکل خاموش رہیں جیسے اس قصے میں ان کا کوئی کردار ہی نہیں ہے۔ وہ ادھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھیں۔

شہباز گیلانی، سلطانہ خاتون اور زرین کے ساتھ آ گئے تھے۔ جانے سے پہلے رابعہ نے ایک بار پھر بڑے ابا سے اسریٰ کا خیال رکھنے کی درخواست کی تھی۔

بڑے بے رنگ سے شب و روز تھے اگر ہاسپٹل کی مصروفیت نہ ہوتی تو اسریٰ شاید تنہائی سے گھبرا کر کچھ کر بیٹھتی۔ سلطانہ خاتون یعنی بڑی امی بھی اس کے پاس تھیں مگر کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا وہ ان کی کڑی نگرانی میں ہے۔

خدا خدا کر کے اس کا ہاؤس جاب مکمل ہوا حمزہ اس سے پہلے ہی انگلینڈ کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ جانے سے پہلے وہ رسماً اسریٰ سے ملے تھے۔ مگر ایک جملہ بھی انہوں نے تسلی کا نہیں کہا تھا۔

ایک شام وہ واپس آئی تو سلطانہ خاتون اپنا سامان رکھوا رہی تھیں۔

''بڑی امی! کہاں کی تیاری ہے؟

''واپس جا رہی ہوں۔ تم بھی تیاری کرو۔ دراب کی شادی ہے۔ جو جو ضروری چیزیں رکھنی ہیں رکھ لو کیونکہ ہفتہ دس دن تو تمہیں وہاں لگ ہی جائیں گے۔ تم بہن ہو دراب کی، خوب خوشیاں منانا سب کے ساتھ۔ ذرا حویلی میں جا کر دیکھنا تو سہی، کتنی رونق اور ہلا گلا ہوگا۔ سب

بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تم ہاشم کی بیٹی ہو ہمارا خون۔ شہباز کئی بار تمہارے لیے روئے ہیں۔ اس خالی ڈھنڈار گھر میں کب تک رہو گی۔ گاؤں آؤ۔ دیکھنا تمہیں کتنی اپنائیت اور محبت ملے گی۔'' وہ ساتھ ساتھ اسریٰ کے تاثرات کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے بڑی امی! لائف میں تھوڑی تبدیلی تو آنا ہی چاہیے میں خود بور ہو رہی تھی جب تک کہیں جاب ملتی ہے تب تک تھوڑا انجوائے منٹ ہی سہی۔'' اس کے اتنے جلدی مان جانے پہ سلطانہ خاتون مطمئن ہو گئیں۔

اسی روز شام کو وہ گاؤں کے لیے روانہ ہوئے راستے میں شہباز اسے گاؤں کے بارے میں بتاتے رہے۔

''یہ دس کلو میٹر لمبی سڑک ہم نے حویلی والوں کی آمدورفت کے لیے بنوائی ہے۔ اس پہ کسی اور کی گاڑی ہماری اجازت کے بغیر نہیں چل سکتی۔ یہ دائیں اور بائیں کھیت سینکڑوں ایکڑ پہ پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ بھی ہمارے اپنے ہیں اور یہ رہی ہماری حویلی اس کے گیٹ کے ساتھ بنی دیوار پہ دو مچان ہیں۔ یہاں چوبیس گھنٹے دو باوردی محافظ آتشیں اسلحے سمیت پہرا دیتے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں آئے بغیر کوئی حویلی سے باہر نہیں نکل سکتا اور جو کوئی ہماری اجازت کے بغیر یہ جرات کرے وہ پھر اپنی ٹانگوں پر چل کر گیٹ سے باہر نہیں جا سکتا۔''

بڑے ابا کا لہجہ سرسری سا مگر الفاظ بہت سرد اور سفاک تھے۔ ان کی آمد کی اطلاع یقیناً گیٹ سے اندر پہنچ گئی تھی۔ سب ایک جلوس کی شکل میں فرداً فرداً شہباز گیلانی کو سلام کر رہے تھے۔ اسریٰ سے وہ سب سرسری سا ملے بڑے ابا اور سلطانہ خاتون کو وی آئی پی ٹریٹ منٹ دیا جا رہا تھا۔ یہاں آتے ہی اس کے نازک سے دل پہ یہ پہلی چوٹ پڑی تھی۔ ہاں چھوٹے چچا سکندر گیلانی اور ان کی بیٹی پروین بڑی محبت اور اپنائیت سے اس سے ملے تو اس کی طبیعت پہ چھایا تکدر کسی حد تک کم ہو گیا۔

''سنا ہے تمہارے بھائی دراب کی شادی ہو رہی ہے۔ کس سے ہو رہی ہے؟ اور حویلی میں تو شادی کی کوئی گہما گہمی ہی نہیں ہے۔ بڑی امی تو کہہ رہی تھیں کہ......''

پارو ماتھے پر ہاتھ مار کر مسکرا دی۔

''دراب بھائی کی تو ابھی منگنی بھی نہیں ہوئی ہے شادی اتنی جلدی کیسے ہو گی۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے اسریٰ آپی۔'' وہ آنکھیں کھولے اسے دیکھتی رہ گئی۔ پارو اس سے پانچ چھ سال

چھوٹی تھی۔ طبعاً بہت سادہ اور سچ بولنے والی اسریٰ کا جی گھبرانے لگا۔

رات کھانے کے لیے اسے ملازمہ بلانے آئی تو وہ مرے مرے قدموں سے ڈائننگ ہال تک پہنچی۔

وہ پہلے بھی حویلی آ چکی تھی مگر اس وقت اس نے مکینوں کے رویئے کو جانچنے سے احتراز برتا تھا۔ دوسرے باپ کی موت کا زخم تازہ تھا کسی دوسری طرف اس کی نگاہ گئی ہی نہیں۔ مگر آج کافی باتیں واضح ہونے لگی تھیں۔ بڑے ابا سمیت باقی سب کا لیا دیا انداز لڑکیوں کی ہچکچاہٹ، پارو کی خوش خلاق، سلطانہ خاتون کی کڑی نگاہ۔ ان سب کے پس پردہ جانے کون سے عوامل کارفرما تھے۔

''کیا ہے، میں فوراً واپس جاؤں گی اس اجنبیت بھرے ماحول میں، میں مزید نہیں رہ سکتی۔ ابھی بڑے ابا سے کہتی ہوں مجھے واپس بھجوا دیں۔'' اس نے اپنی سوچ پہ فوراً عمل درآمد بھی کر ڈالا۔ بڑے ابا نشست گاہ میں سلطانہ خاتون کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اسریٰ کی بات پہ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''اب تم واپس نہیں جاؤ گی کم از کم اس وقت تک جب تک میرے مطالبات نہیں مان لیتیں تم، اس حویلی سے باہر کی زندگی تمہارے لیے خواب ہے، صرف خواب۔ میں نے اب تک تم سے بہت نرمی کا سلوک کیا ہے صرف مجبوری کی وجہ سے۔ یہ اب تم پہ منحصر ہے کہ تم اپنے ساتھ کسی قسم کا سلوک پسند کرتی ہو۔ آج سے خود کو اپنے کمرے تک محدود سمجھنا۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ میری کوشش تو یہی تھی کہ اس کی نوبت نہ آئے مگر تم تو بہت جلد گھبرا گئی ہو۔''

آج ان کے چہرے سے خوش اخلاقی کا مصنوعی نقاب مکمل طور پر اتر چکا تھا۔

اسریٰ کو چھٹی حس جس خطرے کی آمد کا اعلان کر رہی تھی وہ سامنے آ گیا تھا۔

''سلطانہ! جاؤ اسے کمرے میں پہنچا آؤ۔''

''بڑے ابا یہ سب کیا ہے آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں عاقل و بالغ لڑکی ہوں جب تک آپ اس رویئے کا سبب نہیں بتائیں گے میں آپ کی کوئی بات بھی نہیں مانوں گی۔''

''کیا کہا۔ نہیں مانو گی؟ شہباز گیلانی کی کبھی کسی نے حکم عدولی نہیں کی ہے، میری لغت میں ناں کا لفظ نہیں ہے۔ اب کی بار میں شکست قبول نہیں کروں گا۔''

شہباز گیلانی اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے اسے پرغضب انداز میں گھور رہے تھے۔

پہلی بار سچ مچ پہلی بار اسریٰ کو بڑے ابا سے انتہائی خوف محسوس ہوا، وہ اس کی طرف انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

''جاؤ اپنے کمرے میں، ٹھنڈے دل سے ہر چیز کے بارے میں غور کرو۔''

''بڑے ابا کس چیز کے بارے میں غور کروں۔'' اس نے کچھ سوچ کر نرمی سے پوچھا۔

''ہاں۔ اب کچھ معقول بات کی ہے تم نے، اصل میں، میں نے ملک انور کے بیٹے کا رشتہ تمہارے لیے منظور کر لیا ہے۔'' انہوں نے بالکل عام سے انداز میں بات کی۔ حیرانی در حیرانی، تہہ در تہہ انکشافات، وہ ششدر رہ گئی۔

''بڑے ابا! ابو نے اپنی زندگی میں ہی میرا رشتہ ڈاکٹر حمزہ سے طے کر دیا تھا۔ آپ کو تو سب کچھ پتہ ہے۔'' وہ بمشکل بولی تھی۔

''وہ رشتہ ہاشم نے طے کیا تھا اور یہ میں کر رہا ہوں سمجھیں۔ تم آئندہ میرے سامنے اس کا ذکر مت کرنا اگر حمزہ سے تمہارا رشتہ طے تھا تو وہ انگلینڈ جا کر کیوں بیٹھ گیا ہے۔ ہونہہ بزدل۔ گیدڑ کی اولاد۔ وہ آئندہ اپنی شکل بھی تمہیں نہیں دکھائے گا۔ اس کا خیال دل سے نکال دو۔''

اسریٰ نے خود کو بے حد بے بس اور بے یار و مددگار محسوس کیا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اس طویل و عریض کمرے کی ہر شاہانہ چیز جیسے اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ شہباز گیلانی نے اس کا موبائل فون بھی اس سے لے لیا تھا۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ کاش وہ کسی طرح جواد انکل اور رابعہ آپی سے رابطہ کر سکتی۔ اس کی یہ خواہش حیرت انگیز طور پہ پوری ہو گئی۔ رات وہ بستر پہ لیٹی اس الجھی ہوئی صورت حال پہ غور کر رہی تھی تو شہباز گیلانی دبے قدموں سے اس کے کمرے میں آئے وہ انہیں دیکھ کر زرد پڑ گئی اور دوپٹہ درست کرتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ان کے ہاتھ میں اسریٰ کا موبائل فون تھا۔

''یہ لو فون، جواد لطیف کا نمبر ملا کر کہو کہ تم گاؤں میں ہو اور فی الحال تم نے فیصلہ کیا ہے کہ ادھر ہی رہو گی۔ یہی بات تم رابعہ سے بھی کہو۔ امید ہے میری بات پہ عمل کرو گی اگر نہ کیا تو اپنا ہی نقصان ہے تمہارا۔ یہ مت سمجھنا کہ کوئی تمہاری مدد کو آئے گا۔ میں اس کا حشر خراب کر دوں گا۔'' انہوں نے وارننگ دے کر فون اسے تھمایا۔

پھر انہوں نے جیسا کہا ویسا ہی کیا۔ ''خاصی سمجھ داری کا ثبوت دیا ہے تم نے۔'' نہ جانے انہوں نے اسے سراہا تھا یا طنز کیا تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

''میرے خدا! میں کیا کروں۔'' اس نے سر کے بال بے دردی سے مٹھی میں جکڑے۔ چند گھنٹے میں اس کے ساتھ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ ایک خود مختار پر اعتماد لڑکی کے بجائے وہ قیدی بن گئی تھی اور قیدی بھی بڑے ابا جیسے دو چہرے رکھنے والے دشمن کی۔

اسے سارے ددھیال کی بے حسی پہ حیرت ہو رہی تھی۔ بڑے ابا کے سوا کسی نے اس کے کمرے میں آ کر جھانکا تک نہ تھا۔ گویا وہ ایک جیتی جاگتی لڑکی نہ ہو، بے جان چیز ہو۔ ان کے سامنے ہی تو یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ گویا سب کی مرضی سے یہ کام ہوا تھا۔ اس کے کمرے کے باہر سفیان کرسی ڈالے بندوق تھام کر یوں بیٹھا تھا جیسے اندر کوئی خطرناک مجرم بند ہو۔ شہباز نے سلطانہ خاتون کے سوا ہر کسی کا داخلہ حویلی کے اس حصے میں ممنوع قرار دیا تھا۔ بس وہ تھی اور اس کی پریشان سوچیں۔

باہر سناٹا گہرا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

اسریٰ رونا نہیں چاہتی تھی۔ لاکھ ضبط کے باوجود اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک آئے۔ اس وقت اسے ہاشم صاحب بری طرح یاد آنے لگے۔ ٹھنڈی گھنی میٹھی چھاؤں جیسے ہاشم گیلانی جو اس کی ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

کافی دیر وہ دلگرفتہ سی نڈھال بیٹھی رہی بالآخر نیند کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی۔

صبح نوجوان ملازمہ ناشتہ لے کر آئی۔ اسریٰ نے ٹرے ایک طرف سرکا دی۔ شمی ابھی تک اس کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے چوکنا نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ کان دروازے کی طرف لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی اور پھر اسریٰ کے پاس آ گئی اور انتہائی مدھم آواز میں بولی۔

''اسریٰ بی بی! زرین بی بی کہہ رہی ہیں کہ آپ نے ابا کی بات نہیں مانی ہے اگر آپ نے ان کی نکاح والی تجویز مان لی تو ساری زندگی ذلت کی چکی میں پستے ہوئے گزاریں گی۔''

جس طرح آئی تھی، اتنی ہی تیزی سے چلی گئی۔

اسریٰ نے سامنے پڑا ناشتہ دیکھا۔ اسے بالکل بھی بھوک نہیں تھی۔ مگر دل کو تھوڑی ڈھارس ہو گئی تھی کہ کوئی تو اس کا ہمدرد ہے۔ دوپہر کو شمی اس کے لیے کھانا لائی تو اس نے آہستہ اور محتاط آواز میں اس سے کہا۔

''تم زرین بی بی سے کہو۔ میں خود ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

شمی نے نفی میں سر ہلایا اور نظریں جھکائے جھکائے بولی۔

''جب تک آپ کا نکاح نہیں ہو جاتا یہ پابندی برقرار رہے گی۔'' وہ شکوہ کناں نگاہوں سے شمی کو دیکھ کر رہ گئی۔

اس قید سے نکلنے کے لیے کیا وہ بڑے ابا کے ساتھ سودے بازی کر لے یا پھر زرین کی بات مان کر انکار کر کے ہمیشہ کے لیے یہ اندھیرے اور قید خرید لے۔

میرے پاس تو کوئی ہتھیار بھی نہیں ہے پھر میں کس برتے پہ لڑوں۔ زرین بھی تو میری طرح کمزور سی لڑکی ہے۔ بھلا وہ میری کیا مدد کر سکتی ہے۔'' بڑے ابا صرف اور صرف اس شادی پہ مجبور کرنے کے لیے تو یقیناً اسے یہاں نہیں لائے ہوں گے۔ اس کے پیچھے یقیناً کوئی مقصد ہوگا پھر حمزہ کا آخری ملاقات میں سرد اور رکھی سا رویہ، بڑے ابا کا حقارت سے اس کا ذکر کرنا۔ یقیناً حمزہ کے اس رکھی رویے کے پس پردہ بڑے ابا کا ہاتھ ہوگا۔ حمزہ کی یاد آتے ہی اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ ڈاکٹر حمزہ بارش خوشبو اور چاند کی باتیں کرنے والے۔ اس کی بے ساختہ مسکراہٹ پہ اسے یک ٹک دیکھنے لگنے، جنہوں نے اسریٰ کی سالگرہ پہ اسے اس کے پسندیدہ شاعر کی کتابوں کا سیٹ گفٹ دیا تھا۔ جانے کیوں وہ انگلینڈ چلے گئے تھے۔

بھلا کیا تھا اسریٰ کے پاس، چند یادوں، کچھ مسکراہٹوں اور ایک ادھورے لمس کے سوا۔ وہ حمزہ کے تصورات کے ساتھ بہت دور تک تو نہیں گئی تھی مگر وہ اس کی زندگی میں آئے تو تھے مختصر عرصے کے لیے ہی سہی وہ حقیقت تھے مگر اب خواب بنتے جا رہے تھے، موہوم اور دھندلا سا خواب جو آنکھ کھلنے پہ یاد ہی نہیں رہتا۔

کتنے کمزور نکلے تھے وہ بڑے بڑے دعوے کرنے والے وہ کس کس کا افسوس کرتی فی الحال تو موجودہ حالات ہی اس کے لیے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔

دوپہر کا کھانا بھی یونہی رکھا رہا۔ رات میں اس نے صرف دو نوالے کھائے۔ نقاہت کے سبب اس کا ذہن کام ہی نہیں کر رہا تھا۔

اگلی صبح شمی ناشتہ لے کر آئی تو اسریٰ کو ترحم آمیز نظروں سے دیکھنے لگی۔

''آپ کب تک نہیں کھائیں گی، کھائیں خوب ڈٹ کر کھائیں۔ زرین بی بی نے کہا ہے آپ مایوس مت ہوں وہ جلدی ہی کوئی راستہ نکال لیں گی۔'' وہ انتہائی آہستہ آواز میں بولی رہی تھی۔

''سچ!'' اسریٰ جیسے مرتے مرتے جی اٹھی۔ شمی نے تسلی دینے والے انداز میں اس

کا ہاتھ دبایا۔

اس نے بڑی رغبت سے ناشتہ کیا پیٹ میں غذا اتری تو ذہن بھی کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ تین روز سے اس کے جسم پہ وہی پرانا لباس تھا۔ الجھے بال جو بے ترتیبی سے اس کے گرد بکھرے ہوئے تھے۔ بے رونق چہرا، زرد رنگت، آنکھوں کے گرد حلقے۔ صرف تین دن کے اندر اسکی یہ حالت ہوگئی تھی۔ بے رونق سی ہنسی اس کے لبوں پہ آکے دم توڑ گئی۔ باتھ روم میں جا کر اس نے از سر نو اپنا منہ ہاتھ دھویا۔ کنگھی کی اور ساتھ لائے کپڑوں میں سے ایک سوٹ نکال کر پہنا۔ اس کے بعد کارپٹ پر ہی بیٹھ کر دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی۔ ''اے اللہ میرے لیے جو بہتر ہو وہی کرنا۔''

ایک نئی توانائی جیسے اس کے جسم و جاں میں اچانک لہو کے ساتھ شامل ہو کر دوڑنے لگی تھی۔ شمی چائے لے کر آئی تو اس نے بڑے ابا سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

پانچ منٹ بعد وہ اس کے سامنے تھے۔

''بڑے ابا! مجھے آپ کے مطالبے منظور ہیں بس یہ خیال رہے کہ رابعہ آپی خوش رہیں۔'' اس کا لہجہ بہت باوقار تھا۔

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ مجھے پتہ تھا تم نادانی سے کام نہیں لوگی۔'' اچانک ان کا لہجہ بدل گیا پہلے کی طرح وہی محبت لٹاتا لہجہ اور الفاظ۔ مگر اسریٰ ہر جذبے سے عاری ہو کر آئندہ ہونے والے سودوزیاں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

سفیان بدستور اس کے کمرے کے دروازے پہ متعین تھا۔

اگلا دن بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ حویلی میں رونق اور چہل پہل نظر آنے لگی تھی۔ سفید حویلی سے ملک انوار ملک واجد اور ملک امجد کے ساتھ ان کی بیویاں ملک واجد کی دونوں بیٹیاں اور اماں جی بڑے فخر اور خوشی سے شہباز گیلانی کے پاس آئے دولہا فخر اور دوسرے دو کزنز کے ساتھ بعد میں آیا۔

اسی کا انتظار تھا نکاح خواں اور مسجد کے پیش امام صاحب کے ساتھ دوسرے سب مہمان دولہا کی راہ تک رہے تھے۔

''مبارک ہو!'' فخر نے سب سے پہلے گلے ملتے ہوئے اسے نکاح کی مبارک باد دی اور بڑا سا لڈو پورا کھلا کر ہی چھوڑا۔

اندر اسرٰی کی پاس دانیہ اور تانیہ تھیں جو ایک ایک زاویئے سے اسرٰی کا شکست خوردہ سراپا کیمرے میں تصویروں کی صورت مقید کر رہی تھیں۔

ان کے خاندان میں لڑکی کی رخصتی سے پہلے اسے دلہن بنانے کا رواج نہیں تھا سو اس کا نکاح بھی بغیر کسی تیاری اور میک اپ کے ہی ہوا۔ سادہ سے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس سر سے پاؤں تک چادر اوڑھے اسرٰی میکانکی انداز میں تصویریں بنوا رہی تھی۔

''یار تم نے تو یہ میدان مار ہی لیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔'' نکاح کے بعد مہمانوں کی خاطر مدارات کا سلسلہ جاری تھا۔ جب فخر رشک بھرے انداز میں بولا۔ زیاد مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں فتح مندی کا عنصر نمایاں تھا۔

''میں کبھی نہیں ہارا، اب تو تمہیں بھی یقین آ جانا چاہئے۔ ویسے راز کی بات بتاؤں، میرے دل کو بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ وہ میری ہم سفر بن گئی ہے۔ اس کے جملہ حقوق میرے نام محفوظ ہو گئے ہیں۔ میرے لیے یہ خواب ہی بڑا دلکش ہے۔'' اس کی آنکھوں سے سرمستی کی کیفیت عیاں تھی۔

''اوہ یار! میرے ساتھ ہی کہیں رومینٹک ڈائیلاگ بولنا نہ شروع کر دینا۔'' فخر نے اسے چھیڑا تو وہ اسے گھورنے لگا۔

''ویسے تمہارے لیے ایک ڈاکٹر کی یوں بھی اشد ضرورت تھی۔ آئے دن ٹوٹتے پھوٹتے جو رہتے ہو۔ تھوڑا فائدہ ہو جائے گا۔''

زیاد اسے مکا رسید کرتے کرتے رہ گیا۔

اسرٰی کی تمام تصویریں اس کے سامنے بکھری ہوئی تھی۔ وہ ایک ایک تصویر کو کئی بار دیکھ چکی تھا مگر طبیعت سیر ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

تصویر تیری دل میرا بہلا نہ سکے گی
ڈاکٹر صاحب تم جلدی سے خود ہی چلی آؤ

وہ اتنا مگن تھا کہ فخر کے آنے کی اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ ایک مشہور پرانے گانے کی اس نے بیدردی سے ٹانگ توڑی تو زیاد ہڑبڑا گیا۔

''تم کیوں بے وقت نازل ہو گئے ہو۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

''کافی دیر سے جناب کا استغراق ملاحظہ کر رہا ہوں۔ یار! ابھی سے تمہارا یہ حال

ہے۔ آئندہ جانے کیا ہوگا۔''

''فخر! تم نے کسی سے محبت کی ہو تو تمہیں پتہ ہوتا! اس محاذ کو سر کرنے میں سمجھ لو کہ میں نے بہت پاپڑ بیلے ہیں۔ میں پہلی نگاہ کی محبت پہ ذرا بھی یقین نہیں رکھتا تھا مگر اسرٰی کو دیکھنے کے بعد مجھے یقین کرنا پڑا کہ محبت یوں بھی ہو جاتی ہے۔ اب میرے خواب کی حسین تعبیر مجھے ملنے والی ہے تو دل چاہتا ہے سب کو اس خوشی میں شریک کر لوں۔'' وہ جذباتی ہو گیا تو فخر نے اس کی خوشیوں کے دائمی رہنے کی دعا کی۔

علینہ بھابھی فخر کو آواز دے رہی تھیں وہ تصویریں وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔

زیاد نے تمام تصویریں سمیٹ کر دراز میں ڈال دیں اور آنکھوں پہ بازو رکھ کر دراز ہو گیا۔ کمرے میں رکھا ٹیپ دھیمی آواز میں چل رہا تھا۔

چوری چوری آئے کوئی
دل میں سمائے کوئی
کبھی روٹھ جائے کبھی مان جائے
سمٹے ہوئے آنچل کو کیسے اٹھائے کوئی

''زیاد نے ہاتھ بڑھا کر والیوم بلند کر دیا۔''

دیکھوں میں تو شرمائے
نظریں چرائے کوئی

نہ جانے اسے دیکھ کر وہ کس ردعمل کا اظہار کرے گی۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی ہو گی کہ ہاسپٹل میں روم نمبر بائیس کا مریض جس کا وہ نام بھی نہیں جانتی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا زندگی بھر کا ناتا جڑا ہے۔

آج وہ مایوں بیٹھی تھی۔

پرسوں رخصتی تھی۔

زرین نے ساری لڑکیوں کو اس کے کمرے سے نکال دیا۔

''اب آرام کرنے دو اسرٰی کو۔ خوانخواہ کھپ ڈالی ہوئی۔'' اس کا لہجہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کافی دیر وہ روتی رہی ہو۔ سرخ آنکھیں بھی اس کی غماز تھیں۔

اسرٰی نے گھٹنوں پر رکھا سر اٹھا کر زرین اور پھر خالی کمرے کی طرف دیکھا۔ وہ آ کر

بیڈ پہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور اسریٰ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا جو بے جان سا محسوس ہو رہا تھا، خود زرین کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔

''اسریٰ! میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ابو کی کسی بات پہ بھی سر نہ جھکانا۔''

''تو میں کیا کرتی۔ ان دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاتی۔ میں نے اپنی بہتری کے لیے یہ فیصلہ کیا ہے شاید اسی میں اوپر والے کی کوئی مصلحت ہو۔''

''تم بہتری کی طرف نہیں تباہی کی طرف قدم بڑھا رہی ہو۔ تم جسے مصلحت کا نام دے رہی ہو وہی تمہاری بربادی کا نقطہ آغاز ہوگا۔ اسریٰ! کاش تم میری بات مان لیتیں تو میں کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتی۔ تمہیں کچھ بھی تو نہیں پتہ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ اسریٰ! ابو جان نے تمہیں ذلت کی عمیق گہرائیوں میں شادی کے نام پہ پھینک دیا ہے..... ''ابو جان نے تمہیں بطور تاوان سفید حویلی والوں کی قید میں دے دیا ہے وہ بھی نکاح کے نام پہ اور اس نکاح میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ جعلی نکاح ہے یہ، ابو جان نے تمہاری شکل میں اپنی ایک دیرینہ برسوں پرانی دبی آرزو کی ناکامی کا انتقام لیا ہے۔''

اسریٰ سسکیاں بھرتی اس سے لپٹ گئی۔

''اسریٰ! تم یہاں سے نکل کر اب عملاً سفید حویلی والوں کی دائمی قید میں رہو گی۔ اب بھی وقت ہے بھاگ جاؤ یہاں سے۔'' زرین اس سے الگ ہو کر سرگوشیانہ انداز میں بولی۔

اسریٰ کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور پورا جسم خوف کی زیادتی سے تنا ہوا تھا۔

''زرین! یہ سب کیا ہے۔ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ یوں لگ رہا ہے میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ تم ہی بتاؤ۔ میں کیا کروں؟''

''اسریٰ! وقت بہت کم ہے مگر پھر بھی میں اپنی سی کوشش کروں گی میں تمہیں بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گی، چاہے اس کے لیے مجھے خود نقصان اٹھانا پڑے۔''

''تم کیا کر سکتی ہو میرے لیے۔''

''وقت آنے پر جان بھی دے سکتی ہوں۔''

''تم اپنے ابو جان کے بجائے میرا ساتھ کیوں دے رہی ہو؟''

''اس لیے کہ تمہارے ساتھ ظلم ہوا ہے اور میرے ساتھ بھی۔ دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ ماروں یا مر جاؤں کیونکہ میں بھی شہباز گیلانی کی بیٹی ہوں۔'' زرین کے اعصاب بے حد

منتشر ہو رہے تھے۔

''اسریٰ! تمہیں تھوڑی سی بہادری دکھانا ہوگی۔ تھوڑی سی ہمت پھر تم اس زنداں سے باہر ہوگی۔ پلیز اسریٰ! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ وقت تیزی سے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔''

''میں کیا کروں زرین! تم ہی بتاؤ میری تو عقل ہی کام نہیں کر رہی ہے۔''

''میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ سب کچھ سمجھا دوں گی مگر پہلے ایک بات کا جواب دو۔ کیا تم آزادی کی فضا میں سانس لینا چاہتی ہو اگر تمہارا جواب ہاں میں ہے تو پھر ایک شاندار آئیڈیل زندگی تمہاری منتظر ہے۔ ہر قسم کے خدشوں سے پاک۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو۔''

''جتنی جلدی ہو سکتا ہے یہاں سے نکل جاؤ۔''

اسریٰ ساکت وصامت اسے دیکھتی رہ گئی۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''سب کچھ ممکن ہے اگر تھوڑی سے عقل ہو تو۔''

''مگر میرا نکاح ہو چکا ہے۔''

''تم اس جعلی ڈرامے کو نکاح کہہ رہی ہو؟ یہ بات تو تم بھی جانتی ہو کہ دونوں فریقین کی مرضی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ اسریٰ! تم نے مجبوری میں نکاح کو قبول کیا ہے۔ دل سے راضی نہیں ہو تم، ابو جان سے خوفزدہ ہو کر تم نے ان کی بات مانی ہے تم اسے عدالت میں چیلنج کر سکتی ہو یقیناً فیصلہ تمہارے حق میں ہوگا۔''

زرین اس کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہی تھی جس پہ امید وبیم اور تذبذب کے اثرات محسوس کئے جا سکتے تھے۔

''زرین! تم تو خوابوں کو حقیقت بنانے کی بات کر رہی ہو۔''

ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے گلابی لبوں پر ٹھہر گئی۔

''میں اتنی دیر سے تمہیں یہی تو سمجھا رہی ہوں کہ خواب حقیقت بن سکتے ہیں۔ تم اعلیٰ تعلیم یافتہ شہری لڑکی ہو۔ میں نے تو سنا ہے کہ شہری لڑکیاں بہت بولڈ اور حوصلہ مند ہوتی ہیں۔''

زرین چبھتے ہوئے لہجے میں بولی تو اسریٰ اسے دکھ سے دیکھ کر رہ گئی۔

زرین اس کے قریب آ گئی۔

''میں اپنی جان پہ کھیل کر تمہیں حویلی سے باہر پہنچا سکتی ہوں۔''

''کیسے؟''

''یہ مجھ پہ چھوڑ دو۔''

''مگر زرین! کیا یہ سب کچھ ٹھیک ہوگا''۔

''محبت اور جنگ میں سب کچھ ٹھیک ہوتا ہے۔'' اسریٰ اتنی پریشان تھی کہ زرین کا جملہ اس کی سماعتوں سے دور ہی رہا۔

''بڑے ابا کو اگر پتا چل گیا تو؟ وہ پہلے ہی اتنے عجیب طریقے سے ری ایکٹ کر رہے ہیں۔'' اس کے اندر کا خوف لبوں پہ آ گیا۔

''انہیں پتہ نہیں چلے گا۔''

''اور گیٹ پہ جو دو عدد گارڈز ہیں؟''

''میں نے کہا نا۔ تم فکر مت کرو، بس یہ تصور کر کے انجوائے کرو کہ تم ان بے مہر، سنگ دل لوگوں کے گھیرے سے باہر ہوگی۔ ٹھیک اسی وقت کل۔''

''مگر زرین! کیا یہ ٹھیک ہے؟ اسریٰ بے حد تذبذب کا شکار تھی۔

''تمہارے ساتھ کسی نے ٹھیک کیا ہے؟ ابو جان تمہیں دھوکے سے یہاں لائے اور تم پہ باہر کی دنیا کے دروازے بند کر دیے ہیں۔ سنو حقیقت کیا ہے؟ سفید حویلی والوں سے ہماری برسوں سے دشمنی ہے ایک سال پہلے بابر بھائی کی لڑائی سفید حویلی والوں کے منہ چڑھے ملازم سے ہوئی۔ بابر بھائی نے اسے اس بری طرح سے مارا کہ اس کے دماغ کو ناقابل تلافی پہنچا۔ حویلی والوں نے اس کے علاج پہ پانی کی طرح روپیہ خرچ کیا مگر ڈاکٹرز کی ہر کوشش ناکام ہوئی۔ تین ماہ کے علاج کے بعد ڈاکٹرز نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے اکبر کو گھر لے جانے کی اجازت دے دی۔ اب وہ عضو معطل کی طرح گھر میں پڑا ہوا ہے۔ نہ کسی کو پہچانتا ہے، نہ بول سکتا ہے۔ اس کی بیوی کی حالت دیکھی نہیں جاتی ہے۔ سفید حویلی والوں نے ابو جان سے اس کا تاوان طلب کیا یا تو وہ بابر بھائی کو ان کے حوالے کر دیں یا پھر اپنی کوئی عورت دے کر جان بچائیں۔ ابو نے کہا وہ ایک نہیں دو لڑکیاں دیں گے۔ جانتی ہو وہ دو لڑکیاں کون تھیں؟''

''نہیں۔'' اسریٰ دم بخود ایک ایک لفظ میں کھوئی ہوئی تھی۔

''وہ دو لڑکیا تم اور تمہاری بہن رابعہ تھیں۔ رابعہ پہ تو بس نہیں چلا مگر ابو جان نے تمہیں اپنا ٹارگٹ بنا لیا۔ اسریٰ! اس تعلیم یافتہ دور میں تمہاری قسمت کا فیصلہ بھیڑ بکریوں کی طرح کیا گیا۔ مردوں کی اس جنگ میں ہم عورتوں کو لوٹ کا مال کیوں سمجھا جاتا ہے۔ اسریٰ! تمہاری شخصیت کو، ساری زندگی کو مسخ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تمہیں پتہ ہے رابعہ کی شادی کے روز جب ہاشم چچا کو ہارٹ اٹیک ہوا تو اس کا سبب کون تھا؟ میرے والد محترم۔ اسریٰ! وہ چچا کو موت کے دہانے پہ پھینک آئے۔ ان کا سنگ دلانہ رویہ ہاشم چچا کے لیے جان لیوا ثابت ہوا اور تم پھر بھی خاموش ہو۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو جانے کیا کچھ کر ڈالتی۔ ستم ظریفی تو دیکھو، تمہیں، ایک نرم و نازک لڑکی کو سفید حویلی والے وحشیوں کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ ہم سے اچھے تو وہی ہیں جنہیں اپنے معمولی سے ملازم کا اتنا خیال ہے۔ تم تو اس کی کمین سے بھی گئی گزری ہو بظاہر تو تم ملک انوار کے بیٹے کی بیوی بن کر جا رہی ہو مگر عملاً تمہیں اکبر کی چاکری، خدمت گزاری اور تیمارداری کرنی پڑے گی کیا خبر جلد یا بدیر وہ جب تندرست ہو جائے تو اس کی بیوی کا کردار بھی ادا کرنا پڑے۔''

''پلیز زرین! مزید ایک لفظ مت کہنا۔ میں جان تو دے سکتی ہوں مگر مگر......'' اس سے آگے اس سے بولا ہی نہیں گیا۔ حلق میں غم و غصے کی زیادتی نے جیسے پھندا لگا دیا تھا۔

''تم جان مت دو، یہاں سے نکلنے کی فکر کرو پھر تم سب کچھ کر سکو گی۔'' زرین نے اس کا ہاتھ تھپکا۔

''کل رات تک سب انتظامات مکمل ہو جائیں گے۔ میں نے بڑی مشکل سے تمہارے گھر سے تمہاری تعلیمی اسناد اور دیگر چیزیں منگوائی ہیں ان کی تمہیں ضرورت پڑے گی۔ میں جا رہی ہوں۔ اب تم سو جاؤ۔'' زرین اس کے ماتھے پہ پیار کر کے چلی گئی۔

حرف تازہ نئی خوشبو کا لکھا چاہتا ہے
باب ایک اور محبت کا کھلا چاہتا ہے
ایک لمحے کی توجہ نہیں حاصل اس کی
اور یہ دل کہ اسے حد سے سوا چاہتا ہے
اک حجاب تہہ اقرار ہے مانع ورنہ
گل کو معلوم ہے کیا دست صبا چاہتا ہے

ریت ہی ریت ہے اس دل میں مسافر میرے
اور صحرا تیرا نقش کف پا چاہتا ہے

فارم ہاؤس بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے بھیگتی رات نگینہ عرف نگی کی سریلی پر سوز آواز کے سات بڑی رسیلی اور البیلی سی لگ رہی تھی۔ زیاد اور اس کے دوست، رشتہ دار مہمان حضرات اور دوسرے تمام مردوں کے لیے یہاں فارم ہاؤس میں اپنے انداز میں خوشی منانے کے لیے ملک انوار نے بڑے زبردست انتظامات کئے تھے۔ وسیع قطعہ زمین پہ فرشی دریاں بچھا کر ان پہ گاؤں تکیے رکھے گئے تھے۔ سامنے قدرے بلند جگہ پہ اسٹیج بنا ہوا تھا جہاں اس وقت نگی سازندوں کے ساتھ اپنی آواز کا جادو جگا رہی تھی۔ اس کے ساتھ آئی نیلم اور پکھراج تھک ہار کر بیٹھ گئی تھیں۔

زیاد فخر اور ارمان کے ساتھ پہلی قطار میں بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ من چلے بے قابو ہو کر نیلم اور پکھراج کے ساتھ زبانی چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔

''تم کیا زاہد خشک بن کر بیٹھے ہوئے ہو۔ شادی سے پہلے ایسے تجربات ضرور کرنے چاہئیں بیوی رعب میں رہتی ہے۔'' زیاد کے چچازاد کاشف نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا جو اس نے نرمی سے چھڑا لیا۔

''پلیز یار! مجھے معاف ہی رکھو۔''

زیاد بدمزا سا ہو کر وہاں سے اٹھ آیا۔ اس کے پیچھے کچھ شریر قہقہے گونجے تھے۔

سگریٹ سلگا کر وہ لمبے لمبے کش لیتا اسریٰ کے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسریٰ جو اس کی زندگی میں باضابطہ طور پر شامل ہو گئی تھی۔

زیاد نے جب اسے پہلی بار ہاسپٹل میں دیکھا تھا تو اسے بالکل علم نہیں تھا کہ وہ شہباز گیلانی کے بھائی کی بیٹی ہے۔ یہ نہیں کہ اس کے خاندان میں لڑکیاں نہیں تھیں یا پھر اسریٰ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی۔

زیاد کو اس کا انداز مسیحائی اور پراعتماد رویہ بہت اچھا لگا تھا۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ وہ اس کی زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شامل ہو جائے۔ وہ جاگتی آنکھوں سے چلتے پھرتے اس کے خواب دیکھتا۔ بن کہے بن مانگے اس کی آرزو کی تکمیل ہو گئی تھی۔

شہباز گیلانی کے اکلوتے بیٹے بابر نے اس کے چہیتے ملازم اکرم کو شدید زخمی کر دیا تھا

پھر جرگہ بیٹھا جس میں فیصلہ ہوا یا تو بابر کو ان کے حوالے کیا جائے یا پھر شہباز کی بیٹی کو سفید حویلی والوں کو بہو بنایا جائے۔ شہباز کے لیے دونوں فیصلے ناقابل قبول تھے مگر جرگے کے فیصلے سے انکار بھی ممکن نہیں تھا۔

اسی دوران دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر زیاد نے اسریٰ کے بارے میں تمام معلومات حاصل کروائیں تو ایک خوشگوار حیرت سے دوچار ہوا۔

اس کا سارا خاندان دل سے اس دشمنی کا خاتمہ چاہتا تھا جو سالہا سال سے چلی آ رہی تھی اس لیے انہوں نے حویلی والوں کی بیٹی سے نکاح کی شرط رکھی تھی۔ کیونکہ اپنی بیٹی ملکوں کو بیاہنے کے بعد لازمی طور پہ انہیں اپنے معاہدے کی پاس داری کرنی پڑتی شاید اس طرح بیچ میں وہ نرم پڑ جاتے کیونکہ ان کی بیٹی ملکوں کی بہو ہوتی۔ وہ ملکوں کا نہ سہی اپنی بیٹی کا تو ضرور خیال کرتے۔ اس طرح دونوں خاندانوں کے مابین رسہ کشی کا خاتمہ ہو جاتا ایک امن و محبت کی فضا بن جاتی۔ اس طرح ان کے گاؤں کی قسمت ہی بدل جاتی کیونکہ وہاں کے باسی بھی قدرتی طور پہ حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک حصہ ملکوں کی حمایت پہ کمربستہ تھا تو دوسرا گیلانیوں کی سائیڈ لیتا۔

شہباز گیلانی کے لیے یہ تصور ہی تکلیف دہ تھا کہ لاڈلی زرین دشمن کے گھر جائے اس طرح تو ان کی طاقت ہی صفر ہو جاتی۔ بابر روپوش تھا۔ ادھر جرگے والوں کا اصرار شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔

شہباز گیلانی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ انہیں سامنے کی بات نظر نہیں آئی تھی۔ ہاشم کی بیٹیاں کس مرض کی دوا تھیں۔

''کون سا ہاشم میرے برابر کا ہے۔ کون سا رابعہ اور اسریٰ ہمارا خون ہیں۔ وہ صرف ہاشم کا خون ہیں۔ اس ہاشم کا جس سے میں بے حد نفرت کرتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے شہباز غالباً یہ بات فراموش کر گئے تھے کہ رابعہ اور اسریٰ ان کی پھوپھی زاد ذری کی اولاد بھی ہیں۔

تین سال پہلے شہباز نے ہاشم کو ڈھونڈ نکالا تھا، یوں آنا جانا شروع ہو گیا بلکہ جانے کی بات غلط تھی کیونکہ شہباز ہی ہاشم کے پاس خود آتے تھے وہ کبھی کبھار ہی گاؤں جاتے۔ شہباز اب یکسر بدلے ہوئے تھے آہستہ آہستہ انہوں نے ہاشم کا اعتماد حاصل کر لیا۔ رابعہ کی بات طے کر دینے پہ انہوں نے بہت شور مچایا ہاشم کو طرح طرح کے لالچ دیے۔

رابعہ کے سلسلے میں ان کو بات بنتی نظر نہیں آ رہی تھی حالانکہ اس سلسلے میں انہوں نے ہر طریقہ آزما کر دیکھ لیا تھا مگر شاید کاتب تقدیر کو ان کے مذموم ارادے اچھے نہیں لگے وہ چاہتے تھے کہ جرگے والوں کے سامنے سفید حویلی والوں کی بہو کے طور پہ رابعہ اور اسریٰ کا نام پیش کریں۔ اس بارے میں انہوں نے ملک انوار کو ہموار کرنا شروع کر دیا۔

شہباز گیلانی نے ملک انوار کو لکھ کر دیا کہ وہ ہاشم گیلانی کی بیٹی ڈاکٹر اسریٰ کا رشتہ بڑی خوشی سے انہیں دے رہے ہیں۔ اس روز سفید حویلی میں جشن کا سماں تھا کیونکہ شہباز گیلانی نے بیٹی دے کر شکست قبول کر لی تھی۔ زیاد کو بھی پتا چل چکا تھا کہ جس لڑکی کو جرگے والوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے، وہ ڈاکٹر اسریٰ ہے اس نے ملک انوار کو کھل کر بتا دیا کہ وہ جس لڑکی کے لیے چھ ماہ سے خوار ہو رہا ہے، وہ یہی لڑکی ہے۔

''ہم اسے اپنی بیٹی اپنی عزت بنا کر لائیں گے کیونکہ وہ ہمارے زیاد کی محبت ہے اور محبت قدموں میں نہیں دل میں بسا کر رکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ ہم سچ مچ صدق دل سے اپنی دشمنی کا یہیں پہ خاتمہ کر رہے ہیں۔ جو چیز زیاد کو پیاری ہے وہ ہمیں بھی پسند ہے۔ ہم پوری دھوم دھام سے اسریٰ کو بیاہ کر لائیں گے۔''

اماں جان نے اعلان کیا تو زیادہ خوشی سے بے قابو ہو کر اسی وقت ان کے گلے لگ گیا۔

زیاد کا رواں رواں رب کے حضور سجدہ ریز تھا۔

اسریٰ کا تصور ہی اس کے لیے نشاط انگیز تھا۔ اسے بڑی آرزو تھی کہ وہ اسریٰ کو مایوں کی دلہن کی روپ میں دیکھتا۔ فخر نے اس کی دل کے آرزو پوری کر دی تھی اور مایوں کی مووی کسی طرح حاصل کر کے اس تک پہنچا دی۔

''زرد منقیش لگے سوٹ میں ملبوس موتیا کے گجرے باندھے وہ اسے اداس اداس سی لگ رہی تھی۔ اس کا جھکی جھکی آنکھوں والا کلوزاپ زیاد نے بار بار فلم ریوائنڈ کر کے دیکھا۔

کچھ دیر بعد کاشف اسے ڈھونڈتا ہوا کھلے احاطے میں آ گیا جہاں زیاد جنگلے سے بازو ٹکائے کسی غیر مرئی چیز پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔ کاشف کی آمد سے اس کے حسین تصورات کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔

''تم آج کے مہمان خصوصی ہو اور یہاں بیٹھے ہو۔ سب تمہاری گمشدگی کے بارے میں الٹی سیدھی قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔ آؤ اندر، دیکھو تو محفل عروج پہ ہے۔''

کاشف زبردستی اسے اندر لے آیا۔ واقعی اندر محفل عروج پہ تھی۔ گی اسٹیج سے اتر کر شائقین کے درمیان تھرک رہی تھی۔ ''ایک اشارے کی دیر ہے۔'' جمیل نے اسے اکسانے کی کوشش کی۔

اس کا چہرا غصے سے سرخ ہو گیا۔

''میری محبت، چاہت، ہر جذبہ اب اسریٰ کی امانت ہے۔ خوامخواہ مجھے غصہ نہ دلاؤ۔''

وہ فارم ہاؤس سے نکل کر باہر ایک قطار میں کھڑی گاڑیوں کے پاس آیا جس میں اس کی بلیک اکارڈ بھی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے اپنے کندھے پہ کسی کے ہاتھ کالمس محسوس کر کے پلٹا بے اختیار اس کے سینے سے ٹھنڈی سانس خارج ہوئی وہ فخر تھا۔

''میں تمہارے ساتھ واپس حویلی جاؤں گا یہاں تو ایک طوفان بدتمیزی برپا ہے۔''

فخر کے لہجے میں تلخی تھی

''رات بھی تو بہت ہو گئی ہے دو بجنے والے ہیں۔'' زیاد نے کلائی پہ بندھی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔

''تم بھی آرام سے جا کر سو جانا تا کہ صبح جلدی ہو جائے۔'' فخر نے اسے چھیڑا تو وہ مسکرانے لگا۔

''صرف آج کی رات ہی تو بیچ میں حائل ہے۔'' وہ زیر لب بولا اور گاڑی ریورس کر کے موڑنے لگا۔

سفید حویلی میں رت جگا منایا جا رہا تھا۔

شب کے پرسکون سناٹے کو ڈھول اور شہنائی کی آوازیں ایک تسلسل سے مجروح کر رہی تھیں۔ ادھر فارم ہاؤس میں آتش بازی جاری تھی۔ سب اپنے اپنے انداز میں خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

اسریٰ کو یہ آوازیں اپنا تمسخر اڑاتی محسوس ہو رہی تھیں۔

اس کی نگاہیں گھڑی کی طرف اٹھیں۔ وقت آج رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ اچانک دروازے پہ دستک ہوئی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ آنے والی ثمی تھی۔

''آپ تیار ہو جائیں بی بی جی۔'' وہ ایک جملہ بول کر غڑاپ سے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

ابھی آدھا گھنٹہ بیشتر اسریٰ کا کمرا لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ مگر ان کی تیاریوں میں خاص جوش وخروش نہیں تھا یوں لگ رہا تھا وہ مارے باندھے ہنس بول رہی ہیں۔ مہمان بھی کوئی خاص نہیں تھے۔ بس اپنے رشتہ دار اور کچھ جاننے والے مدعو تھے۔ لڑکی والوں کی آج کوئی رسم یا تقریب نہیں تھی اس لیے سب بے فکر تھے۔

البتہ مردانے میں خاصی چہل پہل تھی۔ باراتیوں کے لیے دعوت کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔

شہباز گیلانی ملازمین کی کارکردگی سے مطمئن ہو کر سونے چلے گئے۔ اسریٰ کا کمرہ بھی خالی تھا۔ بڑی عمر کی خواتین پہلے ہی آرام کے لیے جا چکی تھیں۔ باقی لڑکیوں کے لیے شمی نے کشمیری قہوہ تیار کیا۔ جسے پینے کے بعد سب کو ہی نیند آنے لگی۔

اسریٰ نے باتھ روم میں جا کر دوسرے کپڑے پہنے۔ موتیا کے گجرے بالوں اور کلائیوں سے نوچ کر وہیں پھینکے۔ ہاتھوں اور پاؤں پہ لگی مہندی کا البتہ فی الحال کوئی علاج نہیں تھا۔ بڑی سی چادر اوڑھے وہ بالکل تیار تھی۔ ہر آہٹ پہ دل معمول سے ہٹ کر دھڑک رہا تھا۔ اسریٰ کو تو ڈھیروں پسینے آنے لگے۔ زرین بلی کی چال چلتی اسریٰ کے پاس آئی۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا بڑا خوبصورت سا شولڈر بیگ دبا ہوا تھا۔

"اسریٰ! اس بیگ میں کچھ رقم، تمہاری تعلیمی اسناد اور دیگر ضروری چیزیں ہیں اور یہ میری طرف سے ہے جب عزت، موت اور زندگی میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑا تو یہ تمہاری مدد کرے گا۔" اس نے وزن میں ہلکا اور چھوٹا سا ریوالور اسریٰ کی طرف بڑھایا۔

"خضر تمہیں سیدھا لاہور پہنچائے گا اور یہ رہا ایڈووکیٹ عالم درانی کا وزیٹنگ کارڈ اور ایڈریس۔ انسانی حقوق کا یہ نامی گرامی وکیل ہے اسے میں نے تمہارے بارے میں بتا دیا ہے۔ یہ تمہاری مدد کرے گا۔ تمہارے جانے کے فوراً بعد میں رابعہ کو بھی سب کچھ بتا دوں گی۔ اب جلدی کرو ایسا نہ ہو کہ تاخیر سے ہم کسی مشکل میں پھنس جائیں۔

"زرین! تم جس طرح میری مدد کر رہی ہو میں ساری زندگی تمہارا احسان نہیں بھولوں گی اگر زندگی رہی تو تمہارا احسان اتارنے کی کوشش کروں گی۔"

"اس میں احسان کی کیا بات ہے۔" زرین نے کچھ اور روپے زبردستی اس کے ہاتھ میں تھمائے پہلے شمی باہر نکلی اس کے بعد زرین کے ساتھ اسریٰ نکلی۔

شمی حویلی کی عقبی سمت میں چلتی جا رہی تھی۔ کسی زمانے میں یہاں نوکروں کے لیے

چھوٹے چھوٹے کمرے بنوائے گئے تھے بعد میں حویلی کی تزئین و آرائش کے سلسلے میں جب نئے کمرے تعمیر کیے گئے تو اس حصے کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا۔ نوکر نئے حصے میں منتقل ہو گئے یہ حصہ ویران ہی رہا۔ اس طرف آمد ورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ عقبی سمت کی دیوار کی لمبائی پانچ فٹ کے برابر تھی اور یہاں کوئی پہرا بھی نہیں تھا۔ اسریٰ، شمی کے ساتھ اسی طرف سے باہر نکلی۔ دیوار کے ساتھ شمی نے پہلے ہی ایک پرانا سا اسٹول لا کر رکھ چھوڑا تھا۔ اس نے اسریٰ کو دیوار پہ چڑھنے میں مدد دی۔ شمی نے پہلے دیوار سے چھلانگ لگائی۔ وہ دیہاتی فضا میں پلی بڑھی تھی بڑے آرام سے پانچ فٹ اونچی دیوار سے باہر کی طرف کود گئی۔ اسریٰ البتہ ڈر رہی تھی۔ شمی کے حوصلہ دلانے پہ اس نے کودنے کے بجائے لٹک کر اترنے کو ترجیح دی۔ اس کوشش میں اس کی کہنیاں چھل گئیں مگر اس وقت یہ تکلیف بے معنی تھی۔

زرین نے ٹیبل پہلے کی طرح پرانی جگہ پر رکھ دی۔ شمی اسریٰ کو خضر کی گاڑی کے پاس چھوڑ کر دوبارہ دیوار کے ذریعے حویلی میں آ گئی۔

خضر نے گاڑی حویلی کے داخلی گیٹ سے کافی دور مخالف سمت میں کھڑی کر رکھی تھی۔

اسریٰ جونہی اندر بیٹھی اس نے فوراً اسٹارٹ کر دی۔

وہ سڑک سے ہٹ کر کچے راستے پہ جا رہا تھا۔ اسریٰ نے اس کا چہرا دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کا دل ابھی تک زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کچا راستہ بہت خراب اور ناہموار تھا۔ مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے۔ دو روز پہلے ہونے والی بارش کی وجہ سے ٹائر بار بار پھسل رہے تھے۔ خضر کو گاڑی ڈرائیو کرنے میں خاصی مشکل پیش آ رہی تھی۔ گاڑی کی اندرونی لائٹ بجھی ہوئی تھی۔ خضر نے کچھ دیر بعد اسے پہلی بار مخاطب کیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے خاصی اپنائیت سے سوال کیا جو اسریٰ کو بہت برا لگا۔

"تمہیں کیا میرا جو نام بھی ہو، اپنے کام سے کام رکھو۔" خضر کے لبوں پہ زہریلی سی مسکراہٹ دم توڑ گئی۔

"ایک نوکرانی ہو کر اتنا نخرا۔ ذرا یہاں سے نکلوں تو اس کا سارا نخرا ناک کے راستے نکال باہر نہ کیا تو اپنا نام بھی خضر نہیں۔" اس نے دل میں سوچا خضر شمی کا بہنوئی تھا۔ شادی کے بعد وہ بیوی کو شہر لے گیا۔ عورتوں کے معاملہ میں اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ فراڈ دھوکہ بازیوں کے ذریعے دوسروں سے رقم بٹورنا اس کا کام تھا۔ جس کام سے بھی اسے اضافی آمدنی کی امید ہوتی۔

وہ جائز ناجائز دیکھے بغیر اسے کر گزرتا۔ اپنے جیسے لوگوں میں ہی اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ آج کل بیوی کے ساتھ گاؤں آیا ہوا تھا۔ زرین بھی اسے پہچانتی تھی کیونکہ شہباز کے پاس اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ وہ اس کی شہرت سے بھی واقف تھی۔ شمی کے توسط سے راز داری کا وعدہ لے کر اس نے خضر سے اپنے کام کا کہا۔

پیسے کے بارے میں سنتے ہی خضر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ایک معمولی سے کام کے اتنے پیسے۔ اسے ایک لڑکی کو گاؤں سے باہر پہنچانا تھا اور بس۔ زرین نے لڑکی کے بارے میں اسے ایک لفظ بھی نہیں بتایا۔ تجسس کے باوجود وہ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکا ہاں زرین نے اتنا ضرور کہا کہ یہ ہمارے ملازم کی بیٹی ہے۔ اب اس ایک جملے سے پوری کہانی بنانا خضر کا کام تھا۔ شمی کو لاکھ کریدنے کے باوجود اس نے ایک لفظ پھوٹ کر نہ دیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ خضر کی نیت میں کچھ کچھ فتور آ گیا تھا۔

''کیا ہے اگر شہر پہنچانے سے پہلے میں بھی اس بہتی ندی میں ہاتھ دھولوں کسی کو کیا پتہ چلے گا اور کوئی میرا کیا بگاڑ لے گا۔'' اس کے شیطانی دماغ میں کشمکش ہونے لگی۔

''اس سوچ پہ اس کا دماغ اس بری طرح اٹکا کہ اسے سامنے موجود گڑھا دیکھنے کے باوجود دکھائی نہ دیا۔ گاڑی کا اگلا ٹائر اس گڑھے میں جا پھنسا تو ایک دم توازن بگڑ گیا گاڑی ایک سائیڈ سے ترچھی ہو گئی۔ خضر زیر لب گالیاں بکتا نیچے اترا اور گڑھے کا معائنہ کرنے لگا۔

کچے کے ساتھ ساتھ جاتی پکی سڑک پہ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس قریب آتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ ایکدم خوفزدہ ہو گیا اس نے دعا کی کہ کاش گاڑی میں موجود افراد کی نظر اس پہ نہ پڑے۔ ہو سکتا ہے اس طرح اس کا بھانڈا پھوٹ جائے کیونکہ زرین نے بار بار اس سے کہا تھا وہ کسی قسم کا رسک نہ لے۔ ساٹھ ہزار کے لیے وہ ویسے بھی رسک لینے پہ تیار نہیں تھا اس لیے وہ تو کچے راستے پہ ڈرائیونگ کرتا آیا تھا۔

ارے یہ کون بیوقوف کا بچہ ہے۔ اچھی بھلی سڑک ہوتے ہوئے اس راستے پہ گاڑی ڈرائیو کر رہا ہے۔ مگر یہ کیا یہ تو رکی ہوئی ہے۔ زیاد ذرا گاڑی روکنا میں نیچے اتر کر دیکھتا ہوں۔ شاید ہماری مدد کی ضرورت ہو۔ فخر اتر کر سنبھل سنبھل کر پاؤں جماتا کریم کلر کی سوزوکی ایف ایکس کے پاس پہنچا جہاں کوئی ساکت کھڑا تھا۔

''کون ہو تم اور کیا مسئلہ ہے؟'' وہ کڑک کر بولا۔ خضر، ملک فخر کو فوراً پہچان گیا۔

''ملک صاحب آپ!''

''خضر! تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟'' فخر کی حیرت فطری تھی۔ اتنے میں زیاد بھی ہیڈ لائٹس جلتی چھوڑ کر فخر کے پیچھے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ بھی تھی جو اس نے روشن کر لی تھی۔ فخر کی طرح وہ بھی خضر کو دیکھ کر حیران ہوا۔

''کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟''

''گاڑی کا اگلا ٹائر گڑھے میں پھنس گیا ہے، ملک صاحب!'' وہ حد درجہ انکساری سے بولا۔

''تمہیں پتہ ہے جس راستے پہ تم ڈرائیونگ کر رہے ہو۔ کتنا خراب ہے۔''

''بس جلدی میں غلطی ہو گئی مائی باپ، اصل میں اچانک ہی میری ساس کی طبیعت خراب ہو گئی جلدی جلدی میں ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ سوچا مین روڈ تک جانے کے لیے یہ راستہ چھوٹا پڑے گا۔'' خضر نے لولا لنگڑا سا جواز پیش کیا۔

''اب انہیں لے کر کہاں جاؤ گے؟''

''ڈسپنسری لے کر جا رہا ہوں؟''

''رات کے ڈھائی بجے؟'' فخر نے کلائی پہ بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔

''وہ جی ڈسپنسر رفیق سے میری اچھی دعا سلام ہے اس کے گھر لے کر جاؤں گا خالہ کو۔'' خضر نے دل میں ان دونوں کو کوسا۔ گھبراہٹ میں جانے وہ کیا کچھ کہہ رہا تھا۔

''اچھا اپنی خالہ سے کہو گاڑی سے باہر آئیں۔ ہم گاڑی کو گڑھے سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں مل جل کر یہ کام ہو گا۔''

زیاد نے گم صم پریشان کھڑے خضر سے کہا۔ مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق اس نے اسریٰ کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا جس کی اپنی حالت بھی خضر سے زیادہ مختلف نہ تھی۔

زیاد ایف ایکس کے دروازے کے پاس کھڑا تھا جونہی اسریٰ باہر آئی وہ ذرا سا پیچھے ہٹا اس کی حس شامہ نے ایک مانوس سی خوشبو کو فوراً محسوس کیا یہ پرفیوم اور عطر سے ہٹ کر علیحدہ ہی خوشبو تھی۔ گزشتہ چھ سات روز سے اسے اس خوشبو سے آگاہی ہوئی تھی یہ ابٹن کی خوشبو تھی جو لڑکیاں بالیاں اپنی حُسن کو فزوں تر کرنے کے لیے استعمال کر رہی تھیں۔ اسے یاد آیا کہ تین روز پہلے وانیہ بھابھی، ثانیہ بھابھی، علینہ اور دیگر لڑکیوں نے اسے دھوکے سے گھیر کر اسے بھی ابٹن

لگانے کی کوشش کی تھی۔فخر نے شرط لگائی تھی مگر عین وقت پہ اسے پتہ چل گیا اور وہ ان سب کے گھیرے سے نکل آیا۔

"خضر کی ساس خاصی شوقین مزاج لگتی ہے۔"

اس نے ٹارچ روشن کرتے ہوئے سوچا اور بالکل بے دھیانی میں روشن دائرہ اسرٰی پہ رکا تھا۔ مارے گھبراہٹ کے اس کا وہ ہاتھ چہرے سے ہٹ گیا جس ہاتھ سے اس نے چادر کا گھونگھٹ سا بنا کر پکڑا ہوا تھا اس نے فوراً منہ پھیرتے ہوئے چادر درست کی۔

زیاد کو کسی گڑبڑ کا احساس ہوا اس نے فخر کو بلایا۔

"خضر کے ساتھ اس کی ساس نہیں ہے یہ تو کوئی لڑکی لگ رہی ہے کیونکہ ہاتھوں پہ میں نے مہندی کے نقش و نگار دیکھے ہیں البتہ چہرا نہیں دیکھ سکا۔"

"تو یہ بات ہے۔" خضر اور بھی گھبرا گیا جب انہوں نے اس سے لڑکی کے بارے میں پوچھا پہلے تو وہ آئیں بائیں شائیں ہی کرتا رہا پھر زیاد کا کرارا سا تھپڑ کھا کر راہ راست پہ آ گیا۔

"میں بے قصور ہوں۔ یہ لڑکی خود میری گاڑی میں بیٹھی ہے۔ کہہ رہی تھی مجھے شہر پہنچا دو۔ کسی وکیل کا نام لے رہی تھی۔ مجھے نہیں پتہ کون ہے یہ، میں تو انسانی ہمدردی کے ناطے مدد کرنے پہ آمادہ ہو گیا۔ میں نے سوچا جوان لڑکی ہے یہ نہ ہو کسی بدفطرت کے ہتھے چڑھ جائے۔ اس لیے بٹھا لیا۔"

وہ صفائی دے رہا تھا۔

"یہ گاڑی کس کی ہے؟"

"میرے دوست کی ہے جی۔"

"میرے ساتھ جھوٹ کیوں بولا؟" خضر کے پاس اس بات کا جواب نہیں تھا۔

اسرٰی نے ایک طرف بھاگنے کا سوچا مگر اپنی بے بسی پہ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ خضر نے اس کے بارے میں غلط بیانی کی تھی۔

زیاد نے خضر کو گاڑی کی پسنجر سیٹ پہ دھکا دیا۔ ایف ایکس ہنوز گڑھے میں پھنسی ہوئی تھی۔

"تم ذرا یہاں بیٹھو میں ان محترمہ سے پوچھوں کون ہیں اور آدھی رات کو کس وکیل کے پاس جا رہی تھیں؟

"کون ہو تم لڑکی! ذرا اپنے چہرے سے چادر ہٹاؤ۔"

"ہم سے ڈرو مت، ہم شریف لوگ ہیں اگر مظلوم ہو تو تمہاری مدد کریں گے جہاں کہو گی پہنچا دیں گے۔ کم از کم خضر کی طرح ناقابل اعتبار نہیں ہیں۔ فخر کا لہجہ نرم سا تھا اس کے پاس اعتبار کر لینے کے سوا کوئی چارا نہیں تھا۔ اسرٰی نے چادر چہرے پر سے ہٹائی تو فخر کو جھٹکا سا لگا۔ یہ تو ڈاکٹر اسرٰی تھی۔ زیاد کی جان جہاں، جس کے حصول اور محبت کے لیے وہ پاگل ہوا جا رہا تھا۔

"کون ہے فخر؟ کیا اپنے ہی گاؤں کی لڑکی ہے جو بت بن گئے ہو۔" زیاد بھی اس کے پاس آ گیا فخر پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ زیاد کا دھواں دھواں ہوتا چہرا دیکھے۔

"اوہ مائی گاڈ!" زیاد کے ہاتھ سے ٹارچ گر پڑی۔ اسرٰی نے ایک بار بھی ان دونوں کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ فخر نے اس موقع پہ اپنے حواس برقرار رکھے اور خضر کے پاس آیا۔ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ صبح گاڑی لے جانا۔ اس واقعے کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا تمہیں واقعی نہیں پتہ یہ لڑکی کون ہے؟

"ملک صاحب! آپ یقین کریں مجھے نہیں پتہ یہ لڑکی کون ہے۔"

خضر سچ بول رہا تھا۔ جان بچی سو لاکھوں پائے کے مصداق وہ ایک طرف تیز تیز چلتا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ساٹھ ہزار اس کی جیب میں تھے۔ زرین نے کہا تھا اگر وہ پکڑا جائے تو یہی کہے کہ مجھے نہیں پتہ یہ لڑکی کون ہے۔ اس نے من و عن یہی جملہ دہرایا تھا۔ اتنی آسانی سے جان بچ گئی تھی ورنہ ایک لڑکی کے ساتھ بچ نکلنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

"زیاد! حویلی چلو شہباز انکل کے پاس۔" فخر نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا جو اس نے فوراً جھٹک دیا۔

"یہ میری منکوحہ ہے۔ آدھی رات کو ایک غیر آدمی کے ساتھ پائی گئی تم کہہ رہے ہو حویلی چلو، میں، میں، اسے مار ڈالوں گا۔" اسرٰی کھڑے کھڑے دھڑام سے نیچے گری۔

"زیاد! ہوش مندی سے کام لو یہ کام جوش سے نہیں ہوش سے کیے جاتے ہیں۔ ابھی کسی کو پتہ نہیں ہے۔ آؤ انہیں گاڑی میں بٹھائیں اور انکل شہباز کے پاس چلیں وہاں جا کر پتہ چلے گا کہ یہ سب کیا ہے۔ بدگمانی اچھی نہیں ہوتی اور تم تو جو محبت کے اتنے لمبے چوڑے دعوے کرتے رہے ہو۔ کس آسانی سے کہہ دیا میں اسے مار ڈالوں گا۔ کیا بھول گئے یہ وہی ہے جس کے ملن کی آس میں تمہارا وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔"

"مگر فخر! وہ آدھی رات کو خضر کے ساتھ کون سے وکیل کے پاس جا رہی تھی۔"

"اگر مگر کچھ نہیں وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ حویلی چلو سب پتہ چل جائے گا۔"

فخر گھوم کر پچھلی سمت میں آیا اسریٰ زمین پہ بے ہوش پڑی تھی۔ جب کہ ان کی اکارڈ سڑک پہ تھوڑی دور ہی کھڑی تھی۔

"زیاد! انہیں اٹھا کر گاڑی تک لے چلو، یہ بے ہوش ہیں۔"

اسریٰ، فخر سے چھوٹی تھی مگر وہ بڑے احترام سے بول رہا تھا۔ وہ سنگ سا گیا۔ گرتے وقت بھی شولڈر بیگ اسریٰ کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا جواب زمین پہ ایک طرف پڑا تھا۔ زیاد پنجوں کے بل اسریٰ کے پاس بیٹھا جلتے کڑھتے ایک ہاتھ اس کی گردن میں ڈالا۔ کچھ دیر پہلے تک جب وہ فام ہاؤس میں تھا تو ملن کی اولین ساعتوں کا تصور کر کے ہی اس کی آنکھوں میں نشہ تیرنے لگا تھا۔ اب اسے چھو کر زیاد کے دل میں کوئی پھول نہیں کھلا اس نے اسریٰ کو دونوں بازوؤں میں اٹھا کر گاڑی تک پہنچایا ہر احساس سے عاری ہو کر۔ فخر کے ہاتھ میں اسریٰ کا بیگ تھا۔

حویلی پہنچنے تک ان دونوں کے درمیان کوئی اور بات نہیں ہوئی ایک تناؤ کی سی کیفیت طاری رہی۔ ہر طرف سناٹا اونگھ رہا تھا۔

حویلی کی حالت سے لگ رہا تھا کہ انہیں اس حادثے کا پتہ ابھی کچھ دیر پہلے چلا ہے کیونکہ اسریٰ کے کزن اس کی تلاش میں نکلنے ہی والے تھے۔

سلطان خاتون اپنے شوہر شہباز کے ساتھ کل ہونے والی تقریب کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں۔ سونے سے پہلے حسب معمول انہوں نے ساری حویلی کا چکر لگایا۔ زرین سے یہاں پہ غلطی ہو گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ امی جان سو چکی ہیں مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ اسریٰ کے کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ زرین سے یہ دوسری بڑی غلطی ہوئی کیونکہ اسریٰ لائٹ جلا کر سونے کی عادی تھی۔ اب تو سلطانہ خاتون کو بھی اس کی اس عادت کی خبر ہو چکی تھی۔ انہوں نے دروازہ کھول کر اسریٰ کو دو تین بار آواز دی مگر جواب ندارد۔ لائٹ جلائی گئی تو ماجرا کھلا۔

"شہباز انکل! اسریٰ ہماری گاڑی میں ہیں۔ بے ہوش ہیں۔ انہیں ابتدائی طبی امداد کی ضرورت ہے غالباً۔"

فخر اور زیاد ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ زندگی بھر شہباز کی کبھی یہ حالت نہیں ہوتی تھی جو اس وقت ہو رہی تھی۔ فخر نے مصلحتاً یہ بات جان کر چھپائی تھی کہ اسریٰ خضر کے ساتھ جا رہی

تھی۔ اس نے یہی کہا کہ اسریٰ انہیں سفید حویلی جاتے ہوئے راستے میں ملی۔ فخر کو احساس تھا کہ اس کا یہ بیان بہت کمزور اور جھول دار ہے مگر شہباز کو اس پہ یقین کر لینے کے سوا کوئی چارا نہیں تھا۔

کتنی دیر وہ سر تھامے بیٹھے رہے۔ ان کی ساری زندگی کی کمائی بس فخر و ناز اور عزت ہی تو تھی جسے اسریٰ نے کس بُری طرح روندنے کی کوشش کی۔ کل اس کی رخصتی تھی۔ اس نے تو ان کے منہ پہ کالک ملنے اور شکست فاش دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

انہیں اس بات کا بھی اچھی طرح پتہ تھا اگر زیاد نے شادی سے انکار کر دیا تو شرط کے مطابق نہیں زرین کو ملک انوار کی بہو بنانا ہی پڑے گا کیونکہ زیاد کے چہرے سے لگ رہا تھا وہ بڑی مشکل سے اپنے تیز و تند جذبات کے طوفانی ریلے کو چھپائے بیٹھا ہے۔

"اسریٰ بیٹی جھلی ہے۔ پاگل ہے۔ اس کے میرے ساتھ کچھ اختلافات ہیں اس نے اپنے جذبات مجھ تک پہنچانے کے لیے بڑا غلط طریقہ اختیار کیا ہے۔"

انہوں نے تمہید باندھی۔

"بہت خوب، وہ شادی کے گھر سے رات گئے نکل کر جانے کہاں جا رہی تھی اور آپ کچھ اختلافات کا نام دے کر اپنی جان چھڑانا چاہ رہے ہیں۔"

زیاد کے منہ میں جو کچھ آیا بولتا چلا گیا۔ اتنے میں اسریٰ کے دوسرے چچا بھی آ گئے۔ معاملہ بہت سنگین رخ اختیار کرتا جا رہا تھا۔ فخر نے کئی بار ہاتھ دبا کر زیاد کو خاموش رہنے کو کہا مگر وہ تو آتش فشاں بنا ہوا تھا۔

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے ذرا معقولیت کا مظاہرہ کرو۔" فخر نے رسان سے سمجھایا وہ خفگی سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"تم کہہ رہے ہو؟ یہ سب تم کہہ رہے ہو فخر! تمہیں پتہ ہے کہ رات کے اندھیرے میں گھر سے فرار ہونے والی لڑکی کو کوئی بھی مرد دل بہلانے کا سامان تو بنا سکتا ہے مگر زندگی بھر کا ساتھ نہیں۔"

"یہ وقت بہت نازک ہے اگر ہم اس موقعے پہ پیچھے ہٹ گئے تو ہر کوئی ہم پہ تھوتھو کرے گا۔ لوگ کہیں گے بڑی شان سے صلح کرنے چلے تھے۔ مجھے یقین ہے۔ حویلی سے باہر ہم دونوں کے سوا کوئی بھی اس بات سے واقف نہیں ہے۔ سو پردہ پوشی ہی بہتر ہے بعد

میں دیکھا جائے گا۔"

"ہاں زیاد بیٹا! فخر ٹھیک کہہ رہا ہے تم کل کا دن گزرنے کے بعد اسریٰ کو بے شک گولی مار دینا مگر اس وقت میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے اگر تم نے اس نازک وقت میں ہمارا ساتھ نہ دیا تو ہماری عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔ شہباز کی مغرور گردن اپنے دشمن کے بیٹے کے آگے جھک گئی۔ "اور وہ جو میری غیرت کا جنازہ نکالنے چلی تھی۔ اس کا حساب کون دے گا؟"

"زیاد بیٹا! یقین کرو اسریٰ ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے۔"

"پھر اس نے ایسا قدم کیوں اٹھایا ہے؟" اب شہباز کے پاس سچ بولنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا سچ بول کر ہی وہ اپنی انا کو سلامت رکھ سکتے تھے۔

"میں نے اسے شہر سے لا کر حویلی میں محصور کر رکھا تھا۔ اسریٰ کے نکاح کی خبر اس کی بہن تک کو نہیں ہے۔ میں نے اسے نگرانی میں رکھا ہوا تھا۔ کسی نہ کسی صورت اس نے اندورنی بھڑاس کو باہر تو نکالنا ہی تھا میں خود ذمہ دار ہوں۔ میں ایک بار پھر تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں خدارا! میری عزت کا خیال رکھنا۔"

چشم فلک نے ایک عجیب سی تماشا دیکھا۔ زندگی بھر دوسروں سے رعونت زدہ لہجے میں بات کرنے والا انہیں حقیر سمجھنے والا اٹھی گردن والا شہباز گیلانی اپنا اونچا شملہ اتار کر زیاد کے پاؤں میں رکھنے لگا تھا۔ صرف اس وجہ سے کہیں زرین متبادل کے طور پہ تاوان میں نہ چلی جائے۔ اولاد کی محبت بڑی ظالم ہوتی ہے انسان کو پستی میں گرا دیتی ہے۔

فخر نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ مقبول گیلانی اور سکندر گیلانی نے بھی زیاد کو قائل کرنے کے لیے اپنی عزت کا واسطہ دیا۔

"انکل! میں اسریٰ سے بات کرنا چاہتا ہوں اگر ان کی طبیعت ٹھیک ہو تو۔" شہباز گیلانی اٹھ کر فخر کے ساتھ ہو لیے۔ زیاد وہیں بیٹھا جوتے سے قالین کریدتا رہا۔ اس کے چہرے پہ تاحال کبیدگی کے آثار تھے۔

اسریٰ فق چہرے کے ساتھ اپنی طرف بڑھتے موت کے سائے کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے بالکل بھی رعایت کی خوش فہمی نہیں تھی۔

تینوں خواتین اسریٰ کے پاس موجود تھیں۔ شہباز نے انہیں کمرے سے نکال دیا۔ اسریٰ نے مارے خوف کے آنکھیں بند کر لیں۔

"فخر بیٹا! اندر آ جاؤ۔" شہباز نے خشمگیں نگاہوں سے اسریٰ کی طرف دیکھتے ہوئے فخر کو اندر آنے کا اشارہ کیا اور خود بھی وہیں بیٹھ گئے۔

"انکل معاف کیجیے گا۔ میں تنہائی میں ان سے دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں" وہ بڑی شائستگی سے بولا تو ناچار وہ باہر نکل گئے۔ کچھ دیر وہ اسریٰ کے لرزتے وجود کو دیکھتا رہا اور پھر دوستانہ لہجے میں بولا۔

"میری طرف دیکھیں اسریٰ! میں فخر مَک ہوں زیاد کا دوست اور پھوپھی زاد۔"

فخر نے اپنا تعارف کرایا۔

"پلیز آپ اپنے آپ کو سنبھالیں۔ اگر مجھ پہ اعتبار ہے تو میرے چند سوالوں کا جواب دے دیں۔ آپ کو پتہ ہی نہیں ہے کہ آپ نے کیا کر ڈالا۔"

فخر کے لہجے میں ہمدردی محسوس کرتے ہی اسریٰ سسک سسک کر رونے لگی۔

"میں نے انتہائی مایوسی کے سرے پہ جا کر یہ فیصلہ کیا میری سوچ یہی تھی کہ شاید میری بقا اسی میں ہے۔"

"آپ اتنی تعلیم یافتہ۔ کم از کم یہ احمقانہ قدم......" فخر خاموش ہو گیا۔

"مجھے پتہ تھا۔ سفید حویلی میں انسان بھی پائے جاتے ہیں شائستہ اور نرم دل انسان۔" اسریٰ کے اس ایک جملے میں جو راز پنہاں تھا۔ فی الحال فخر کی عقل اسے سمجھنے سے قاصر تھی۔

"آپ خود کو اکیلا مت سمجھیں۔" فخر نے اس کے سر پہ اپنا بھاری ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"کچھ گھنٹے پیشتر زرین نے بھی یہی......" خیال آنے پہ اسریٰ نے فوراً باقی جملے کا گلا ہی گھونٹ دیا۔

فخر واپس ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ زیاد وہاں نہیں تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ واپس گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا تھا اور فخر کا ہی انتظار کر رہا تھا۔

"انکل! جو بات چھپی ہے اس کا چھپا رہنا ہی بہتر ہے ورنہ یہ دشمنی کے ایک نئے محاذ کو کھول سکتا ہے۔ اسریٰ زیاد کی امانت ہے ہم کل وقت مقررہ پہ آئیں گے...... آپ اب کسی اور کے سامنے یہ قصہ مت چھیڑیے گا۔" فخر نے سنجیدگی سے کہا اور باہر آ گیا۔

زیاد کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ فخر کو آتا دیکھ کر زور دار آواز میں ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ اس کا تپا تپا سرخ چہرا دیکھ کر خاموش ہو گیا مگر پھر رہ نہ سکا۔ حویلی کی سٹرک کراس

کر کے وہ جونہی دورویہ راستے پہ آئے فخر نے اس خاموشی کو توڑ دیا۔

”زیاد تم نے کچھ اچھا نہیں کیا ہے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ عقل سے کام لو۔ ٹھنڈے دل سے سوچو۔“

”خاموش ہو جاؤ فخر! تمہیں اس کی وکالت کرنے کے کتنے پیسے ملے ہیں۔ کیا اچھا نہیں کیا ہے میں نے۔ شہباز گیلانی نے اپنا شملہ اتار کر میرے قدموں میں رکھنا چاہا اگر اس کی بزرگی کا خیال نہ ہوتا تو یقین کرو میں اسریٰ کو اپنے ہاتھ سے مار دیتا اور اس پہ مجھے افسوس بھی نہ ہوتا رات کے اندھیرے میں فرار ہونے والی لڑکی کو گولڈ میڈل پہناؤں اگر تم نے میری طرح ٹوٹ کر محبت کی ہو تو تمہیں پتہ چلے کہ جب اپنی ہی آنکھوں کے سامنے اس جذبے کا خون ہو تو کیا کیفیت ہوتی ہے۔“

”زیاد! تم بھی بہت سی باتوں سے لاعلم ہو اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ اسریٰ کو استعمال کیا گیا ہے تو...... خدا کی مصلحت پہ میرا ایمان اور بھی پختہ ہو گیا ہے۔ رات کے اندھیرے میں اسریٰ کا ہم سے ٹکرانا بے سبب نہیں ہے۔ شمی اور خضر کا آپس میں قریبی رشتہ ہے اس حوالے سے میں شمی کو ٹٹولنے کی کوشش کروں گا۔ تم خوامخواہ کے شبہات کو دل میں جگہ مت دو۔ اسریٰ کا دامن آلودہ نہیں ہے۔ اسریٰ ایک پڑھی لکھی، باشعور لڑکی ہے، ڈاکٹر ہے آخر کچھ تو ایسا ہوا ہوگا جو وہ رات کے اندھیرے میں یوں چوروں کی طرح گھر چھوڑنے پہ مجبور ہوئی۔ مجھے انسانوں کو پرکھنے کا دعوا تو نہیں ہے لیکن اسریٰ کے بارے میں میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے غلط نیت سے قدم گھر سے باہر نہیں نکالا ہوگا۔“

زیاد چپ چاپ سامنے سڑک پہ نظریں جمائے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

آنے والی بدنامی کا رخ مڑ گیا تھا۔ فخر انہیں یقین دلا کر رخصت ہوا تھا۔ وہ اسی وقت اسریٰ سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے تھے مگر وہ پہلے ہی سلطانہ خاتون کے تیز و تند نوکیلے جملوں کی زد میں تھی۔

صبح صادق کا وقت تھا۔ جب شمی کی چیخوں سے ساری حویلی گونجنے لگی۔

”الٰہی خیر!“ سلطانہ خاتون نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ لیا۔

شمی کی چیخوں کا سبب جاننے کے لیے وہ آواز کے مرکز کی طرف تیزی سے بڑھیں۔ ان کی دیورانیوں اور دیوروں کے حواس باختہ چہرے ان کے پیچھے ہی تھے چند سیکنڈز کے اندر اندر ہی سب سوئے ذی نفس جاگ اٹھے۔ ہر کوئی ان آوازوں کا سبب جاننے کی لیے بے تاب

نظر آ رہا تھا۔

پھر شہباز گیلانی اور سلطانہ خاتون نے اپنی زندگی کا روح کھینچ دینے والا دلخراش منظر دیکھا۔ شمی ابھی تک ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی اب اس کی آواز میں سلطانہ خاتون کی آواز سمیت اور کئی آوازیں بھی شامل تھیں۔

انسان زندگی کی ہوس میں کیا کچھ کر گزرتا ہے اور اس نے موت کو گلے لگا لیا تھا۔

ہائے! اسے کون بتاتا ابھی تو بھری بہاروں کے موسم ہیں اور اس نے بہاروں میں خزاں کا دائمی رنگ شامل کر دیا تھا۔

جدائی کا ابدی رنگ۔

اپنی امی کے ساتھ ڈرا سہما ہاشم پہلی بار حویلی میں داخل ہوا۔ اس کی امی نگار، صولت گیلانی کی دوسری بیوی اور ہاشم سوتیلا بیٹا۔ چھ سال پہلے نگار کی پہلی شادی الیاس کے ساتھ ہوئی تھی ڈیڑھ سال بعد الیاس ایک بیٹے کی نگہبانی اسے سونپ کر ایک حادثے میں جان گنوا چکے تھے۔

صولت گیلانی کی طرف سے جب اسے شادی کا پیغام ملا تو ہاشم ساڑھے چار کا تھا۔ نگار، صولت کی ایک دور پرے کی خالہ کی بیٹی تھی۔ اپنی نرم دل فطرت اور من موہنی صورت کی بنا پر صورت کو نگار بہت اچھی لگتی تھی۔

ان کے خاندان میں دوسری تیسری یا پھر چوتھی شادی نئی یا عجیب بات نہیں تھی۔ مگر صولت گیلانی کے بیٹے شہباز کو جو پہلی بیوی سے تھا۔ باپ کی دوسری شادی بالکل بھی اچھی نہیں لگی خاص طور پہ ہاشم۔ اس نے اس سے خدا واسطے کا بیر باندھ لیا تھا سرخ و سفید گپلو سا سنہرے بالوں والا ہاشم سب کو ہی اچھا لگنے لگا تھا یہاں تک کہ صولت کی پہلی بیوی صوفیہ بھی اسے بے حد چاہنے لگی تھی۔

شہباز خود سوکھا سڑا، بھدے نقش والا ایک زرد رو لڑکا تھا اور اپنی شکل و صورت کے معاملے میں کافی حساس تھا۔ ہاشم کو ذرا ذرا سی بات پہ وہ پیٹ ڈالتا۔ جب بھی صولت سے شکایت کی جاتی۔ وہ شہباز کا مزاج درست کرنے کا وعدہ کرتے مگر عملاً انہوں نے کبھی بھی اسے یہ نہیں سمجھایا کہ ہاشم تمہارا بھائی ہے۔ اس کا خیال رکھا کرو۔ کون سا ہاشم ان کا سگا بیٹا تھا جو وہ اپنے بیٹے کو سرزنش کرتے۔

وقت گزرتا گیا۔ شہباز کالج میں اور ہاشم مڈل اسٹینڈرڈ میں پڑھ رہا تھا جب شہباز کی

سگی پھوپھی اور پھوپھا گھر میں اچانک آگ بھڑک اٹھنے سے جھلس گئے ابتدائی طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے انہوں نے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا۔ اس شب ان دونوں کی اکلوتی اولاد زری اپنے ماموں صولت کے گھر کھیلتے کھیلتے وہیں سو گئی تھی۔

اب ماموں کا گھر اس کا مستقل ٹھکانہ تھا۔

چھ سالہ زری اور دس سالہ ہاشم کا درد مشترک تھا۔ وہ اکثر اس کے پاس آجاتی اور اس سے کہانیاں سنتی۔ شہباز نے کالج چھوڑ دیا تھا۔ اسے تعلیم سے بالکل لگاؤ نہیں تھا اب تک بھی مارے باندھے ابا کے ڈر سے پڑھ رہا تھا۔ مسلسل غیر حاضری اور ناپسندیدہ حرکات کے باعث پرنسپل اور اساتذہ کرام اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اس سے پہلے کہ اسے کالج سے نکال دیا جاتا شہباز نے (اپنے تئیں) خود ہی اس کالج پہ دو حرف بھیج دیے۔

ہاشم اور زری کی پسندیدگی محبت میں ڈھلک چکی تھی۔

صولت، ہاشم کو بہت پسند کرنے لگے تھے۔ کیونکہ وہ ذمہ دار اور سمجھ دار تھا۔ ان کے بغیر کہے اس نے صولت کے اکثر کام سنبھال لیے تھے جب کہ شہباز جو ان کا سگا بیٹا تھا اسے ذرا بھی پروا نہیں تھی۔

اسے سدھارنے اور گھر کے معاملات میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے صولت نے اس کی شادی سلطانہ خاتون سے طے کر دی۔

یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ نگار کے ہاں ہاشم کے بعد اور کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ شہباز کی ہاشم سے نفرت کا وہی عالم تھا بلکہ اب تو اس میں اور شدت آگئی تھی وہ شروع سے ہی ہاشم کی ہر پسندیدہ چیز اس سے چھینتا آیا تھا۔ زری اور اس کی محبت بھی اچانک ہی اس کی نگاہ میں آئی تھی۔

نرم و نازک سی زری اسے بھی بہت اچھی لگتی تھی۔ پھر وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ وہ ہاشم کے قبضے میں چلی جائے۔

اسے زری سے محبت یا عشق نہیں تھا۔ وہ تو بس اسے اس کے حسن اور ہاشم سے محبت کے صلے میں کسی طرح بھی نیچا دکھانا چاہتا تھا سو ایک روز بڑے آرام سے صولت گیلانی سے کہہ دیا کہ......

''میں زری سے دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

یہاں پہ اسے شکست فاش ہوگئی کیونکہ صولت گیلانی نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ

زری کی شادی ہاشم سے کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ نگار شاید یہی سننے کے لیے زندہ تھی سو ایک شب سکون سے سو گئی۔ کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔

زری اور ہاشم کی شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس وقت شہباز کا پہلوٹھی کا بیٹا بابر تین سال کا تھا۔

شہباز کی حالت چوٹ کھائے ناگ کی طرح تھی۔

شہباز کے دو چھوٹے بھائی اور بھی تھے مگر وہ ہاشم کے ساتھ نارمل طریقے سے ہی پیش آتے صرف ایک شہباز ہی تھا جو اونٹ کی طرح کینہ دل میں چھپائے بیٹھا تھا۔

اس وقت اس کی حالت دیدنی ہوتی جب وہ ہاشم کو زری کے ساتھ ہنستے بولتے دیکھتا۔ شادی کے بعد پہلے سال ہی ہاشم ایک بیٹی کا باپ بن گیا۔

زری کا حسن ماں بننے کے بعد اور بھی نکھر آیا تھا۔ شہباز کو افسوس ہوتا کہ یہ گوہر نایاب اسے پہلے کیوں نظر نہیں آیا تھا۔ خوامخواہ اس نے سلطانہ خاتون سے شادی کر لی۔ زری عورت تھی۔ شہباز کی بدلی ہوئی نگاہ کیسے نہ محسوس کرتی۔

رابعہ کے بعد اسریٰ پیدا ہوئی۔ وہ دو سال کی ہو چکی تھی۔ ہاشم دو دن کے لیے لاہور ایک ضروری کام سے گیا ہوا تھا جب زری کو اکیلا پا کر شہباز کے اندر کا شیطان بیدار ہو گیا۔ اس رات اس نے زری کا سارا فخر خاک میں ملا دیا بعد میں ضمیر نے ملامت کیا تو اس نے خود کو یہ کہہ کر بہلا لیا کہ میں نے ہاشم سے اپنی نارسائی کا انتقام لے لیا ہے۔

اسی رات زری نے گلے میں پھندا لگا کر خودکشی کر لی۔ اس باحیا، وفاشناس اور عفت مآب عورت کے لیے اب ہاشم کا سامنا کرنا مشکل تھا۔ وہ کیسے ہاشم کے سامنے شہباز کے ہاتھوں روندا گیا وجود لے کر جاتی سو اس نے اپنی رسوائی کے پل پل تڑپاتے احساس سے یکدم چھٹکارا پانے کا فیصلہ کر لیا کیسے اس کے آگے شہباز کی جھوٹن رکھتی۔

دوسرے روز ہاشم واپس لوٹا تو ایک قیامت اسکی منتظر تھی۔ اس کی محبت اس کا پہلا عشق، اس کی پیاری بیوی زری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو چکی تھی۔

رابعہ اور اسریٰ چلا چلا کر رو رہی تھیں۔ ہاشم کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے اڑتالیس گھنٹے میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ دنیا اس کے لیے بے رنگ ہو چکی تھی مگر رابعہ اور اسریٰ کے لیے وہ خود کو سمیٹنے پہ مجبور تھا۔

اس نے کسی سے گلہ نہیں کیا، نہ کسی کو الزام دیا۔ صولت گیلانی کے روکنے کے باوجود حویلی میں نہیں رکا۔ یہ در و دیوار اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہے تھے اس گھر کی کمزور دیواریں اس کی محبوب بیوی کو تحفظ دینے میں ناکام رہی تھیں۔

شہر آنے کے بعد بھی ایک سوال اکثر اس کے ذہن پہ ہتھوڑے کی طرح برستا رہتا کہ زری نے آخر خودکشی کیوں کی۔ اسے کس چیز کی کمی تھی۔ ہاشم نے اسے کبھی کسی محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ صولت گیلانی بھی زری کو بے حد چاہتے تھے...... ان کی دو پیاری بچیاں تھیں۔ گھریلو آرام و سکون میسر تھا، کسی چیز کی بھی کمی نہیں تھی۔ لے دے کر بات پھر وہیں اٹک جاتی۔ زری نے خودکشی کیوں کی؟

صفیہ اس کے جانے کا سن کر رو پڑیں۔ وہ ان کا سگا بیٹا نہیں تھا۔ مگر انہیں سگی ماں کا سا درجہ دیتا آیا تھا۔ شہباز سے بڑھ کر وہ ان کے کہے کا مان رکھتا تھا۔ اتنے برسوں میں انہیں ہاشم اور اپنے تینوں بیٹوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا بلکہ زری سے اس کی شادی ہونے کے بعد ان کی محبت میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اسریٰ اور رابعہ پہ وہ بے انتہا شفقت لٹاتیں۔

شہباز نے بھی رسماً روکنا چاہا مگر ہاشم نے وہی کچھ کیا جو اس کے دل میں تھا۔ وہ اسریٰ اور رابعہ کے ساتھ لاہور آ گیا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ اس زمانے میں سرکاری نوکری کا حصول آج کل کی طرح جوئے شیر لانے کے برابر نہیں تھا۔ اپنے دوست جواد لطیف کے توسط سے اسے فارن آفس میں بہت اچھی جاب مل گئی۔ رابعہ اور اسریٰ کے لیے ہاشم نے کل وقتی ملازمہ رکھ لی تھی جو اسے جواد لطیف نے ڈھونڈ کر دی تھی۔

ملازمت کے بعد تو ہاشم کے پاؤں میں جیسے چکر سا بندھ گیا۔ کبھی اس ملک کبھی اس ملک، یونہی زندگی کے دن گزر رہے تھے۔

ہاشم کے شہر آنے کے تین ماہ بعد شہباز کے گھر بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام اس نے زرین رکھا۔ اس سے جانے شہباز کے کون سے جذبے کی تسکین ہوئی تھی، وہ لاڈ میں اسے اکثر زری کے نام سے پکارتا۔

ہاشم کا رابطہ جو خطوط کی صورت میں قائم تھا، صولت گیلانی اور صفیہ بیگم کے انتقال کے بعد وہ بھی ختم ہو گیا۔ عرصہ دراز سے اسے شہباز، سکندر اور مقبول کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ رابعہ اور اسریٰ کو ہاشم نے حقیقت سے لاعلم رکھنا بہتر سمجھا تھا۔ اس نے انہیں زری

کے حوالے سے یہی بتایا تھا کہ ان کے بچپن میں ہی وہ فوت ہو گئی تھی۔

اسریٰ کو ماں کے وجود کی کمی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔

رابعہ سمجھ دار اور معاملہ فہم تھی۔ اسریٰ جذباتی اور متلون مزاج تھی مگر ان دونوں کے دم سے ہی ہاشم کی زندگی برقرار تھی۔ اس نے دوسری شادی کے بارے میں بھول کر بھی نہیں سوچا تھا، حالانکہ آبلہ پائی کے اس بنجر راستے میں کئی سایہ دار سرسبز نخلستان بھی آئے تھے مگر وہاں رکنا اسے گوارا نہیں تھا۔

اب چند برسوں سے وہ پاکستان میں ہی تھا۔ اسریٰ پڑھ رہی تھی۔ رابعہ نے پڑھائی موقوف کر دی تھی۔ برسوں بعد شہباز نے اچانک ہاشم کو کھوج نکالا اور اتنی محبت سے ملا کر ہاشم کو اس کا برسوں پرانا رویہ خواب معلوم ہونے لگا۔

ہاشم خود سے یہ قرار کرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ اس کے دل میں بچپن سے ہی شہباز کا نفسیاتی خوف بیٹھا ہوا ہے۔ شہباز کو یوں لگ رہا تھا کہ قدرت دوبارہ اسے وہیں لے آئی ہے، اسریٰ ہو بہو اپنی ماں کی تصویر تھی۔ وہی مسکراہٹ، وہی آنکھیں، وہی سانچے میں ڈھلا وجود۔ زری مجسم ہو کر ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے آ گئی تھی۔

حقیقت یہ تھی کہ شہباز نے اپنے اندرونی شدت پسند منتقم مزاج انسان کو کبھی سونے دیا ہی نہیں تھا۔ رابعہ اور اسریٰ کو دیکھ کر اسے یہ خیال آیا تھا، اگر وہ انہیں حویلی میں لے جائے اور وہیں خاندان میں ان کی شادی کر دے تو ہاشم کو ایک بار پھر زک دے سکتا ہے۔ اس ہاشم کو جو زری کی موت کے بعد اس کی دست برد سے دور ہو گیا تھا۔ پرانی نفرت جو ہاشم کے لیے گویا اس کے خون میں رچی بسی تھی، دوبارہ ذہن کے نہاں خانوں سے نکل کر سامنے آ گئی تھی۔

اس سلسلے میں ہاشم کو نرم کرنے کے لیے اس نے اپنے دو ملازم بلا معاوضہ اس کے پاس شہر بھجوا دیے۔

اسریٰ اور رابعہ ان سے مانوس ہو گئی تھیں۔ اسریٰ بڑے پیار سے...... بڑے ابا کہہ کر مخاطب کرتی تو یوں لگتا جیسے زری...... کان میں ہنس رہی ہو۔ بہت مختصر عرصے میں شہباز نے ہاشم پہ اپنا گزشتہ رعب و داب قائم کر لیا۔ ہاشم اس کے زیر اثر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے خاور کا رشتہ رابعہ کے لیے منظور کر لیا تو شہباز کو اپنا غصہ چھپانا دشوار ہو گیا۔ اپنے تئیں وہ ہاشم کی بیٹیوں کا سرپرست اعلیٰ تھا۔ بابر نے جب اکبر کو مار مار کر زخمی کر دیا اور روپوش ہوا تو شہباز اسریٰ کے

بارے میں فیصلہ کر چکا تھا۔

زریں کا بے جان جسم پنکھے کے ساتھ جھول رہا تھا۔

شہباز کی نگاہوں میں برسوں پرانا منظر زندہ ہو گیا۔ زری کی لاش اسی طرح چھت کی کڑیوں کے ساتھ بندھی رسی کے سہارے جھول رہی تھی۔

فرق صرف اتنا تھا کہ زرین کو کسی شہباز نے بے آبرو نہیں کیا تھا۔

زری کی خودکشی کی وجہ شہباز تھے انہوں نے لاعلمی میں زرین کی محبت اسریٰ کو سونپ دی تھی۔ کتنی پیچیدگیوں اور سازشوں کے ذریعے انہوں نے زیاد کو اسریٰ کی زندگی میں شامل کیا تھا۔ وہ سیدھے سادے طریقے سے زرین کو بھی زیاد کی زندگی میں شامل کر سکتے تھے۔

مگر شاید کاتب تقدیر کو یہ منظور نہیں تھا۔

قدرت نے کتنے برسوں بعد انصاف کے اس کیس کو اختتام تک پہنچا کر فیصلہ سنایا تھا۔ ایسا فیصلہ جس سے کوئی بھی انحراف نہیں کر سکتا۔

اس کا انصاف مکمل اور بے داغ ہوتا ہے۔

شہباز کے ساتھ مکمل انصاف کیا گیا تھا۔

کل جس گھر سے اسریٰ کی ڈولی اٹھنی تھی، اس گھر سے آج زرین کا جنازہ اٹھا تھا۔

شہباز صبح سے سکتے کی حالت میں تھے۔

شادی کا گھر ماتم کدہ بن چکا تھا۔ اسریٰ کی اپنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ زرین کا آخری لمحات میں لکھا خط اس نے بھی پڑھا تھا۔ اسے پتا ہی نہ چل سکا کہ زرین اتنی گہری جنونی اور بے صبری ہے۔ اگر وہ تھوڑی سی ہمت کر کے اسریٰ کو زیاد کے بارے میں پہلے ہی بتا دیتی تو شاید حالات کچھ اور ہوتے۔ اس نے سیدھا راستہ اختیار کرنے کے بجائے اسریٰ کے ذہن پر نفسیاتی دباؤ ڈالا۔ اتنا زیادہ کہ وہ گھبرا کر اس کی پرکشش باتوں میں آ کر رات کے اندھیرے میں گھر سے نکل گئی۔

اسے اس بات کا بالکل بھی افسوس نہیں تھا کہ زرین نے اسے غلط راہ دکھائی ہے۔ اس نے اسریٰ سے کچھ اور کہا اور خضر سے کچھ اور۔ مقصد یہی تھا کہ بات کھل جانے پہ اس کا نام کہیں نہ آئے۔ اسریٰ کا کانٹا بھی ہٹ جائے اور وہ اپنی محبت زیاد کو بھی حاصل کر لے۔ اس کی بلا سے اسریٰ بے شک تباہ برباد ہو جاتی۔

وہ اسریٰ کو زیاد اور فخر کے ساتھ آتا دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ اس کا منصوبہ فیل ہو چکا ہے۔

شہباز کی طرح اسے بھی ناکامی سے نفرت تھی اور محبت میں ناکامی سے بچنے کے لیے اس نے موت جیسا کامیاب فیصلہ کیا تھا۔

زرین کی خودکشی کے بعد بدنامی کی جو دھول اٹھی، اس نے شہباز کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ انہیں چپ سی لگ گئی۔ خاموش بیٹھے خلاؤں میں گھورتے رہتے لاکھ اسریٰ کو ان سے شکایتیں تھیں مگر انہیں اس حالت میں دیکھ کر اسے ان پہ رحم سا آتا۔

گاؤں میں زرین کی خودکشی کے بارے میں مختلف خبریں گردش کر رہی تھیں جن میں سے کوئی بھی سچ نہیں تھی۔

اسریٰ سب کا بدلا ہوا رویہ نوٹ کر رہی تھی۔ اب وہ سب پہلے کی طرح بیگانگی اور سرد مہری سے پیش نہیں آتے تھے۔

سکندر اور مقبول کو شہباز سے جو شکایتیں تھیں، وہ ایک ایک کر کے سامنے آ رہی تھیں۔ برسوں کی دبی کدورت ابھر آئی تھی۔ دونوں بھائیوں کو شکوہ تھا کہ شہباز نے انہیں ان کا جائز مقام نہیں دیا۔ وہ اب اپنے جائز مقام کو حاصل کرنے کے لیے جت گئے تھے۔ کیونکہ شہباز کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اکلوتا بیٹا بابر اپنے مشاغل اور مصروفیات میں گم تھا۔ باپ کی دل گیر کیفیت کی اسے بالکل پروا نہیں تھی۔ باپ کی پوچھ گچھ کا خوف رخصت ہو چکا تھا۔

شہباز کی ساری زندگی کی کمائی بابر اور زرین تھے زرین رہی نہیں اور جو رہ گیا، اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

بذریعہ خط اور ٹیلی فون رابعہ کو ہونے والے تمام واقعات کی خبر ہو چکی تھی۔ وہ پاکستان آنے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ اس نے جلد از جلد وطن واپسی کے لیے سیٹ ریزرو کروالی۔

اسریٰ کا مستقبل غیر یقینی سا تھا۔

مقبول گیلانی اور سکندر گیلانی نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ زیاد ملک سے طلاق لینا چاہتی ہے تو وہ اس کے ساتھ ہیں۔ مقبول گیلانی نے بڑی نفرت سے کہا تھا۔

”رشتہ شہباز بھائی نے طے کیا تھا۔ بذات خود وہ فرعون بن بیٹھے تھے۔ جرگے کے فیصلے کے نتائج وہی بھگتیں، تمہارا کیا قصور ہے۔ اگر تم آج جرگے کے سامنے یہ کہہ دو کہ تمہیں شہباز بھائی نے زبردستی ڈرا دھمکا کر نکاح پہ مجبور کیا تھا پھر دیکھنا شہباز کا پورے گاؤں میں کیسے جلوس نکلتا ہے، کیسی بدنامی ہوتی ہے جرگے والے از سر نو فیصلہ کریں گے جو یقیناً

تمہارے حق میں ہوگا۔"

اسریٰ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ مقبول انکل بول رہے ہیں۔ بڑے ابا کے سامنے اس نے انہیں ہمیشہ سر جھکائے مودب بیٹھے رک رک کر بولتے ہوئے سنا تھا۔ آج کس قدر تحقیر اور تضحیک بھرا انداز تھا ان کا۔

سکندر انکل نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

اسریٰ کوشش کے باوجود ان سے یہ نہ کہہ سکی کہ جب بڑے ابا نے یہ سب کیا تھا تو اس وقت آپ کہاں تھے؟ اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور مضبوط لہجے میں بولی۔

"انکل! میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ جسے تمہاری مرضی مگر وہاں اکیلے گھر میں تم کیا کرو گی۔" مقبول حیرت سے بولے۔

"انکل! رابعہ آپی کل پاکستان پہنچ رہی ہیں، میں اکیلی کہاں ہوں۔ جواد انکل بھی تو ہیں نا۔ ہوسکتا ہے میں آپ کے ساتھ ہی چلی جاؤں یا پھر نہ جاؤں اور جاب کرلوں۔ میری تنہائی کی آپ فکر نہ کریں۔ جواد انکل کی رشتے کی ایک بہن بیوہ ہیں، اولاد ہے نہیں، میں انہیں ساتھ رکھ لوں گی۔"

"ساری زندگی ایسے تو نہیں گزر سکتی نا۔ اگر تمہاری مرضی ہو تو میں حمزہ کے گھر والوں سے بات کروں مگر پہلے یہ زیاد ملک والا مسئلہ نمٹ جائے۔ تم کسی روز جرگے کے روبرو بیان دو تو کوئی پیش رفت ہو۔" سکندر بغور اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے جو مبہم سوچوں کی تفسیر بنا تھا۔ جواب میں وہ خاموش رہی تھی۔

اس نے تیاری مکمل کرلی تھی، سب سے مل کر وہ بڑے ابا کے پاس آئی جو اپنے کمرے میں لیٹے ساکت نگاہوں سے چھت کو دیکھ رہے تھے۔

اسریٰ نے بھانپ لیا تھا کہ وہ ڈپریشن کے دوسرے مرحلے میں داخل ہو رہے ہیں۔ اگر ان کی یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار رہتی اور انہیں ان کے حال پہ چھوڑ دیا گیا تو یہ ان کے ذہن اور جسم دونوں کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ ایسا نقصان جس کی تلافی ممکن نہیں۔

"بڑے ابا! میں واپس شہر جا رہی ہوں اپنے گھر۔"

ان کی ساکت نگاہوں میں اضطراب برپا ہوگیا۔ اسریٰ ان کے سرہانے کھڑی تھی۔

انہوں نے اپنا لرزتا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا جو اسریٰ نے فوراً تھام لیا۔ شہباز نے اسریٰ کو اپنے قریب بیٹھا لیا اور اسے دیکھنے لگے۔ اسریٰ ان کے دیکھنے کے انداز سے الجھن سی محسوس کرنے لگی۔ شہباز کے ہونٹ کچھ کہنے کی کوشش میں پھیل سے گئے۔

"بڑے ابا!" وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ شہباز نے کھینچ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ ان کی دلدوز آہیں، زار و قطار آنسو، اسریٰ سے دیکھے نہیں جا رہے تھے۔

"مجھے چھوڑ کر مت جانا۔ تم اگر چلی گئیں تو میں اکیلا رہ جاؤں۔ مجھے مت چھوڑ کر جانا، میں بہت ڈرنے لگا ہوں۔ وہ...... وہ میرے خواب میں آتی ہے، اس سے کہو نا، مجھے معاف کردے۔" ان کے مبہم اور بے ربط جملے اسریٰ کی عقل سے بالاتر تھے۔ وہ خود ان کے ساتھ رو رہی تھی۔

"تم میری بیٹی ہونا، میری بیٹی ہونا، کہو تم میری بیٹی ہو۔" ان کا انداز یکایک جنونی ہوگیا۔

"کہو، تم میری بیٹی ہو۔" انہوں نے جسم کی ساری طاقت سے حلق کے بل چیختے ہوئے کہا۔ دروازے سے سلطانہ خاتون کا خوفزدہ چہرہ جھانک رہا تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے دوسرے بھی صورت حال کا جائزہ لینے اور تماشا دیکھنے آ گئے۔

"بڑے ابا! میں آپ کی بیٹی ہوں، صرف آپ کی۔" وہ ان سے لپٹ گئی۔ اسے پتا تھا کہ بڑے ابا کو اس وقت انتہائی درجے کی محبت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ اگر یہاں پہ ذرا سی بھی کوتاہی کی گئی تو انتہائی مایوسی کے عالم میں وہ اپنی جان بھی لے سکتے ہیں۔

"بڑے ابا! میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ اگر گئی تو آپ کو ساتھ لے کر جاؤں گی، اکیلے نہیں چھوڑوں گی۔" وہ انہیں بچوں کی طرح ٹریٹ کر رہی تھی۔

کافی دیر بعد جب وہ پرسکون ہوئے تو اسریٰ ان کے کمرے میں سے نکل آئی۔ سلطانہ خاتون متفکر سی تھیں۔ اسریٰ ان کے پاس آ گئی۔

"بڑی امی! میں بڑے ابا کو ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ انہیں علاج کی ضرورت ہے۔ شہر میں بہت اچھے اچھے ہسپتال ہیں۔ وہاں ان کا بہترین علاج ہوسکے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر وہ زیادہ دیر اسی حالت میں رہے تو خود کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔"

سلطانہ کا اترا اترا چہرہ جانچتے ہوئے اس نے حتی الامکان محتاط الفاظ کا چناؤ کیا تو ان کے چہرے پہ ایک اداس سی مسکراہٹ آ گئی۔

''تم بہت اچھی ہو، کاش شہباز تمہارا تھوڑا سا خیال کر لیتے تو آج ان حالوں کو نہ پہنچتے۔ انہیں تمہاری بددعا لگ گئی ہے۔''

اسریٰ تڑپ ہی تو گئی۔

''بڑی امی! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے ابا کو کبھی بددعا نہیں دی۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی بلکہ جو کچھ بھی ہوا، میں نے اسی میں اوپر والے کی مصلحت جانی تھی۔ پتا ہے میں نے بڑے ابا کو جب پہلی بار دیکھا تھا تو اسی وقت سے وہ مجھے اچھے لگنے لگے تھے اور اب انہیں اس کسمپرسی کی حالت میں دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ میں پہلی فرصت میں بڑے ابا کو ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروانا چاہتی ہوں۔''

سلطانہ خاتون کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

''کیسا نرم دل ہے اس کا۔ ہاشم کی طرح کتنی بامروت ہے۔'' انہوں نے دل میں خود سے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ ضرور جاؤں گی بلکہ میں شہباز کو بھی کہہ دیتی ہوں تاکہ وہ ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔'' سلطانہ اٹھ گئیں۔

اسریٰ بھی اپنا سامان جو چند جوڑے کپڑوں اور دیگر چھوٹی موٹی اشیاء پر مشتمل تھا، رکھنے لگی۔

مگر چمڑے کا بیگ جس میں اس کے ڈاکیومنٹس اور زرین کی دی گئی اور چیزیں تھیں، کہیں نہیں تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ پریشانی سی پریشانی تھی۔ اس بیگ میں اس کی عمر بھر کی تعلیمی جدوجہد اور کیریئر بند تھا۔ اگر وہ بیگ نہ ملتا تو سب بیکار تھا۔

قریب تھا کہ وہ رو پڑتی۔ سلطانہ دوبارہ اس کے پاس آئیں، اس کا اترا اترا سا چہرہ انہیں چونکا گیا۔

اسریٰ کو یاد آ گیا تھا، جب وہ گھر سے نکلی تھی تو وہ بیگ اس کے پاس تھا۔ یہاں تک کہ جب گاڑی گڑھے میں پھنس جانے کے بعد وہ باہر نکلی تو تب بھی وہ بیگ متاعِ عزیز کی طرح اس کے پاس تھا۔

''یقیناً وہ زیاد ملک کے پاس ہوگا۔'' اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔

بیگ زیاد کی گاڑی میں تھا۔ اسریٰ کو حویلی میں پہنچانے کے بعد بیگ اس کی گاڑی

میں ہی رہ گیا تھا۔

فی الحال بیگ واپس لینے کی کوئی تدبیر اسکے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔

رابعہ بڑے ابا کو دکھ اور تاسف سے دیکھ رہی تھی زرین کی بے وقت ناگہانی موت پہ اسے بے پناہ دکھ ہوا تھا۔

رات کو تنہائی میسر آئی تو اس نے اسریٰ سے تمام واقعات کی تفصیل پوچھی۔

''اسریٰ! میرے پیچھے اتنا کچھ ہو گیا اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں؟''

''میں اس پوزیشن میں ہی نہیں تھی۔''

''اور تم نے جو احمقانہ فعل سرانجام دینے کی کوشش کی۔ شیم آن یو اسریٰ! اتنی پڑھی لکھی ہو کر...... مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ بڑے ابا نے واقعی اچھا نہیں کیا مگر تم نے احتجاج کا جو طریقہ اختیار کیا، وہ بہت غلط تھا۔ اگر تم کسی مصیبت میں پھنس جاتیں۔ کیا تمہاری اپنی عقل کام نہیں کر رہی تھی۔''

''آپی! اگر آپ زرین کی باتیں سنتیں تو شاید یہی کچھ کرتیں جو میں نے کیا۔ اس نے مجھے نفسیاتی طور پہ اتنا کمزور کر دیا کہ میں اس کی کہی گئی ہر بات کو سر جھکا کر مانتی چلی گئی۔ اس نے زیاد اور اس کے گھر والوں کے متوقع سلوک کے بارے میں وہ منظر کشی کی کہ مجھے میرے بھیانک مستقبل سے ڈرا ہی دیا۔''

''اسریٰ! کچھ بھی سہی، تم اگر مجھے ایک بار ہی سب کچھ بتا دیتیں تو شاید سب کچھ اتنا غلط نہ ہوتا۔ تمہیں پتا نہیں ہے، دیہات کے لوگ اپنی عورتوں کے بارے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔ میں پہلی فرصت میں زیاد ملک سے ملاقات کروں گی۔ اگر وہ میری توقعات پہ پورا اترا تو دیکھ لیں گے۔ میں خود سفید حویلی جاؤں گی۔ یہ فیصلہ دیکھ بھال کر کروں گی۔ تمہارے لیے کیا مناسب ہے اور کیا نامناسب۔''

''ویسے بڑے ابا نے اچھا نہیں کیا۔ ابو کے مرنے کے بعد انہیں سہارا دینا چاہیے تھا نا کہ خاندانی دشمنیوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ انہیں اپنے کیے کی سزا مل گئی ہے۔ ہمارے لیے گڑھا کھود رہے تھے، خود ہی گر گئے۔''

''نہیں آپی! پلیز اور کچھ مت کہیں۔'' خفا خفا سی رابعہ کے منہ پہ اسریٰ نے اپنا ہاتھ

رکھ دیا۔ ''کچھ بھی کہہ لیں، چاہنے کے باوجود میں بڑے ابا سے نفرت نہیں کر سکتی، نہیں کر سکتی۔ اس وقت تو وہ بری طرح ٹوٹ کر بکھرے ہیں۔ کیا ضرورت ہے کہ نفرت کے جواب میں نفرت کی ہی آبیاری کی جائے۔ ہم سزا جزا کا فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں۔''

اسریٰ نے آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیا تا کہ رابعہ اس کی آنکھوں میں جھلمل کرتے آنسو نہ دیکھ سکے۔ رابعہ نے زبردستی اس کی آنکھوں پہ سے ہاتھ ہٹائے اور دھیرے سے بولی۔

''اسریٰ! میں بھی تمہارے ساتھ ہوں'' اسریٰ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ رابعہ نے اس کا ہاتھ ہولے سے دبا کر اسے یقین دلایا۔

''ہاں اسریٰ! ہم بڑے ابا کو سمیٹیں گے۔''

''آپی! آپ بھی انہیں میری طرح معاف کر دیں۔ پہلے ہی وہ بہت دکھی ہیں۔'' اس کا لہجہ بوجھل ہو گیا کمرے میں تکلیف دہ سناٹا در آیا تھا۔

زری کی موت پہ قدرت نے از خود پردہ ڈال دیا تھا اگر وہ پردہ ہٹ جاتا تو اسریٰ اور رابعہ کے دل میں شہباز کے لیے جو ہمدردی اور محبت تھی، وہ باقی نہ رہتی اور شہباز ان دونوں کی اتنی توجہ اور دیکھ بھال سہہ نہیں پا رہے تھے۔ وہ کیسے انہیں بتاتے کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔

اسریٰ نے انہیں ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرانے کی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھی۔

ڈاکٹر حمزہ سے اس کی اچانک ملاقات ہوئی۔ وہ انگلینڈ سے واپس آ کر اسی ہاسپٹل میں دوبارہ اپنی ذمہ داریاں سرانجام دے رہے تھے، جہاں اسریٰ بھی ہاؤس جاب کرتی تھی۔

وہ اسریٰ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے مگر اسریٰ کی طرف سے سرد مہری کی سی کیفیت تھی۔

''اسریٰ گاؤں سے کب واپسی ہوئی ہے'' ان کا لہجہ اپنائیت سے بھرپور تھا۔

''میں پچھلے ہفتے ہی آئی ہوں بڑے ابا کے ساتھ۔ انہیں ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرانا ہے۔ تین چار دن سے ان کی طبیعت کافی خراب ہے، بی پی شوٹ کر جاتا ہے۔''

''اوہ آئی سی۔ تو وہ بھی آئے ہیں۔''

حمزہ کا لہجہ طنزیہ تھا جو اسریٰ کو بہت برا لگا۔ اس نے حساب کتاب آئندہ کے لیے اٹھا رکھے۔ اس وقت تو وہ بڑے ابا کے لیے کافی پریشان تھی۔

حمزہ طویل راہداری میں کھڑے آخر تک اسے جاتا دیکھتے رہے۔

زیاد غیض و غضب کے عالم میں کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ پیشانی پہ شکنوں کا جال سا بچھا تھا اور چہرہ اندرونی اضطراب کا غماز نظر آ رہا تھا۔

اماں جی اور انوار ملک خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ زیاد کی یہ کیفیت ایک گھنٹے سے اسی طرح برقرار تھی۔

ان کے ایک قابل اعتماد ملازم کے علاوہ فخر نے بھی پورے وثوق سے بتایا کہ مقبول گیلانی اور سکندر گیلانی اسریٰ کو جرگے میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں کیونکہ اسریٰ کا نکاح شہباز نے اسے دھمکیاں دے کر زبردستی کرایا تھا۔

یہ کوئی چھوٹی بات نہیں تھی۔

اسریٰ کے معاملے میں شہباز کا کردار پوری طرح کھل چکا تھا اور بہت سوں کو اسریٰ سے ہمدردی بھی تھی مگر زیاد کو تو اسریٰ سے محبت تھی، اب محبت کے ساتھ ساتھ وہ اس کی انا کا بھی مسئلہ بن چکی تھی۔ اس کے لیے یہ تصور ہی تکلیف دہ تھا کہ اسریٰ بھری محفل میں اپنی ناپسندیدگی کا اعلان کرتی۔

فخر تو اس کا بہترین دوست اور راز داں تھا۔ وہ زیاد کے دل پہ پل پل گزرنے والی قیامت سے بخوبی واقف تھا۔ یہ سوال اسے بھی پریشان کر رہا تھا کہ اگر اسریٰ نے اسے ٹھکرا دیا تو زیاد کا کیا ردِعمل ہوگا؟

وقت گزر رہا تھا اور پردۂ غیب سے جانے کیا ظہور میں آنے والا تھا۔

''اسریٰ! میں آج بہت خوش ہوں، اتنا کہ کائنات مجھے اپنی مٹھی میں بند محسوس ہو رہی ہے۔''

حمزہ کی آنکھوں سے پھوٹتی چمک، لبوں پہ مسکراہٹ اور چہرے پہ طاری سرمستی کی سی کیفیت ان کی اندرونی خوشی کو ظاہر کر رہی تھی اسریٰ، حمزہ کے گھر میں تھی۔ حمزہ نے حال ہی میں یہ بنا بنایا فرنشڈ گھر خریدا تھا اور اسریٰ کو آج دکھانے لائے تھے۔

حمزہ کی طرف سے اس کے دل میں جو بھی ناراضی اور خفگی تھی، وہ ختم ہو گئی تھی۔ حمزہ نے سچ مچ بہت شرمندگی کا اظہار کیا تھا۔

اسریٰ نے تو حمزہ کو معاف کر دیا تھا مگر رابعہ کے لیے یہ آسان نہیں تھا۔

''میں حمزہ کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی، کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ میں بہت شرمندہ

ہوں وہ ہم سب کے جذبات سے کھیلا۔ ابو کو بھی نہیں بخشا" اس کا غصہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"آپی! اتنا غصہ ٹھیک نہیں ہے اور اس کنڈیشن میں تو بالکل بھی نہیں۔" اسریٰ اس کے بے ہنگم پھیلتے وجود کو دیکھتے ہوئے شرارت سے ہنسی تو رابعہ جھینپ گئی۔

ڈھائی ماہ پہلے یہ تصور بھی محال تھا کہ اسریٰ کو اتنی خوشیاں ملیں گی۔

شہباز گیلانی کو ہاسپٹل ایڈمٹ ہوئے تیسرا روز تھا۔ جب انہوں نے دنیا کے تمام جھمیلوں سے چھٹکارا پا لیا۔ زرین کی موت کے بعد اندر ہی اندر بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکے تھے، کلس رہے تھے، پچھتاوا گھن کی طرح چاٹے جا رہا تھا۔ اسریٰ اور رابعہ کی محبت خدمت گزاری کچھ بھی تو اثر نہیں کر رہی تھی۔ دماغ پہ بے پناہ دباؤ کے باعث ان کی شریان پھٹ گئی۔ آخری وقت میں اسریٰ ان کے پاس تھی۔ سی سی یو میں ان کے پاس کسی کو بھی جانے کی اجازت نہیں تھی مگر اسریٰ نے سرجن افتخار سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کیا تھا۔

وہ سفید براق بستر پہ ہوش و خرد سے بیگانہ پڑے تھے۔

آخری وقت شہباز کی بے بس آنکھوں نے اسریٰ کو دیکھا، اس کے پہلو میں زری بھی کھڑی تھی۔ طنزیہ مسکراتی ہوئی وہ کچھ کہہ رہی تھی مگر ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ زری اور اسریٰ کا وجود گڈمڈ ہو رہا تھا۔

شہباز کو اپنا وجود بے جان ہوتا لگ رہا تھا۔ اسریٰ ان پہ جھکی ہوئی ان کے ماتھے پہ پیار کر رہی تھی۔ شہباز کی روح کھنچ کر آنکھوں میں منجمد ہو گئی۔ زری کا ہیولا غائب ہو چکا تھا۔ وہاں تو صرف اسریٰ تھی، روتی دھوتی اسریٰ۔

شہباز کو گاؤں میں ہی دفنایا گیا۔ سلطانہ خاتون کو یوں لگ رہا تھا جیسے آج وہ دوسری بار مری ہوں۔

سفید حویلی والے تعزیت کے لیے آئے رابعہ اور اسریٰ بھی گاؤں میں تھیں۔

شہباز کی موت کو پندرہ روز ہوئے تے، جب مقبول اور سکندر نے دوبارہ زیاد اور اسریٰ والا مسئلہ اٹھایا۔

"اسریٰ بیٹی! تم انکار کر دو تو جرگے سے بہت سی فوائد ملیں گے۔" مقبول گیلانی اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"کس قسم کے فوائد؟" وہ انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"اگر تم انکار کر دو تو شہباز کی ساری جائیداد ملک زیاد کے قبضے میں چلی جائے گی۔ اس میں سے آدھی تمہاری ہو گی کیونکہ تمہیں ذہنی اور جذباتی طور پہ جو کوفت اٹھانی پڑی ہے، یہ جائیداد اس کے صلے میں تمہیں دی جائے گی کیونکہ یہ ہمارے یہاں کے قوانین ہیں جس میں عورت کا فائدہ بھی دیکھا جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ شہباز کی زندگی میں اگر تم انکار کرتیں تو معاہدے کی رو سے وہ زرین کو ان کے حوالے کرتا۔ اگر شہباز کی بیٹی نہ ہوتی تو وہ ہم سے رجوع کرتا مگر کیا ہماری بیٹیاں اتنی فالتو ہیں۔"

"چھوٹے چچا! یہ آپ کہہ رہے ہیں۔" وہ حیران تھی۔

"کیوں، میں تمہارے بھلے کی ہی سوچ رہا ہوں۔" وہ برا مان گئے۔

"ہر معاملے میں عورت کو ہی آگے کیوں کیا جاتا ہے۔ جب میرا نکاح ہوا تو کسی نے بھی مجھ سے پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اب مجھ پہ یہ مہربانی کیوں کی جا رہی ہے۔ آپ میری طرف سے خود ہی سب کچھ کرنے کے مجاز ہیں۔ میری رائے کیوں طلب کی جا رہی ہے۔ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ بڑے ابا کی جائیداد ملکوں کے قبضے میں چلی جائے۔ آپ نے سوچا ہے بڑی امی اور بابر کا کیا بنے گا؟ کیا اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں ہے؟"

آج پہلی بار اسریٰ نے ان کے سامنے بولنے کی جرأت کی تھی اور انہیں آئینہ دکھایا۔

"چھوٹے چچا! یہ مناسب نہیں ہے کہ بڑی امی اور بابر بھائی خالی ہاتھ رہ جائیں۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ میں عدالت تک جاؤں۔ مجھے وہ بے عزتی اور توہین گوارا ہے مگر یہ نہیں جس سے بڑی امی کے دل کو ٹھیس پہنچے۔"

اسریٰ نے انہیں بے طرح شرمندہ کیا تھا۔

زیاد نے پہلی بار "ہاشم ہاؤس" میں قدم رکھا۔

گیٹ پہ متعین چوکیدار نے اندر اس کی آمد کی اطلاع دی۔ رابعہ خود باہر آئی اور اسے اندر لے گئی۔

ڈرائنگ روم میں اسریٰ پہلے سے موجود تھی۔

زیاد نے سرسری سی نگاہ اس پہ ڈالی اور شائستگی سے احوال پوچھا۔ وہ دھیرے سے سر ہلا کر رہ گئی فضا میں ایک تکلیف دہ سی خاموشی طاری تھی۔ زیاد پہلی بار رابعہ سے ملا تھا اور متجسس تھا کہ آخر رابعہ نے اسے کیوں بلوایا ہے۔ گاؤں میں جب یہ افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ جلد ہی

جرگہ طلب کیا جائے گا جس میں اسریٰ بھی شامل ہوگی۔ اس کے تناظر میں یہ بلاوا بڑا معنی خیز تھا۔

"میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے کیوں بلوایا ہے؟"

"آرام سے، ذرا دم تو لے لیں پھر آپ کو بتاؤں گی۔" رابعہ خوشگوار لہجے میں بولی تو زیاد کے خدشات یکلخت مٹ گئے۔

"آپ مجھے زیاد یا بھائی بھی کہہ سکتی ہیں۔ آخر کو ہمارے درمیان بڑا قریبی رشتہ ہے۔" زیاد نے یہ کہتے ہوئے اچٹتی ہوئی نگاہ اسریٰ پہ ڈالی جو کمرے میں موجود ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھی۔

"ہوں۔" رابعہ نے ہنکارا بھرا اور صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"بات یہ ہے کہ اسریٰ شہر کی پروردہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر نازک احساسات کی مالک ہے۔ یہ جرگوں پنچائتوں کا سامنا کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہمیں یہ سب پسند نہیں ہے۔ محض دشمنی میں جو تعلق صلح کی آڑ میں جوڑا جائے اسریٰ کے نزدیک وہ قابل قبول نہیں ہے، اسی لیے یہ کہتا ہے کہ......"

"بس، اس سے آگے ایک لفظ مت کہیے گا۔" زیاد کا چہرہ اس کی اگلی بات کا مطلب جانتے ہی سرخ ہوگیا اور اس نے رابعہ کا جملہ کاٹ دیا۔

اسریٰ اس دوران بالکل لاتعلق بنی رہی۔ اس کی بے نیازی قابل دید تھی۔

"یہ میری عزت بن چکی ہیں۔ اس سے پہلے ان سے میرا قلبی تعلق تھا مگر اپنی عزت کا تحفظ میرے لیے قلبی تعلق سے بڑھ کر ہے۔ یہ فیصلے اتنی جلدی نہیں ہوتے۔ میں محبت تو چھوڑ سکتا ہوں، عزت کو پس پشت نہیں ڈال سکتا۔"

شدت جذب سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

رابعہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

زیاد کچھ کھائے پیے بغیر وہاں سے اٹھ آیا۔

حمزہ اس کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔

وہ بہت کچھ کہہ رہے تھے مگر اسریٰ کا ذہن ایک ہی جملے پہ اٹکا ہوا تھا۔

"شائل بالکل تمہاری طرح ہے۔"

حمزہ کے اس ایک جملے پر وہ انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"آپ کو مجھے حقیقت بتا دینی چاہیے تھی، شاید مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ میں نے کوئی خواب تو نہیں دیکھے تھے مگر......" حمزہ نے اس سے نگاہیں چرالیں۔

ساڑھے چار سال قبل حمزہ کی منگنی شائل سے ہوئی تھی۔ بے پناہ مخالفتوں اور اعتراضات کا سامنا کرنے کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو پایا تھا۔ شائل انگلینڈ میں مقیم تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ حمزہ بھی اس کے ساتھ انگلینڈ چلے اور وہیں اپنی پریکٹس شروع کرے۔ حمزہ جو پور پور اس کی محبت میں سرشار تھے، شائل کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ شائل نے ان پہ واضح کر دیا کہ وہ پاکستان میں مستقل نہیں رہ سکتی۔ اگر حمزہ اس سے سچ مچ محبت کرتے ہیں تو اسے انگلینڈ آنا پڑے گا۔ حمزہ کی مردانہ انا آڑے آ گئی۔ تو انہوں نے شائل کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور دھیرے دھیرے دوری کی اس آگ میں سلگتے رہے۔ ان دونوں کے مابین صرف اور صرف انا حائل تھی۔

اسریٰ نے ہاؤس جاب کے لیے جس ہاسپٹل میں اپلائی کیا، وہاں حمزہ پہلے ہی کام کرتے تھے...... اسریٰ کو دیکھ کر وہ چونک سے گئے۔ وہی شائل کی سی ہنسی، اسی کے جیسی پسند و ناپسند، چال ڈھال اور بے ساختہ انداز۔

گھر والوں کی طرف سے ان پہ شادی کے سلسلے دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ انہوں نے بے دردی سے سوچا۔ اگر وہ اسریٰ سے شادی کر کے شائل کو حیران کر دیں تو کیسا رہے گا۔ اسریٰ کے ابو بھی ان سے مل کر خوش ہوئے مگر رشتہ طے کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

شہباز گیلانی نے ہاشم کی موت کے بعد انہیں گھر آنے سے روک دیا اور اسریٰ سے دور رہنے کو کہا۔ طبعاً حمزہ بزدل سے انسان تھے اور ویسے بھی کون سا انہیں اسریٰ سے طوفانی محبت تھی، اس میں محض شائل کی جھلک ہی تو تھی۔ وہ شائل تو نہیں تھی۔ رہی سہی کسر شائل کے انگلینڈ میں ہونے والے ایکسیڈنٹ نے پوری کر دی۔

اپنی ساری انا بالائے طاق رکھ کر شائل کے پاس انگلینڈ پہنچ گئے۔

اب وہ اسریٰ کے سامنے معذرت پیش کر رہے تھے۔

"شائل اسی ہفتے آ رہی ہے، ہماری شادی کی تقریب عنقریب ہوگی۔ مجھے مبارکباد نہیں دو گی۔"

"کس سلسلے میں؟"

"میرا زیاد ملک کے ساتھ نکاح ہو چکا ہے، اس سلسلے میں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔" حمزہ نے حیرت کے اچانک جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"رخصتی کب کروا رہی ہو؟"

"اسی ہفتے اور شائل کو لانا مت بھولیے گا اور ہاں، اس ملال کو دل میں جگہ مت دیجیے گا کہ آپ نے میرا دل توڑا ہے بلکہ مجھے شرمندہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ جب آپ والدہ کے ساتھ ہمارے گھر آئے تھے تو مجھے سب کچھ اچھا نہیں لگا کیونکہ آپ سے پہلے ہی زیاد مجھے پسند کر چکے تھے۔ آپ کو وہ مریض یاد ہے جو مجھے بہت تنگ کرتا تھا، وہی شوہر کی حیثیت سے میری زندگی میں شامل ہوئے ہیں۔"

مردوں، مردوں میں فرق ہوتا ہے۔

حمزہ نے اپنی کمٹمنٹ کا بالکل بھی لحاظ نہیں کیا تھا اور زیاد کے نزدیک نکاح کے بعد اس کی زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئی تھی۔ اس روز جب غصے کے عالم میں زیاد وہاں سے نکلا تھا تو رابعہ آپی نے اس سے کہا تھا۔

"زیاد تمہیں بہت خوش رکھے گا۔ اس کا دل مت توڑو۔" اور اسریٰ نے...... اس کی بات سمجھ لی تھی۔

چار روز پہلے وہ حویلی رخصت ہو کر آئی تھی۔ سب نے اس محبت بھرے ماحول میں دل سے اس کا استقبال کیا تو وہ اپنے غلط اندازوں پہ جی بھر کر شرمندہ ہوئی۔

رابعہ سب سے مل کر ابھی گئی تھی۔ اسریٰ اداس سی تھی۔ اماں جان اسے اندر لے آئیں۔

"کیوں پریشان ہوئی ہو، ماہ دو ماہ بعد زیاد تمہیں رابعہ بیٹی سے ملوا کر لے آئے گا۔ تم خود کو تنہا مت سمجھنا، ہم سب ہیں نا۔ میں تمہاری ماں کی جگہ ہوں، تمہیں کسی سے کوئی بھی شکوہ یا شکایت ہو تو تم مجھ سے کہہ سکتی ہو۔" اماں جی نے فرطِ محبت سے اسے خود سے چمٹا لیا۔

"نہیں میں اب پریشان نہیں ہوں۔" اسریٰ ہنسی تو وہ مسرور سی ہو گئیں۔

زیاد اندر آیا تو وہ چلی گئیں۔

اسریٰ سر جھکائے زمین کو دیکھنے لگی۔ ہلکے اورنج اور گرین رنگ کے کامدار سوٹ میں

زیورات سے آراستہ وہ روزِ اول کی طرح دل نشیں لگ رہی تھی۔

"یار! ہماری شادی کو چوتھا روز ہے اور تم ابھی تک پہلے روز کی طرح بی ہیو کر رہی ہو۔" زیاد اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

اسریٰ کا چہرہ اس کی نگاہوں کی تپش سے سنسنانے لگا۔

اس نے رخ موڑنا چاہا مگر زیاد نے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔

"تم نے اپنی بے رخی سے مجھے بہت جلایا ہے اور اب یوں ڈری سہمی بیٹھی ہو، مجھے ہنسی آ رہی ہے۔"

زیاد کے تیور بدل رہے تھے۔ "وہاں ہاسپٹل میں تو بڑی تھانیدار نظر آتی تھیں۔ کیا تکلیف ہے آپ کو؟" زیاد نے اس کی نقل اتاری

"ڈاکٹر صاحبہ! مجھے مستقل طور پہ اپنے مریضوں کی لسٹ میں شامل کر لیں۔" زیاد نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی جو حیا کے بوجھ سے مستقل جھکی ہوئی تھیں۔

"پلیز...... آپ اس طرح مجھے مت دیکھیں۔"

زیاد ہنستا چلا گیا۔

"تو پھر کیسے دیکھوں، اب انہی شوہرانہ نگاہوں سے عمر بھر دیکھوں گا۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا تو اسریٰ نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

زیاد کی آنکھیں جذبوں کی لو سے دہک رہی تھیں۔

"ذرا دعوتوں سے فارغ ہو لیں تو ہاسپٹل والا معاملہ دیکھوں گا۔ اگر تم گاؤں والے ہاسپٹل میں کام کرنا چاہتی ہو تو میں سمجھوں گا کہ گاؤں والوں کی خوش قسمتی ہو گی کیونکہ یہاں کوئی ڈاکٹر بھی زیادہ عرصہ نہیں ٹکتا۔"

"میں یہیں کام کروں گی۔" اسریٰ بولی تو زیاد کا چہرہ کھل اٹھا۔

"تم نے میرے دل کی بات کیسے سن لی۔" وہ پھر پٹڑی سے اتر رہا تھا۔ یہ معمہ بھی حل ہو چکا تھا کہ اسے پھول اور کارڈ بھجوانے والا بھی وہی تھا۔ زیاد اس کی حیران شکل دیکھ کے خاصا محظوظ ہوا تھا۔

شام ڈھل رہی تھی، رات کا اندھیرا ہر چیز کو گرفت میں لینے کی تیاری کر رہا تھا مگر اسریٰ کے لیے زندگی کی راہیں بڑی روشن اور واضح تھیں۔ زیاد جیسا مضبوط ساتھی اس

کے ہمراہ تھا۔

''چار روز سے میں نے تمہیں جی بھر کے دیکھا ہی نہیں ہے تم اپنی آپی کی ناز برداریوں میں مصروف تھیں اور میں غریب رات گئے تمہارا انتظار کرتے کرتے سو جاتا۔ کتنی سنگ دل ہو تم اسریٰ۔''

زیاد کے لب پیار بھری سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اسریٰ نے لاکھ دامن بچانا چاہا مگر! زیاد کی شوخ نگاہیں کہہ رہی تھی کہ فرار کی کوئی راہ نہیں ہے اور اب وہ فرار چاہتی ہی کب تھی۔

اسریٰ نے طمانیت سے آنکھیں موند لیں اور زیاد کی چاہت کی بارش میں بھیگتی چلی گئی۔